خواتین ڈائجسٹ

ستمبر 2014

رنگارنگ پھول

میری بیاض سے

پکوان

نفسیات

بیوٹی بکس

ستمبر 2014

جلد 42 شمارہ 5

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

امن، خوش حالی، ترقی، بہتر زندگی ہر آنکھ کا خواب ہوتی ہے۔ انسان کی ساری محنت، ساری جستجو، ساری کوشش اسی مقصد کے حصول کے لیے ہے۔ اب تک دنیا نے جتنی ترقی کی ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ پر آسائش اور آسان بنایا جائے۔ تاریخ عالم کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو قومیں آج ترقی یافتہ کہلاتی ہیں انہوں نے ان تھک محنت، کوشش اور جدوجہد کی ہے۔ ان کے ہاں آئین اور قانون کی بالادستی ہے۔

چاروں طرف سے خطرات میں گھرا پاکستان ایک اور بحران کی زد میں ہے۔ دارالحکومت کی فضائیں آزادی اور انقلاب کے نعروں سے گونج رہی ہیں۔ بے یقینی اور افراتفری کی کیفیت پیدا کی جارہی ہے۔ جس میں میڈیا پیش پیش ہے۔ میڈیا کا کردار انتہائی مایوس کن ہے۔ اس صورت حال سے ملک کو جتنا نقصان پہنچ رہا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ حالات کو وہاں تک نہیں لے جانا چاہیے جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو سکے۔

عید نمبر

خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ عید نمبر میں مصنفین سے سروے "گوشت کے پکوان"، مہندی کے ڈیزائن اور عید کے حوالے سے دیگر سلسلے شامل ہوں گے۔ عید نمبر میں قارئین کی شرکت کے لیے حسب روایت آپ سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوال یہ ہیں۔

1. عید کے تین دن ایک خوشگوار مصروفیت میں گزرتے ہیں۔ مرغن ڈش کا اہتمام، پارٹی کا اہتمام، دوستوں، رشتہ داروں کی دعوتیں، اپنی مصروفیات کا احوال لکھیے۔ آپ کے گھر میں دعوت کا اہتمام ہوتا ہے یا آپ دوستوں، رشتہ داروں کے گھر مدعو ہوتی ہیں؟
2. کسی عید الاضحی پر کوئی دلچسپ واقعہ پیش آیا ہو تو اس کا احوال لکھیں۔ آپ کبھی قربانی کے جانور کی خریداری کے لیے گئی ہیں، یہ تجربہ کیسا رہا؟

ان سوالوں کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 10 ستمبر تک ہمیں موصول ہوجائیں۔

اس شمارے میں،

- عہد الست ۔ تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول،
- نخل ۔ نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- نزہت شبانہ عبدہ، راؤ سمرا اعجاز اور عنیقہ ایوب کے ناولٹ،
- سمیرا حمید، مصباح علی، صوفیہ سرفراز، عدن شاہ اور عنبر بن اعجاز کے افسانے،
- معروف ڈراما نگار خلیل الرحمن قمر سے ملاقات،
- ٹی وی فنکارہ عامرہ جہانگیر سے باتیں،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

مسلمان پر ناحق سب وشتم کرنے کے حرام ہونے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور وہ لوگ جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بغیر قصور کے تکلیف پہنچاتے ہیں تو انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب۔ 58)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مسلمان کو گالی دینا فسق (اللہ کی حکم عدولی) ہے اور اس کو قتل کرنا کفر ہے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : مومن کے قتل کو کفر کہنے کا مطلب ہے کہ گناہ اور حرمت میں کفر کی طرح ہے۔ اس سے اس جرم کی شدت واضح ہے۔ اس میں مسلمان کو سب وشتم یا اس سے جھگڑا کرنے کی ممانعت ہے۔

تہمت لگانا

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہوئے سنا۔

"کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر فسق یا کفر کی تہمت نہ لگائے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ ہو تو یہ تہمت اسی کی طرف لوٹ آتی ہے۔" (بخاری)

فائدہ :
مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی مسلمان کی بابت یہ کہے کہ وہ تو فاسق یا کافر ہے درآں حالیکہ وہ فاسق یا کافر نہیں ہے تو خود کہنے والا عنداللہ فاسق یا کافر قرار پا جائے گا' اس لیے اس قسم کے دعووں سے بچنا چاہیے۔

گالی دینا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آپس میں گالی دینے والے دو شخص جو کچھ ایک دوسرے کو کہیں گے' اس کا گناہ ابتدا کرنے والے کو ہوگا یہاں تک کہ مظلوم زیادتی کا ارتکاب کرے۔"

(مسلم)

فوائد و مسائل :

1 ۔ مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان نے گالی دی اور دیگر ناجائز باتیں کہیں تو دوسرے مسلمان نے بھی جواب میں اسی طرح کی گالی دی اور دیگر ناجائز باتیں کیں۔ اس نے اس کی باتوں سے تجاوز نہیں کیا تو اس صورت میں سب و شتم کا سارا گناہ ابتدا کرنے والے کو ہوگا۔ ہاں اگر دوسرا (مظلوم) شخص بدلہ لینے میں حد سے تجاوز کر گیا تو پھر اپنی زیادتی کے حساب سے وہ بھی گناہ گار ہوگا۔

2 ۔ اس سے معلوم ہوا کہ بدلہ لینا اگرچہ جائز ہے لیکن بدلہ لیتے وقت عام طور پر انسان حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور مظلوم کی جگہ ظالم بن جاتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ انسان بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دے اور صبر اور عفو (درگزر) کو اپنا شعار بنائے۔

بددعا دینا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شرابی آدمی لایا گیا۔ آپ نے فرمایا "اسے مارو۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم میں سے کوئی اسے اپنے ہاتھ سے کوئی اپنے جوتے سے اور کوئی اپنے کپڑے سے مار رہا تھا۔ جب وہ (مار کھا کر) جانے لگا تو لوگوں میں سے کسی نے کہا۔

"اللہ تجھے رسوا کرے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اس طرح مت کہو اس کے خلاف شیطان کی مدد مت کرو۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1 ۔ گناہ گار کو بددعا دینے سے شیطان کی مدد ہوتی ہے۔ کیونکہ شیطان کا مقصد بھی مسلمان کو عند اللہ ذلیل و خوار کرنا ہی ہے' تو جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر لعنت کرتا یا اسے ذلت و رسوائی کی بددعا دیتا ہے تو گویا وہ شیطان کے مشن ہی کی تکمیل کرتا ہے۔ اس لیے گناہ گار کو بددعا نہیں دینی چاہیے' اس کے لیے ہدایت کی دعا کی جائے۔

2 ۔ اس میں شرابی کو صرف زدوکوب کرنے کا ذکر ہے۔ یہ حد کے مقرر ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پینے والے پر چالیس کوڑوں کی حد نافذ فرمائی۔ اس لیے راجح مسلک یہی ہے کہ شراب نوشی کی سزا بطور تعزیر نہیں' بطور حد ہے اور وہ چالیس کوڑے ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اسی حد کو نافذ کیا' البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب شراب نوشی کا رواج کچھ زیادہ ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے چالیس کے بجائے اسی کوڑے اس کی سزا کر دی۔ علمائے محققین نے کہا ہے کہ حد تو چالیس کوڑے ہی ہے' البتہ بطور تعزیر چالیس کوڑوں یا اس سے کم و بیش کا حق امام وقت اور قاضی کو حاصل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اضافہ بھی بطور تعزیر ہی ہے' ورنہ حد میں کسی کو بھی کمی بیشی کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

بدکاری کی تہمت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"جو شخص اپنے مملوک (غلام' باندی) پر بدکاری کی تہمت لگائے تو قیامت والے دن اس (مالک) پر حد قائم کی جائے گی مگر یہ کہ وہ (مملوک) ایسا ہی ہو جیسے اس نے کہا (پھر مالک پر حد لاگو نہیں ہوگی)۔" (بخاری' مسلم)

فوائد و مسائل :

1 ۔ مالک پر قیامت والے دن حد قذف (زنا کی تہمت لگانے کی سزا) اس لیے قائم کی جائے گی کہ دنیا میں مالک اپنے مملوکین پر ہر طرح کا ظلم کر لیتے ہیں اور ان کی داد رسی نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت والے دن جب بے لاگ انصاف فرمائے گا تو اس

مظلوم طبقے کے ساتھ بھی انصاف کا اہتمام ہوگا اور جو مالک دنیا میں سزا سے بچ رہے ہوں گے' انہیں قیامت والے دن سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

2۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جو اپنے مالکانہ اختیارات کے گھمنڈ میں اپنے غلاموں اور نوکروں چاکروں پر ظلم کرتے ہیں۔

فوت شدہ لوگوں پر ناحق اور کسی شرعی مصلحت کے بغیر سب وشتم کرنا حرام ہے

اور مصلحت شرعی یہ ہے کہ کسی بدعتی اور فاسق وغیرہ کی بدعت اور فسق وغیرہ میں پیروی کرنے سے لوگوں کو بچایا جائے۔

فائدہ: مطلب امام نووی رحمتہ اللہ کا یہ ہے کہ فوت شدہ شخص بدعت اور فسق وفجور وغیرہ میں مبتلا رہا ہو تو ایسے شخص کے ایسے کردار سے لوگوں کو آگاہ کرنا چاہیے' تاکہ لوگ اس کی بدعت اور اس کے فسق و فجور سے بچیں۔ یہ مردہ کی بدگوئی اور سب وشتم نہیں ہے جس کی ممانعت ہے' بلکہ اس کی حقیقت واضح کرنے میں مصلحت شرعی موجود ہے' اس لیے ایسا کرنا جائز ہے۔

فوت شدہ شخص

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"فوت شدہ لوگوں کو برا بھلا مت کہو' اس لیے کہ انہوں نے (اچھے یا برے) جو عمل آگے بھیجے' وہ اس کو پہنچ گئے۔" (بخاری)

فائدہ:

1۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں انہوں نے اچھے یا برے جو عمل بھی کیے' اس کے مطابق وہ جزا یا سزا کے مستحق ہوں گے۔ ہمیں اب انہیں برا کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے۔ اس لیے کسی بھی فوت شدہ پر سب وشتم نہ کی جائے بالخصوص کسی کا نام لے کر' سوائے اس مصلحت شرعی کے جس کا ذکر اوپر ہوچکا

تکلیف پہنچانے سے ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور وہ لوگ جو بغیر کسی قصور کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں' انہوں نے یقیناً بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔"

کامل مسلمان

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"(کامل) مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اور مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ کہنے کو تو ہر وہ شخص مسلمان ہے جس نے کلمہ شہادت پڑھ کر توحید و رسالت محمدیہ کا اقرار کرلیا۔ لیکن کامل مسلمان وہ ہے جس کا کردار اتنا بلند ہو کہ اس کی زبان یا ہاتھ سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے۔

2۔ مہاجر تو اصل میں وہ ہے جو اللہ کے لیے اپنے وطن اور خویش و اقارب کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ آسانی سے اللہ کے دین پر عمل کرسکے۔ لیکن وہ شخص بھی مہاجر ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق نافرمانی والے کاموں کو ترک کردیتا ہے۔ اس لیے کہ ہجرت کے معنی ترک کرنے کے ہیں' وطن کو ترک کردے یا گناہوں کو ترک کردے۔

اچھا برتاؤ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ جہنم سے

دور اور جنت میں داخل کردیا جائے تو چاہیے کہ اس کو موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ وہ برتاؤ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں ایمان پر استقامت اور عمل صالح پر مداومت کی تاکید ہے کیونکہ موت کا کوئی پتا نہیں کس وقت آجائے۔ اس لیے انسان کو کسی وقت بھی ایمان کے تقاضوں اور عمل صالح سے غافل نہیں رہنا چاہیے تاکہ اس کی موت ایمان پر آئے۔

2۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے' جیسے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے ساتھ اچھا معاملہ کریں۔

باہم بغض رکھنے' قطع تعلق کرلینے اور ایک دوسرے سے منہ پھیر لینے کی ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"مومن تو بھائی بھائی ہیں۔" (الحجرات۔ 10)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا" (مومن) پر نرم ہیں اور کافروں پر سخت۔" (المائدہ۔)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا' محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں' آپس میں مہربان۔" (الفتح۔29)

تین دن سے زیادہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو' نہ باہم حسد کرو' نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ' نہ آپس میں تعلق منقطع کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (کسی مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال بچھوڑے رکھے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ :

ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو" کا مطلب ہے کہ ایسا کام یا بات نہ کرو جس سے دلوں میں کدورت اور بغض پیدا ہو۔ حسد نہ کرو' یعنی کسی مسلمان کو کوئی نعمت اور شرف و فضل حاصل ہو تو اس کے زوال کی آرزو مت کرو۔ ایک دوسرے کو پیٹھ مت دکھاؤ' یعنی ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہو تو سلام کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے اعراض کرتے ہوئے کنی کترا کر مت نکلو۔ یہ تمام چیزیں ممنوع ہیں کیونکہ ان سے افتراق اور انتشار پیدا ہوتا ہے' اسی لیے تین دن سے زیادہ ترک تعلق اور بول چال بند رکھنا جائز نہیں ہے۔

شرک

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"پیر اور جمعرات کے روز جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر اس بندے کے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو' سوائے اس آدمی کے کہ اس کے اور اس کے (کسی مسلمان) بھائی کے درمیان دشمنی ہو۔ کہا جاتا ہے : ان دونوں کو مہلت دی جائے یہاں تک کہ یہ صلح کرلیں' ان دونوں کو صلح کرنے تک مہلت دی جائے۔" (مسلم)

فائدہ : اس میں بھی باہم دشمنی اور بغض و عناد کو جنت سے محرومی کا سبب بتلایا گیا ہے۔

حسد کے حرام ہونے کا بیان

اور یہ کسی صاحب نعمت سے زوال نعمت کی آرزو کرنے کا نام ہے' وہ نعمت دینی ہو یا دنیوی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"کیا وہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس نعمت پر جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دی۔" (النساء)

ٹوہ لگانے کی ممانعت' نیز دوسرے کے ناپسند

کرنے کے باوجود اس کی بات سننے کی ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ٹوہ مت لگاؤ۔" (مسلمانوں کے عیبوں اور کمزوریوں کو تلاش مت کرو۔) (الحجرات۔12)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور وہ لوگ جو بغیر قصور کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں انہوں نے یقیناً "بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب۔58)

بدگمانی اور حسد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے اور عیبوں کی ٹوہ مت لگاؤ اور نہ جاسوسی کرو اور نہ دوسرے کا حق غصب کرنے کی حرص اور اس کے لیے کوشش کرو' نہ ایک دوسرے سے حسد کرو' نہ باہم بغض رکھو ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ۔ اور اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی ہو جاؤ جیسے اس نے تمہیں حکم دیا ہے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے' نہ اس پر ظلم کرے' نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑے' نہ اس کو حقیر سمجھے۔ تقویٰ یہاں ہے۔ تقویٰ یہاں ہے' اور......

اپنے سینے کی طرف اشارہ فرماتے۔

آدمی کے برے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر خون' عزت اور مال حرام ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے نہ تمہاری صورتوں کو' وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے عملوں کو دیکھتا ہے۔" (صحیح بخاری)

ایک اور روایت میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک دوسرے سے حسد نہ کرو' باہم بغض نہ رکھو' جاسوسی نہ کرو' عیبوں کی ٹوہ مت لگاؤ' محض دھوکا دینے کے لیے بولی بڑھا کر مت لگاؤ اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔" (مسلم)

اور ایک روایت میں ہے۔ "ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو' نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ' اور باہم بغض نہ رکھو' نہ باہم حسد کرو اور اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی بن جاؤ۔" (مسلم)

ایک اور روایت' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک دوسرے سے بول چال بند مت کرو اور تم میں سے کوئی شخص دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ بدگمانی سے مراد کسی مسلمان کی بابت ایسا گمان ہے جس کا کوئی ظاہری سبب نہ ہو' اسی طرح وہ خیال ہے جو بغیر کسی دلیل کے دل میں پیدا ہو۔

2۔ دھوکا دینے کے لیے بولی میں اضافہ کرنے کا مطلب یہ ہے کسی سودے کی بولی میں اس لیے اضافہ کرنا تاکہ دوسرے لوگ دھوکا کھا جائیں' اس کا مقصد خریدنا نہ ہو۔

3۔ اس حدیث میں جو ہدایات دی گئی ہیں' ان کا مقصد مسلمان کی عزت کا تحفظ ہے' بلاوجہ بدگمانی' عیبوں اور کمزوریوں کی تلاش مسلمان کی عزت کے منافی ہے' اس لیے ان سے روک دیا گیا۔ دوسرا مقصد اخوت اسلامیہ کی پاس داری ہے' اسی لیے ظلم کرنے سے' دست گیری کے وقت بے یار و مددگار چھوڑنے سے' حقیر سمجھنے سے اور تکبر کرنے سے روک دیا گیا ہے اور مسلمان کی جان' مال اور عزت کو دوسرے مسلمان پر حرام کر دیا گیا ہے۔ بولی میں اضافے اور سودے پر سودا کرنے کی ممانعت بھی اسی لیے ہے کہ ان سے بھی بغض و نفرت پیدا ہوتی ہے۔

داخلے جاری ہیں

انشا جی

پرسوں ایک صاحب تشریف لائے۔

ہے رند سے زاہد کی ملاقات پرانی

پہلے بریلی کو بانس بھیجا کرتے تھے۔ یہ کاروبار کسی وجہ سے نہ چلا تو کوئلوں کی دلالی کرنے لگے۔ چونکہ صورت ان کی محاورے کے عین مصداق تھی' ہمارا خیال تھا اس کاروبار میں سرخ رو ہوں گے۔ لیکن آخری بار ملے تو معلوم ہوا نرسری کھول رکھی ہے پودے اور کھاد بیچتے ہیں۔ پھولوں کے علاوہ سبزیوں کے بیج بھی ان کے ہاں سے بارعایت مل سکتے ہیں۔

آتے ہی کہنے لگے۔ "دس روپے ادھار دیں گے؟"

ہم نے نہ دینے کے بہانے سوچتے ہوئے استفسار کیا۔

"کیا ضرورت آن پڑی ہے؟"

فرمایا۔ "اپن اولی قسم کے آدمی ہیں اپن سے اب گھاس نہیں کھودی جاتی۔ کھاد اور پودے نہیں بیچے جاتے۔ اب ہم ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جس سے قوم کی خدمت بھی ہو۔"

ہم نے کہا۔ "دس روپے میں اسکول کھولیے گا؟"

بہت ہنسے اور بولے "اچھی رہی۔ بھلا دس روپے میں بھی اسکول کھولا جا سکتا ہے۔ دس روپے میرے اپنے پاس بھی تو ہیں۔ دیکھیے سیدھا سیدھا حساب ہے۔ ایک دس روپے کا تو بورڈ لکھوایا جائے گا۔ بورڈ کیا کپڑے پہ نام لکھوانا ہی کافی ہو گا اور دوسرے دس روپے سے جو آپ مجھے دیں گے' میں شہر کی دیواروں' کھمبوں' بس اسٹینڈوں وغیرہ کے چہرے پر کالک پھیروں گا۔ یعنی اپنا اشتہار لکھواؤں گا کہ اے عقل کے اندھو۔ گانٹھ کے پورے آؤ کہ داخلے جاری ہیں۔"

ہم نے کہا "یہ جو تم لوگوں کے لیے گھروں کی دیواروں کو کالا کوجی پھیر کر خراب کرو گے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے تمہیں؟ کارپوریشن نہیں روکتی' پولیس نہیں ٹوکتی؟"

بولے "پہلے یہ لوگ ملاوٹ کو تو روک لیں۔ عطائیوں اور گداگروں کو تو ٹوک لیں۔ شہر سے گندگی کے ڈھیر تو اٹھوالیں' کتے تو پکڑوالیں اور مچھروں مکھیوں کے منہ تو توڑیں۔"

ہم نے کہا۔ "آپ بھی بچے ہیں۔ ان لوگوں کی مصروفیات کا ہمیں خیال ہی نہ رہا تھا۔ اچھا اگر یونین کمیٹیوں کو خیال آگیا کہ ان کا تحفظ اچھا ہونا چاہیے۔"

ٹھٹھا مار کر بولے۔ "یونین کمیٹیاں؟ یہ کون لوگ ہیں کیا کام کرتے ہیں؟"

ہم نے کھسیانے ہو کر پوچھا "آپ کے پاس اسکول کے لیے عمارت بھی ہے۔ خاصی جگہ درکار ہوتی ہے۔ آپ کا گھر تو جہاں تک ہمیں معلوم ہے 133 گز کا ہے۔"

فرمایا۔ "وہ ساتھ والا پلاٹ خالی ہے نا؟ جس میں ایک زمانے میں بھینسیں بندھا کرتی تھیں' بچوں سے تین تین ماہ کی پیشگی فیس لے کر اس پر ٹین کی چادریں ڈلوا لیں گے۔ فی الحال تو اس کی بھی ضرورت نہیں۔ گرمیوں کے دن ہیں۔ اوپن ایئر ٹھیک رہے گا۔ سنا ہے شانتی نکیتن میں بھی کھلے میں کلاسیں لگتی تھیں۔"

ہم نے کہا "آپ کی بات کچھ ہمارے جی کو نہیں لگتی۔ بارشیں آنے والی ہیں۔ ان میں اسکول بہہ گیا تو؟"

سوچ کر بولے "ہاں یہ تو ہے۔ جگہ تو اپنی نرسری کے سائبان میں بھی ہے' بلکہ اسکول کھولنے کا خیال ہی اس لیے آیا کہ کئی والدین نرسری کا بورڈ دیکھ کر آئے اور کہنے لگے ہمارے بچوں کو اپنی نرسری میں داخل کر لو۔ بڑی مشکل سے سمجھایا کہ یہ وہ نرسری نہیں' بلکہ پھولوں پودوں والی نرسری ہے۔ لیکن وہ کی

زور دیتے رہے کہ اسکولوں میں تو داخلہ ملتا نہیں ہمیں داخل کر لو ہمارے بچوں کو کم از کم ہال کا کام سیکھ جائیں گے۔"

ہم نے کہا۔ "کس درجے تک تعلیم ہوگی؟"

فرمایا۔ "میٹرک تک تو ہونی ہی چاہیے۔ اس کے ساتھ کے جی اور فنکنری اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا۔ "مانٹیسوری سے مطلب ہے غالباً۔"

فرمایا۔ "ہاں ہاں۔ مانٹیسوری۔ میرے منہ سے ہمیشہ فنکنری ہی نکلتا ہے۔"

"پڑھائے گا کون؟" ہم نے دریافت کیا۔

بولے۔ "میں جو ہوں اور کون پڑھائے گا۔ اب مشق چھٹی ہوئی ہے ورنہ مڈل تو بندے نے بھی اچھے نمبروں میں پاس کر رکھا ہے۔ اے بی سی تو اب بھی پوری آتی ہے۔ سناؤں آپ کو؟
اے بی سی ڈی ای۔"

ہم نے کہا۔ "نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کی اہلیت میں کسے شک ہے؟ لیکن آپ تو پرنسپل ہوں گے پھر آپ کی دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ یہ پھول پودے کا کاروبار بھی خاصا نفع بخش ہے۔ یہ بھی جاری رہنا چاہیے۔"

بولے "ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ خیر ساٹھ ستر روپے میں کوئی بی اے۔ ایم اے پاس ماسٹر یا ماسٹرنی رکھ لیں گے۔ جب تک چاہا کام لیا۔ چھٹیاں آئیں نکال باہر کیا۔ بلکہ ہمارے اسکول میں تو تین مہینے کے بجائے چھ ماہ کی چھٹیاں ہوا کریں گی تاکہ بچوں کی صحت پر پڑھائی کا کوئی برا اثر نہ پڑے۔"

"نام کیا رکھا ہے اسکول کا؟" ہم نے پوچھا۔
"مدرسہ تسلیم الاسلام اقبال ہائی اسکول وغیرہ؟"

بولے "جی نہیں۔ نام تو انگریزی چاہیے۔ فسٹ کلاس قسم کا ہو جس سے معلوم ہو کہ ابھی ابھی انگریزوں نے آکر کھولا ہے۔ کسی سینٹ کا نام تو اب خالی نہیں سینٹ جوزف سینٹ پیٹرک۔ سینٹ یہ سینٹ وہ سب ختم ہو گئے۔"

ہم نے کہا "سینٹ ماتا ہری ٹھیک ہو سکتا ہے۔"

غور کر کے کہنے لگے "نہیں ہمارے اسکول میں جاسوسی کی تعلیم نہیں دی جائے گی۔"

"پھر آکسفورڈ کیمبرج وغیرہ کے نام پر رکھیے۔"

فرمایا۔ "یہ بھی بہت ہو گئے بلکہ لٹل فوک اور چلڈرن ہوم اور گرین وڈ وغیرہ بھی کئی ایک ہیں۔ میرا ارادہ "ہمپٹی انگلش اسکول" نام رکھنے کا تھا۔ لیکن وہ بھی کسی نے رکھ لیا۔ آج سارے ناظم آباد کی گلیوں پر یہی لکھا دیکھا۔"

اس پر ہمارے ذہن میں ایک نکتہ آیا۔ ہم نے کہا۔ "ہمپٹی ڈمپٹی دو بھائی تھے۔ بھائی نہیں تھے تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تو تھے ہی۔ آپ نہلے پہ دہلا ماریے۔ "ڈمپٹی انگلش اسکول" نام رکھیے۔ اس میں بچت بھی ہے۔ نیا اشتہار لکھوانے کی ضرورت بھی نہ پڑے گی۔"

"وہ کیسے؟" ازراہ اشتیاق پوچھنے لگے۔

ہم نے کہا۔ "پینٹر سے کہیے کہ رات کو کوچی لے کر نکلے۔ ہمپٹی کی "ہ" پر کوچی پھیرتا جائے اور اسے "ڈ" بناتا جائے۔ سفیدی برائے نام خرچ ہوگی۔ دو تین روپے سے زیادہ نہ دیجیے گا پینٹر کو۔"

بولے۔ "بات تو آپ بھی کبھی کبھی ایسی کر جاتے ہیں

دانا اندر آں حیراں بماند

مفت اور مفید مشورے کا شکریہ۔ لیکن وہ دو روپے تو دلوائیے اور ایک پان کھلوائیے۔ ڈبل کتھے چونے کا۔"

یوں اسکول کھل گیا اور یوں اسکول کھل رہے ہیں۔ جس کا لکڑیوں کا ٹال نہ چلا اس نے اسکول کھول لیا اور جس کی نرسری کے پودے نہ بکے اس نے بھی اسکول کھول لیا۔ اسکول بڑھتے جاتے ہیں تعلیم گھٹتی جاتی ہے۔ خیر اس میں نقصان بھی کچھ نہیں آج تک کسی کا تعلیم سے کچھ بنا بھی ہے؟

ہم نے بی اے کیا کلرک بنے
وہ مڈل فیل تھے وزیر ہو گئے

باصلاحیت فنکارہ

عاصمہ جہانگیر سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"عاصمہ جہانگیر۔"

2 "پیار کا نام؟"
"یہی ہے، مزید کوئی نام نہیں ہے۔"

3 "تاریخ پیدائش/شہر؟"
"28 جنوری، کوئٹہ۔"

4 "قد/اسٹار؟"
"5 فٹ 8 انچ، دلو۔"

5 "بہن بھائی/آپ کا نمبر؟"
"بڑی بہن، پھر بھائی اور پھر میں۔ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی۔"

6 "تعلیمی قابلیت؟"
"گریجویشن کی ہوئی ہے سائیکالوجی اور سوشیالوجی میں۔"

7 "شادی پسند سے؟"
"ابھی نہیں ہوئی... اپنی اور گھر والوں کی پسند سے کروں گی۔"

8 "پہلا پروگرام/وجہ شہرت؟"
"مجھے روشنے نہ دیا اور اسی سے شہرت ملی۔"

9 "پہلی کمائی/کیا کیا تھا؟"
"پہلی کمائی ٹھیک سے یاد نہیں۔ شروع شروع میں کہاں اچھا ملتا ہے اور خرچ کر دی تھی۔"

10 "شوبز میں کیا برا لگا؟"
"سیدھا سا نام زیادہ ہے اور سب اپنے پر منحصر ہے۔ اچھائی برائی ہر جگہ ہوتی ہے۔"

11 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"ریکارڈنگ کی ٹائمنگ کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ ورنہ گیارہ بارہ بجے اٹھ جاتی ہوں۔"

12 "اور رات؟"
"بہت دیر سے۔ فیملی کے ساتھ گپ شپ میں چار پانچ تو بج ہی جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی رات بارہ ایک بجے بھی

سو جاتی ہوں۔"

13 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"

"پانی پینے کا" ریکارڈنگ کے دوران بھی پانی بہت پیتی ہوں۔"

14 "گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"

"کوئی بات بری نہیں لگتی 'سب بہت زیادہ پوزیسو ہیں۔ دوستوں کی طرح ہیں۔"

15 "قومی تہوار شوق سے مناتی ہیں؟"

"شوق سے مناتی تھی۔ بچپن میں 'اب حالات بدل گئے ہیں 'اب گھر میں ہی رہ کر قومی تہوار مناتے ہیں۔"

16 "اللہ نے آپ کو مکمل بنایا ہے یا کچھ کمی رہ گئی؟"

"الحمدللہ اس نے مجھے ایک مکمل انسان بنایا ہے... اور ویسے بھی ہمیں اپنے سے کم لوگوں کو دیکھنا چاہیے خواہ جسمانی لحاظ سے ہو یا مالی لحاظ سے۔"

17 "شدید دھوپ میں آپ کی کیفیت؟"

"بہت غصہ آتا ہے اور چڑچڑاہٹ ہوتی ہے۔ گرمی بالکل برداشت نہیں ہوتی۔"

18 "اور شدید بھوک میں؟"

"بچپن میں تو میں رو پڑتی تھی بھوک لگتی تھی تو... اب کام میں پتا نہیں چلتا لیکن بہت بھوک لگی ہو تو کہہ دیتی ہوں کہ کھانا لگا دیں بھوک برداشت نہیں ہو رہی۔"

19 "کس دن کا شدت سے انتظار رہتا ہے؟"

"اس دن کا جب پوری فیملی ایک جگہ ہو اور خوشی کے ساتھ ہو۔"

20 "تھکن میں بھی کہاں جانے کے لیے تیار رہتی ہیں؟"

"گھر... کہیں جانے کا دل نہیں کرتا... بس گھر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔"

21 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"

"چیخیں مارتی ہوں۔"

22 "دماغ کا میٹر گھومتا ہے؟"

"جلدی نہیں گھومتا 'لیکن کسی کی بدتمیزی برداشت نہیں ہوتی۔"

23 "غصے میں کیا کرتی ہیں؟"

"مارتی نہیں 'چیختی نہیں چلاتی نہیں 'مگر بس دماغ گھوم جاتا ہے۔"

24 "طبیعت میں ضد ہے؟"

"جی بہت زیادہ ضد ہے۔"

25 "مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

"اچھے کردار والے مرد 'خواہ وہ باپ ہو یا بھائی یا شوہر مجھے اچھے لگتے ہیں اور یہی بات میں خواتین کے لیے بھی کہتی ہوں۔"

26 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"

"تو میں کہہ دیتی ہوں کہ مسئلہ کیا ہے۔"

27 "پرائز بانڈ لینے کا شوق ہے؟"

"تھا... لیے بھی تھے 'مگر جب ایک سال تک نہیں نکلے تو بیچ دیے۔"

28 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"مما اور بھائی کے 'پیار بھی انہی سے ہے اور ڈر بھی انہی سے لگتا ہے۔"

29 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"
"میرا خیال ہے کہ ہر چیز اپنے مقررہ وقت پر ہی ملی ہے۔"
30 "شاپنگ میں سب سے پہلے کیا خریدتی ہیں؟"
"مجھے کپڑوں کا اور پرفیوم کا شوق ہے۔ وہی خریدتی ہوں۔"
31 "آپ کے دنیا میں آنے کا مقصد؟"
"مجھے لگتا ہے کہ میں اپنی ماں کو بہت زیادہ خوش رکھنے کے لیے آئی ہوں' میں ان کی اداسی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"
32 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟"
"کچھ بھی نہیں۔ بے دریغ خرچ کرتی ہوں۔"
33 "کوئی برا وقت جو آپ نے گزارا؟"
"اتنا تو نہیں ہے... مگر زندگی میں چھوٹے چھوٹے تجربات بہت ہوئے' برے تجربے سے بہت کچھ سیکھتی ہوں۔"
34 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"
"میری ماں میرے لیے بہترین تحفہ ہے۔"
35 "کس پسندیدہ شخصیت کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتی ہیں؟"
"ایک شام نہیں' بلکہ پوری زندگی گزاروں گی اپنے لائف پارٹنر کے ساتھ۔"
36 "کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟"
"ہری بھری خوشگوار ماحول۔"
37 "پسندیدہ پروفیشن؟"
"میرا فرض تھا ماہر نفسیات بنے کا تو یہی پروفیشن مجھے پسند ہے۔"
38 "کیا آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں؟"
"نہیں جی... اگر کام ہوتا ہے تو فوراً ہی اٹھ کر تیار ہو کر چلی جاتی ہوں۔ ورنہ لیٹی رہتی ہوں۔"
39 "مخلص کون ہوتے ہیں آپ کے لیے؟"
"اپنے۔"
40 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"
"گھر میں... گھر میں ہی سکون ملتا ہے۔"
41 "لباس میں کیا پسند ہے؟"
"شلوار قمیص ہی... مجھے ڈھکا ہوا لباس پسند ہے۔ جیسے ایسٹرن کپڑے۔"
42 "اپنی شخصیت کے لیے کوئی ایک لفظ؟"
"خوش قسمت۔"
43 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے گھر میں اور اپنے کمرے میں۔"
44 "ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"
"نعمان اعجاز... ان سے ملاقات ہے مگر کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔"
45 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟"
"اگر میں ریکارڈنگ میں ہوں اور گھر سے کوئی ایس ایم ایس آتا ہے تو ان ہی کو جواب دیتی ہوں۔"
46 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟"
"گانے سنتی ہوں۔"
47 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"نہیں' میرا اصول یہی ہے کہ میں انہی کو فون نمبر دوں جن سے میرا تعلق ہے۔"
48 "مہمانوں کی آمد کیسی لگتی ہے؟"
"کبھی کبھار بری لگتی ہے کیونکہ مینیج کرنے میں مشکل ہوتی ہے۔"
49 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"کچھ بھی نہیں۔"
50 "تنقید بری لگتی ہے؟"
"نہیں کوئی بھی بات اگر اچھے طریقے سے کی جائے وہ بری نہیں لگتی۔"
51 "انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور کون سا ہوتا ہے؟"
"وہ دور جس میں آپ کے والدین آپ کے ساتھ ہوتے ہیں۔"

52 "وقت کی پابندی کرلیتی ہیں؟"
"کوشش کرتی ہوں... مگر کبھی کبھی نہیں بھی ہوپاتی۔"
53 "کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟"
"عزیزوں پر۔"
54 "اپنی کمائی سے اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"میں ابھی پڑھتی ہوں' والدہ ہی لیتی ہیں۔"
55 "کھانے کے لیے آپ کی پسندیدہ جگہ' چٹائی' اپنا بیڈ یا ڈائننگ ٹیبل؟"
"میں زمین پر بیٹھ کر یعنی چٹائی پہ کھانا پسند کرتی ہوں۔"
57 "دنیا سے کیا چیز چھین لینا چاہتی ہیں؟"
"نہیں کچھ بھی نہیں۔ سب کو اپنی قسمت کے مطابق ملتا ہے اور میرے پاس سب کچھ ہے۔"
58 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"کوئی خاص نہیں۔ فیس بک سے تو اپنا اکاؤنٹ بند کردیا ہے۔"
59 "فیوچر پلاننگ؟"
"بس ابی کو کامیابی سے لے کر آگے تک جانا ہے۔"
60 "کانٹی نینٹل کھانے پسند ہیں یا دیسی؟"
"دیسی اور سبزیاں بہت پسند ہیں۔ گوشت زیادہ پسند نہیں۔"
61 "ایک کھانا جو بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟"
"مسور کی دال بہت اچھی پکا لیتی ہوں۔"
62 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"
"عورت ہی... ظاہر ہے کہ عورت ایک حساس دل رکھتی ہے۔"
63 "بہترین کک کون ہوتے ہیں مرد یا عورت؟"
"مرد زیادہ اچھا پکاتے ہیں۔"
64 "کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"
"میرے پاس میرے سب پیارے ہیں' بس جو میری زندگی میں آئے گا اسے زندگی بھر پاس رکھنے کا تاوان وصول کروں گی۔"

65 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"لال بیگ' کسی سے اتنا نہیں ڈرتی جتنا لال بیگ سے ڈرتی ہوں۔"
66 "خودکشی کرنے والے کے لیے کیا کہیں گی؟"
"یہی کہ وہ بہت بزدل ہوتا ہے' جو حالات کو فیس نہ کر سکے وہ بزدل ہی ہوتا ہے۔"
67 "کس قسم کے رویے دکھ دیتے ہیں؟"
"میں کسی کے ساتھ بہت اچھا کروں' مگر وہ مجھے اچھا ریسپانس نہ دے اور ڈبل چہرے کے ساتھ سامنے آئے تو پھر دکھ ہوتا ہے۔"
68 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"مجھے شادی کی ساری رسمیں بہت پسند ہیں۔ پھر بھی مہندی سب سے زیادہ۔"
69 "شادی میں تحفہ بہتر رہتا ہے یا کیش؟"
"میرا خیال ہے کہ کیش دینا چاہیے تاکہ وہ اپنی مرضی سے جو چاہے خرید لے۔"
70 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا پسند ہے؟"
"ناشتہ میں عموماً کرتی نہیں' کھانا ماما کے ہاتھ کا۔"
71 "کس نامور شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"

"کسی سے بھی نہیں۔"

72 "اپنا فون نمبر تبدیل کرتی رہتی ہیں؟"

"زیادہ نہیں بس... پانچ بار تبدیل کیا ہوگا۔"

73 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"

"ہینڈ بیگ اور موبائل فون۔"

74 "اس فیلڈ میں آکر خاص ہو گئیں یا عام ہی ہیں؟"

"میں تو عام ہی ہوں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑا۔"

75 "اپنی غلطی تسلیم کر لیتی ہیں؟"

"سوری نہیں کرتی لیکن شو ضرور کر دیتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی تھی یا اکیلے میں بیٹھ کر کہہ دیتی ہوں کہ غلطی ہو گئی تھی۔"

76 "آپ کی اچھی اور بری عادت؟"

"بری عادت تو ضد ہے اور اچھی یہ کہ بہت خیال رکھتی ہوں سب کا۔"

77 "غصے میں کھانا زیادہ کھاتی ہیں یا کم؟"

"کم زیادہ کی بات ہی نہیں... کھانا ہی چھوڑ دیتی ہوں۔ لیکن ایسا ایک دو بار ہی ہوا ہے۔"

78 "غصے میں بولا لفظ کیا ہوتا ہے؟"

"مجھے بات نہیں کرنی۔"

79 "مارننگ شو شوق سے دیکھتی ہیں؟"

"مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہیں مارننگ شو۔"

80 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"

"مجھے سونے میں کافی ٹائم لگتا ہے۔"

81 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟"

"پانی، لیمپ، ٹیبل گھڑی، لائٹ وغیرہ۔"

82 "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"

"لوگ آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور آپ بھی انہیں ایسی ہی عزت دے رہی ہیں تو شہرت کبھی بھی مسئلہ نہیں بنتا۔"

83 "خدا کی حسین تخلیق؟"

"ماں۔"

84 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"تب جب میں بہت ہی خلوص دل کے ساتھ کسی کی مدد کرنا چاہوں یا کرتی ہوں مگر سامنے والے کی نیت صاف نہ ہو تو پھر۔"

85 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"

"سرکہ نہ ہو۔"

86 "زندگی کب بدلی؟"

"جب ماں کی دعائیں ملنے لگیں اور جب میں نے ہر کام ماں کے کہنے پر کیا۔ تو دیکھا کہ اللہ بہت مہربان ہو گیا ہے۔"

87 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"

"بہت چڑچڑاہٹ ہوتی ہے... موڈ خراب ہو جاتا ہے۔"

88 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"

"جب ضرورت پڑتی ہے۔"

89 "اپنی شخصیت میں کیا بدلنا چاہتی ہیں؟"

"میں لوگوں کا بہت زیادہ خیال رکھتی ہوں یہ بات لوگوں کو پسند بھی ہے مگر اس کا رزلٹ اچھا نہیں ملتا تو اسے تھوڑا کم کرنا چاہتی ہوں۔"

90 "کب اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کرتی ہیں؟"

"شام کے وقت۔"

91 "گھر آتے ہی پہلی خواہش؟"

"میک اپ صاف کروں اور گھر والوں کے ساتھ بیٹھوں۔"

92 "موبائل سروس کا آف ہونا کیسا لگتا ہے؟"

"کوئی خاص نہیں جب تک کہ کسی سے کوئی ضروری بات نہ کرنی ہو۔ ورنہ دیگر سہولتیں تو بہت ہیں۔"

93 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"

"50 روپے تک۔"

94 "لائٹ چلی جائے تو؟"

"بے ساختہ کہتی ہوں یہ کیا تماشا ہے۔"

95 "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"

"کشمیر کے لیے۔"

96 "لوگ کن باتوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟"

"دوسروں کو ڈسکس کرنے پر۔"

☆

پیارے افضل کے مصنف

خلیل الرحمٰن قمر سے ملاقات

نفا ایمن رشید

کچھ صلاحیتیں ورثے میں ملتی ہیں اور کچھ صلاحیتیں خداداد ہوتی ہیں۔ فن کی دنیا میں ہم ایسے بہت سے لوگ دیکھتے ہیں جن کے خاندان میں دور دور تک کوئی لکھاری 'کوئی مصور' کوئی اداکار نہیں ہوتا مگر وہ خود اپنی فیلڈ میں ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن قمر کے خاندان میں دور دور تک کسی کو لکھنے کا شوق نہیں ہے مگر اللہ نے ان کو یہ صلاحیت دی اور انہوں نے معرکتہ الآرا تحریریں لکھ کر نام کمایا۔ آیئے خلیل الرحمٰن قمر صاحب سے پوچھتے ہیں کہ وہ اتنے کامیاب کیونکر ہو پائے!

"کیسے ہیں خلیل الرحمٰن قمر صاحب۔ آواز نیند والی لگ رہی ہے' ابھی اٹھے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ جی بس تھوڑی دیر پہلے ہی۔"

"ناشتا کرلیا آپ نے؟"

"جی۔"

"ماشاء اللہ سے آپ کا ہر سیریل ہی ہٹ جاتا ہے۔ مگر "پیارے افضل" کو کچھ زیادہ ہی پذیرائی ملی۔ امید تھی آپ کو؟"

"میرا ایمان ہے کہ یہ سارے کام اللہ ہی کرواتا ہے۔ اور میں اپنی پوری دیانت داری سے وہی کچھ لکھتا ہوں جو اللہ میرے ذہن میں ڈالتا ہے یا وہ جو وہ مجھ سے لکھوانا چاہتا ہے۔ یہ عزتیں دینا' کسی چیز کو ہٹ کروانا' یہ سب اس اوپر والے کی مہربانیاں ہیں اور میرا ایمان ہے کہ جب تک آپ دیانت داری سے محنت کرتے ہیں۔ وہ آپ کو دیتا رہے گا اور وہ تو دیانت داری سے کام کرنے پر سوؤں کو دیتا رہتا ہے۔ میں تو پھر اس کے محبوب نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ہوں۔"

"یہ "پیارے افضل" کردار وجود میں کیسے آیا؟"

"میرا ایک دوست ہے۔ اللہ اسے لمبی زندگی دے۔ میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم آٹھویں یا نویں کلاس میں

پڑھتے تھے۔ تو روزانہ اس کو ایک لڑکی خط لکھتی تھی اور وہ ہمارے پاس بیٹھ کر وہ خط پڑھا کرتا تھا۔ ہم بہت حیران ہوا کرتے تھے۔ اس کا نام بھی افضل تھا۔ خط کے شروع میں لال پین سے لکھا ہوتا تھا۔ "پیارے افضل" اور اس کے بعد کالی نیلی روشنائی سے عبارت لکھی ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ کوئی ڈھائی تین مہینے چلتا رہا اور ہم خط سنتے رہے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ یہ خط خود ہی لکھا کرتا تھا اپنے آپ کو۔ ایک دن میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ایک دن ندیم بیگ، ہمایوں سعید اور یاسر ہم سب مل کر بیٹھے ہوئے تھے تو میں نے یوں ہی یہ واقعہ سنایا تو سب ہنس ہنس کے بے حال ہو رہے تھے۔ تو یاسر نے مجھ سے کہا خلیل بھائی! اس پہ سیریل لکھیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو ایک چھوٹا سا واقعہ ہے اس پہ کیا سیریل لکھوں۔ اس نے مجھے خاصا کنونس کیا مگر میں نہیں ہوا۔ پھر ایک دن مجاور تکل صاحب کے یہاں یاسر سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے پھر کنونس کیا اور کہا کہ خلیل صاحب یہ آپ پر قرض ہے۔ اس بات پر مجھے لگا کہ کچھ ہے اس کہانی کے پیچھے۔ تو میں نے سوچ و بچار کیا کہ اس واقعے سے کہانی کیسے نکل سکتی ہے یا بن سکتی ہے۔ تو اللہ نے مہربانی کی اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ یاسر مجھے کب سے کہہ رہا تھا مگر بات دراصل یوں ہے کہ کوئی فورس کر کے مجھ سے نہیں لکھوا سکتا، خواہ آئیڈیا کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ بس جب میرا اپنا موڈ ہوتا ہے تب ہی میں لکھتا ہوں۔"

"پیارے افضل" کی کامیابی کا کریڈٹ کس کو دیں گے؟ اچھی کہانی کو یا ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور فنکاروں کو؟"

"جب میرا سیریل "لنڈا بازار" ہٹ ہوا تو مقابلے میں اتنے چینلز نہیں تھے۔ اب اتنے چینلز ہیں۔ اس کا ہٹ ہونا اللہ کی مہربانی تو ہے ہی، لیکن سب نے بہت اچھا کام کیا۔ آپ نے میرے انٹرویو میں تین ورڈ کا جملہ کبھی نہیں سنا ہوگا۔ لیکن میں پہلی بار آپ سے کہہ رہا ہوں کہ

was absolutely team work "

یار" (یہ ٹیم ورک تھا) ندیم بیگ نے بہت اچھا کام کیا۔ میرے فنکار موتیوں کی طرح پروئے ہوئے تھے اپنے کرداروں میں۔ کرداروں کے انتخاب کے وقت لڑائیاں بھی ہوئیں کیونکہ کاسٹنگ میں ساتھ بیٹھ کر کرتا ہوں اور ہم نے جو فیصلے کیے وہ اللہ نے صحیح کر دیے۔"

"آپ کے اس سیریل نے آپ کے فنکاروں کو بہت مغرور کر دیا ہے۔ خواہ وہ ثنا جاوید ہوں، نمازہ خان ہوں یا حمزہ عباسی ہوں۔ آپ کا کیا حال ہے۔ غرور آیا؟"

"جب میری کوئی سیریل ہٹ ہوتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر آزمائش کا وقت آگیا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور مجھے ڈر لگنے لگتا ہے، پھر میں اللہ سے معافی مانگتا ہوں۔ کیونکہ چیزیں میری وجہ سے ہٹ نہیں ہوتیں، لیکن میرے نام لگ جاتی ہیں کہ یہ خلیل الرحمن قمر کا سیریل ہے اس لیے ہٹ ہوا ہے۔ لکھنا اگرچہ مشکل کام ہے مگر یہ اس کی مہربانی ہے کہ وہ مجھ پہ اپنا کرم کر دیتا ہے اور کوئی چیز ہٹ ہو تو اسے جلد بھول جانا چاہیے۔ ورنہ آپ کے دماغ میں خناس سما جائے گا اور ایسے لوگوں کی ڈور اللہ میاں بڑی جلدی کھینچتا ہے۔ میں ایسے کئی واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں یہ میری کوئی پہلی کامیابی نہیں ہے۔ "بوٹا" بھی ہٹ ہوا۔ پانی ہٹ ہوا، میں مرگئی شوکت علی، "کا شوکت علی ہٹ ہوا اور آج اللہ نے پیارے افضل کو عزت دی۔ میں ان سب کو منع کروں گا کہ اللہ کے واسطے اس وقت سے ڈریں جب کوئی مشکل آئے، کیونکہ اتنی عزت، شہرت دے کر اللہ دراصل آپ کا امتحان لے رہا ہوتا ہے۔"

"آپ کے ڈرامے شروع تو سیریل کی طرح ہوتے ہیں، پھر طوالت اختیار کرتے کرتے سوپ کی طرح طویل ہو جاتے ہیں اور۔۔۔"

"شاہین صاحب! میں بڑے غصے سے آپ کی بات سے اختلاف کروں گا کہ ایک تو میرے یہاں سوپ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ سوپ کتنی گھٹیا چیز ہے۔ یہ میں

کسی دن تفصیل سے بتاؤں گا اور پھر جو لوگ بے نقاب ہوں گے تو آپ بھی سنیں گی اور زمانہ بھی سنے گا۔ پاکستان میں سوپ کبھی ہٹ نہیں ہو گا۔ مجھے یاد ہے کہ نیوز کاسٹر اظہر لودھی نے اس بات پر مجھ سے گالیاں کھائی تھیں۔ پاکستان ٹیلی وژن کی ایک میٹنگ میں ہم بیٹھے تھے کہ اظہر لودھی نے ایک پر فارما دیا' جس پر لکھا تھا۔

"Soup is a drama dose not have a story"

میں نے اٹھا کر اس کے منہ پر مارا اور کہا کہ اس لیے تم نے مجھے بلایا ہے۔ سوپ کبھی پاکستان میں ہٹ نہیں ہو گا میں لکھ کر دیتا ہوں۔ بکواس کرتے ہیں چار لفظ انگریزی کے پڑھ کر آنے والے۔۔۔ میرے ڈرامے میں کہانی ہوتی ہے۔ میرے ڈرامے میں Concept ہوتا ہے اور اس کے ذریعے میں لوگوں کی تربیت کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہوں' کیونکہ یہ میری ذمہ داری ہے۔ اللہ نے مجھے اس کام کے لیے بھیجا ہوا ہے۔ ڈراما لکھنے کے بعد اس کو لمبا کرنا میرے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن جب میں سوچ لیتا ہوں' بجھ کرنے کا تو اللہ کی مہربانی ہو جاتی ہے مجھ پر۔ اگر آپ قسطیں نہ گنیں تو کبھی محسوس نہیں کر سکتے کہ ڈراما طوالت اختیار کر گیا ہے۔ میرا "للنڈا بازار" بھی بیالیس اقساط پر مبنی تھا۔ الحمدللہ پسندیدگی میں فرق نہیں آیا۔"

"مزید کیا آنے والا ہے؟؟"

"میرے کافی سیریلز آنے والے ہیں۔ ان میں "صدقے تمہارے" یہ میری اپنی زندگی کی کہانی ہے جو کہ سو فیصد نہیں بلکہ دو سو فیصد سچائی پر مبنی ہے۔ "ان سنی" "مجھو ایکسپریس" "آئی ایم سوری حسن زہرا" "یاد کر سترا غم اور ہم" "میرے پاس تم ہو اور تم سے پیار نہیں کر لی" "زنانی یوسف" کچھ تکمیل کے مراحل میں ہیں اور کچھ کی شوٹ شروع ہونے والی ہے۔"

"یہ آپ فیصلہ کرتے ہیں کہ اپنا سیریل فلاں چینل کو دینا ہے یا ڈائریکٹر کرتا ہے؟"

"99 فیصد میرا فیصلہ ہوتا ہے کہ کن چینلز کو دینا ہے۔"

"اس کی خاص وجہ"

"ای ایکسپریس کے لیے تو میں کبھی بھی کام نہ کروں۔ میرا ایک سیریل بہت برا رہا ان کے ساتھ۔ اس لیے اب وہ مجھے پسند ہی نہیں ہے۔ "ہم" کے لوگ بڑے پروفیشنل ہیں اور میں مومنہ' مومل اور میمونہ کو "ٹرپل ایم" کہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے پناہ صلاحیتوں کے ساتھ بھیجا ہے۔ بہت ہی کریزی لوگ ہیں یہ بلکہ تینوں۔ مجھے نہیں یاد کہ میں زندگی میں کسی سے متاثر ہوا ہوں' مگر میں ان تینوں سے بہت متاثر ہوں۔ ان لڑکیوں کی نظریں کہیں اور ہیں۔ یہ قد آور لڑکیاں ہیں۔ ان کی سوچ محدود نہیں ہے۔ ان کا ویژن بہت بڑا ہے۔"

"لکھنے کا عمل کب سے جاری ہے؟"

"جب پہلی بار پتا چلا کہ قلم کیسے پکڑا جاتا ہے۔ آپ یقین مانیں کہ اس وقت سے لکھ رہا ہوں۔ بہت ڈرامے لکھے' بچوں کی کہانیاں لکھیں اور بہت کچھ چھپا اس زمانے میں۔ آٹھویں جماعت میں "امروز" بچوں کا ممبر بن گیا تھا۔ ان کا اعزازی ایڈیٹر تھا اور آپ کو اس وقت کی میری چیزیں مل جائیں تو آپ خود محسوس کریں گے کہ اللہ نے اس وقت بھی اچھا لکھنے کی توفیق دی ہوئی تھی۔ آپ فرق نہیں محسوس کر سکیں گی آج کے خلیل الرحمٰن قمر میں اور اس وقت کے خلیل الرحمٰن قمر میں۔ تجربوں کا فرق ضرور آیا ہو گا۔"

"اور اک کیسے ہوا؟"

"میرے خاندان میں اگر میں پورا "شجرہ" بھی نکال لوں تو میرا نہیں خیال کہ کسی نے کچھ لکھا ہو گا۔ جس خاندان سے میں آیا ہوں۔ اللہ ان کو بہت بڑی عمر دے۔ وہاں آج بھی اردو کا ایک فقرہ بھی ٹھیک سے نہیں بولا جاتا۔ وہ ٹھیٹ پنجابی لوگ ہیں اور میں جوائنٹ فیملی میں رہتا ہوں۔ ان کے پاس رہ کر ہی لکھتا ہے۔ مجھے بہت پیار ہے ان لوگوں سے اور جب میں ان کے درمیان ہوتا ہوں تو ان ہی کی طرح کا ہوتا ہوں۔ میں نے اردو شاعری بھی پڑھی ہے۔ میں نے اردو لکھی

ہے اور اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بہت کرم تھا کہ میں اچھا سامع تھا۔ اچھا بولنے والوں کو سنا کرتا تھا۔ جب میں فرسٹ ایئر میں تھا تو میرے استاد ڈاکٹر احراج نقوی' وہ لکھنؤ سے پی ایچ ڈی تھے اور کیا خوب صورت آدمی تھے اور کیا خوب اردو بولتے تھے۔ میری بڑی خواہش ہے کہ میں مرنے سے پہلے ان کے لب و لہجہ میں اردو بولوں۔ ابھی تک مجھے ان کی طرح اردو بولنے والا نظر نہیں آیا۔"

"کب آپ سے کہا گیا کہ آپ ہمارے لیے بھی ڈراما لکھیں؟"

"میرا اپنا پروڈکشن ہاؤس تھا۔ میں لوگوں کے لیے نہیں لکھتا تھا لیکن جب میں نے اپنا پہلا سیریل "ہوٹا فرام ٹوبہ ٹیک سنگھ" لکھا تو اس کی کامیابی کے بعد معاملہ بڑا گمبھیر ہو گیا اور مجھے ساری آفرز آنے لگیں۔ اور لمبے لمبے سیشن لگے مجھے کنوینس کرنے کے لیے۔ مجھے یاد ہے کہ پی ٹی وی لاہور کی جی ایم نے بلایا کہ آپ پی ٹی وی کے لیے لکھیں.... میں اس وقت بہت پیسے لیتا تھا اور پی ٹی وی اس قابل نہیں تھا کہ وہ اتنے دیتا۔ میں نے کہا مجھے بتا دیجیے گا کہ میرے ذمے کیا کنٹری بیوشن ہے۔ ورنہ اللہ نے مجھے اپنے طریقے سے بھیجا اور میں نے اپنے پیسوں سے پروڈکشن ہاؤس شروع کیا۔ ڈراما شروع کیا۔ آپ نے مجھے جاننے میں کوئی تردد نہیں کیا تو آپ ڈیزرو بھی نہیں کرتے۔ اسی لیے میں نے آج تک پی ٹی وی کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ میرا جگری یار ہے ایم ڈی پی ٹی وی لاہور کا۔ اس نے مجھے کہا مگر میں نے منع کر دیا کہ میں پی ٹی وی کے لیے نہیں لکھوں گا۔ حالانکہ میں مانتا ہوں اس بات کو کہ میری جو تربیت ہوئی ہے' وہ پی ٹی وی کو دیکھ کر ہوئی ہے۔ نگران کے فرعون نما کھنا پروڈیوسر... مجھے نفرت ہوگئی' اس کے تو قریب سے گزرتے ہوئے مجھے گھن آتی ہے۔"

"ایک زمانہ تھا لوگ رائٹر کا نام دیکھ کر ڈراما دیکھا کرتے تھے کیا آج بھی ایسا ہے؟"

"آج بھی ایسا ہوتا ہے۔ آپ بھی خلیل الرحمٰن قمر

کا نام پڑھ کر لوگ ڈراما دیکھتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں تو مجبوری تھی۔ ایک چینل تھا۔ اس لیے اس زمانے کے رائٹرز کو کریڈٹ نہیں دے سکتا۔ یہ بات میں بہت معذرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ میں بانو قدسیہ کو بہت بڑا رائٹر مانتا ہوں۔ امجد اسلام امجد کو بھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت ایک ہی چینل تھا۔ اور جب اکیلی بیوی ہو تو مجبوری محبوبہ ہوتی ہے اور وہی بیوی ہوتی ہے۔"

"سارا پلاٹ سوچ کر لکھتے ہیں اور اینڈ؟"

"بالکل بھی نہیں سوچتا۔ "پیارے افضل" کے اینڈ پر اتنے مسئلے ہوئے اتنے جھگڑے ہوئے اینڈ پر کہ بس۔ فیملی کچھ چاہتی تھی اور ناظرین کچھ۔ میری بیوی نے ندیم بیگ سے بڑے سخت لہجے میں بات کی۔ اسے دھمکیاں دیں کہ تم گھر آئے تو تمہیں کچھ کھانے کو نہیں ملے گا۔ اگر تم نے اینڈ اچھا نہ کیا تو.... اور آج میں آپ کو بانگ دہل بتاؤں کہ میری اب جتنی بھی زندگی ہے مجھے یہ طے کرنے میں لگے گی کہ میں رائٹر بھی ہوں کہ نہیں۔ کیونکہ اللہ جو میرے اندر اتارتا ہے' میں وہی لکھتا ہوں۔ میں تو دو ٹکے کا نوازا ہوا

آدمی ہوں۔ اللہ کو پتا نہیں میری کیا بات پسند آئی کہ مجھ "کمینے" کو اس نے نواز دیا ہے۔"

"یہ عجز و انکساری تو رب کو پسند ہے۔"

"اس کو میری عجز و انکساری مت کہیے گا۔ میری اوقات ہی یہی ہے۔ میرا واسطہ اس ہستی سے ہے جس کی شان بہت بڑی ہے۔ جب "یو نا فرام ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "لنڈا بازار" ہٹ ہوا تو میرا انٹرویو لینے والوں نے کہا کہ خلیل صاحب! ہر انسان کی زندگی میں ایک 'دو ہٹ' چیزیں ہوتی ہیں۔ آپ کو اللہ نے پہلے قدم پہ ہی کامیاب کر دیا' آگے کیا کریں گے تو میں مسکرایا اور کہا کہ تم لوگ مجھے دیکھ رہے ہو' میرے دینے والے کو نہیں دیکھ رہے۔ تو مجھے نہ دیکھیے۔ میرا دینے والا مجھ پر مہربان ہے۔ بس میرے لیے دعا کرتے رہیے گا کہ میرا رب مجھ سے کبھی خفا نہ ہو اور مجھ سے میرا قلمدان نہ چھین لے۔ میرے تو سارے بھرم ہی اس کی وجہ سے بنے ہوئے ہیں۔"

"خلیل صاحب! یہ بتائیے کہ آپ کی اپنی سوچ اور تحریر کتنے فیصد اسکرین کا حصہ بنتی ہے؟"

"دو سو فیصد۔ ورنہ میں گولی مار دوں گا" میں ہمیشہ اعلانیہ کہہ دیتا ہوں جس آدمی نے میرے ڈرامے کے ساتھ ایک فیصد بھی کچھ کیا تو پھر میں دوبارہ اس کے لیے سیریل نہیں لکھتا۔ میرے سیریل کے لیے جب ڈائریکٹر شوٹنگ کے لیے آتا ہے تو آیت الکرسی پڑھ کر آتا ہے۔ میں خود ایڈیٹنگ ٹیبل پہ بیٹھتا ہوں۔ میں مختلف ڈائریکٹرز کے ساتھ زیادہ کام اسی لیے نہیں کرتا۔ مجھے پتا ہے میرا دوست ندیم بیگ میرے پیروں کی "مٹی" سے لے کر سر کے بالوں تک مجھے جانتا ہے۔ میں صاف کہتا ہوں۔ کسی نے خلیل الرحمٰن قمر کو دیکھنا ہو' وہ ندیم بیگ کو دیکھ لے۔ اس طرح ایک اور ڈائریکٹر میری زندگی میں آئے اور وہ سراج الحق ہیں جنہوں نے میرا "مینی آئی لو یو" کیا۔ تو جو میری تحریروں کو جسٹیفائی کرائے گا' وہ مائی کا لال ایک ہی سیریل کر پائے گا میرا اور جنہوں نے اس طرح کی حرکتیں کی ہیں۔ وہ آج

اسکرین پہ ہیں ہی نہیں۔ میں کوئی غنڈہ نہیں ہوں۔ میں تو اس کی دی ہوئی چیز کی حفاظت کرتا ہوں۔ میں ایک ہزار صفحات کا اسکرپٹ لکھتا ہوں۔ آپ سب مل جائیے اور ایک صفحہ بھی ایسا نکال دیں کہ جس پہ میں نے بے ایمانی کی ہو تو میں ذمہ دار ہوں۔ تو جب میں بے ایمانی نہیں کرتا تو مجھ پر لازم ہے کہ میں اس کی دی ہوئی چیز کی حفاظت کروں۔"

"آپ نے بتایا کہ کاسٹنگ میں بھی آپ کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کتنا؟"

"بہت۔ کیونکہ جو کاسٹ ڈر رہے ہوتے ہیں' ان کے لیے آپ کو مجھے قائل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ میں نہیں مانتا۔"

"حمزہ علی عباسی (پیارے افضل) آپ کا انتخاب ہے؟"

"حمزہ۔ میرا انتخاب نہیں ہے۔ حمزہ پر میں اڑ گیا تھا اور دو ماہ شوٹنگ رکی رہی تھی اور حمزہ کو میں نے کہا بھی کہ "تم میرا انتخاب" نہیں ہو لیکن تم فٹ آئے ہو۔ حمزہ' ندیم اور ہمایوں سعید کا انتخاب تھا اور اس کے لیے میری ان سے بڑی لڑائیاں بھی ہوئیں' بڑی گالیاں بھی کھائیں انہوں نے مجھ سے اور سلوٹ ہے انہیں کہ انہوں نے میری اتنی باتیں سنیں۔ آخر اس بات پہ اتفاق ہوا کہ ثالث بٹھا لیتے ہیں اس انتخاب کے لیے۔ میں نے کہا کہ ثالث کون ہوگا تو کہا کہ صبا پرویز۔ میں نے او کے کر دیا۔ صبا کو اسکرپٹ بھجوایا اور کہا کہ تمہیں اپنے فن کی قسم ہے کسی کی دوستی کو خاطر میں نہیں لانا اور خدا کو حاضر ناظر جان کر کہہ دینا کہ یہ انتخاب ٹھیک ہے یا نہیں۔ اصل میں میں نے یہ رول ہمایوں سعید کے لیے لکھا تھا اور میں اس پہ اڑا ہوا تھا۔ صبا نے اسکرپٹ پڑھا۔ دس اقساط پڑھنے کے بعد اس نے مجھے فون کیا اور کہا کہ خلیل صاحب میری بات کا غصہ تو نہیں کریں گے۔ میں نے کہا نہیں تو اس نے کہا کہ اس رول کے لیے حمزہ علی عباسی فٹ ہے اور میں نے فوراً "ہاں" کر دی۔ جبکہ مجھے اس وقت بھی

اتفاق نہیں تھا۔ لیکن اللہ نے اس کو عزت دینی تھی تو میں کیا کر سکتا تھا۔"

"آپ کا کوئی پلاٹ' کوئی تحریر' کوئی اسکرپٹ کبھی ریجیکٹ ہوا؟"

"اللہ اکبر۔ اللہ مجھے معاف کرے اور اللہ سے معافی مانگیے اپنے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔ ایسا کچھ نہیں ہوا اور پہلی بات تو یہ کہ اللہ کی مہربانیاں جو مجھ پر ہمیشہ سے ہیں کہ میرے پاس پورا اسکرپٹ کبھی ہوتا ہی نہیں تھا۔ نہ میں نے کبھی ون لائنر لکھا۔ میں ون لائنر اس وقت دیتا ہوں جب پہلے چل چکا ہوتا ہے۔ میرے پاس تو اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ میں اردو کرا لوں۔ میری اس بات میں اگر غرور ہے تو اللہ مجھے معاف کرے کہ میں نے زندگی میں کبھی اردو کی کتاب نہیں خریدی کبھی اور یہ بھی میں کہتا ہوں کہ جس دن میرے ڈرامے کو کوئی ایوارڈ کے لیے دے گا' میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔"

"اتنے نخرے آپ کے برداشت کر لیتے ہیں سب؟"

"کیوں نہیں کریں گے' میں نے کچھ کر کے دکھایا ہے۔ اللہ نے مجھ سے کروایا ہے۔ بلکہ کیا رہا ہے ثابت کرنا۔"

"بہت ہی گھسا پٹا سوال ہے کہ بچے سب ہی پیارے ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ بھی اپنے تمام سیریلز کو اچھا کہیں گے۔"

"میں اس بات کو نہیں مانتا کہ یہ بچے ہوتے ہیں۔ یہ تو اوپر والے کی مہربانیاں ہیں اور خدا کی دی ہوئی چیز کے لیے میں کوئی کمپیریزن (مقابلہ) نہیں کر سکتا۔"

"باتیں تو ابھی بھی بہت باقی ہیں۔ لیکن آپ کو جلدی ہے' تو میں چاہوں گی کہ آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟"

"میں لاہور میں پیدا ہوا 16 دسمبر 1965ء کو۔ مغل فیملی سے میرا تعلق ہے۔ کاسٹ میں مرزا لکھنے کا میں روادار نہیں ہوتا۔ جبکہ میرے ابا کو لوگ مرزا صاحب ہی کہتے تھے۔ مجھے یہ شناخت بہت بری لگتی ہے کہ کوئی مجھے "مرزا خلیل الرحمٰن قمر" لکھے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ملک پہلے ہی بہت سے فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔ پھر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کوئی ملک ہے۔ کوئی مرزا ہے' کوئی وڑائچ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اب ایک نئی بات دیکھنے میں آ رہی ہے۔ جس نے ہم سب کی زندگیوں میں بہت بڑی خرابی پیدا کر دی ہے کہ اب لوگوں نے گاڑیوں کے پیچھے لکھوانا شروع کر دیا ہے۔ گورنمنٹ کالج والوں نے "راوین" "پنجاب کالج والوں نے "پنجابین" نو سوری! میں ان کا حصہ نہیں بن سکتا۔ میرے پانچ بہن بھائی ہیں۔ تعلیم ایم بی اے اور پڑھائی میں ہمیشہ ٹاپ کیا۔"

"شادی۔؟"

"جب پی کام پارٹ ون میں تھا اور میں اس وقت انیس سال کا تھا۔ وہ مجھے پسند تھی۔ میرے ماموں کی بیٹی ہے وہ۔ میری پڑھائی کا دور تھا۔ اس نے بہت کو آپریٹ کیا میرے ساتھ۔ میرے پانچ بچے ہیں۔

تین بیٹیاں اور دو بیٹے۔ میرے ایک بیٹے کو اداکاری کا شوق ہے اور وہ میرے ڈراموں میں پرفارم کرچکا ہے۔ دراب خلیل نام ہے اس کا۔"

"مزاج کے کیسے ہیں؟"

"غصیلا... کیونکہ میرے قول و فعل میں تضاد نہیں ہے۔ میں ہمیشہ کھری بات کرتا ہوں۔"

"کبھی کامیڈی سیریل لکھا؟"

"نہیں کبھی نہیں۔ میرے ملک میں اتنے بھانڈ ہیں کہ مجھے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی مزاح لکھنے کی۔"

"ایک سوال ایسا ہے کہ کسی فنکار یا رائٹر سے پوچھو کہ آپ اس کام کے علاوہ کیا کام کرتے ہیں تو وہ چڑ جاتے ہیں۔ اگر میں آپ سے بھی یہی سوال پوچھوں تو؟"

"میں سوالوں سے چڑتا نہیں ہوں' بلکہ جواب دے دیتا ہوں۔ میں لکھنے کے علاوہ لکھنے کے لیے سوچتا ہوں۔"

"فنکار لوگ کہتے ہیں یہ ہوائی روزی ہے؟ تو کیا لکھنا بھی ہوائی روزی ہے؟"

"دنیا میں ہر کام ہوائی روزی ہے۔ اگر آپ گورنمنٹ جاب میں ہیں اور اگلے دن آپ کے ساتھ کوئی حادثہ ہو جائے تو پھر۔ میرا ایمان ہے کہ آپ اس وقت تک نوکری میں رہتے ہو اور اللہ اس وقت تک آپ کی مدد کرتا رہتا ہے' جب تک آپ دیانت داری کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ جہاں دیانت داری میں کمی آئی' آپ کی روزی ہوائی ہو جاتی ہے۔"

"کھانے پینے سے دلچسپی ہے؟"

"ہمیں تو بہت اچھا پکا بھی لیتا ہوں... جب میری شادی ہوئی تو جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں انیس سال کا تھا اور میری بیوی سولہ سال کی تھی۔ اسے کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ اس وقت میں نے اسے کھانا پکانا سکھایا تھا اور اس کے بعد وہ بہترین کھانا پکانے لگی۔"

"لکھنے کے لیے تنہائی چاہیے یا ہجوم میں بھی لکھ لیتے ہیں؟"

"ہونا تو یہ ٹھیک سنگھ اور لنڈا بازار اور شروع کے کچھ سیریلز میں نے ہجوم میں ہی بیٹھ کر لکھے ہیں' لیکن اب بھی میرا نہیں خیال کہ مجھے کوئی پریشانی ہوئی ہے یا ہوگی' کیونکہ جب اوپر والا دے رہا ہوتا ہے تو پھر مجھے لکھنے میں پریشانی نہیں ہوتی' پھر میں ہجوم میں بھی تنہا ہوتا ہوں۔"

"اب عادت بھی تو ہوگئی ہوگی؟"

"میں عادتوں کا غلام نہیں ہوں۔ عادتیں میری بدلتی رہتی ہیں۔"

"اچھی اور بری عادت بتائیں۔"

"جی میں چین اسموکر ہوں اور یہ میری سب سے گھٹیا عادت ہے۔ حالانکہ مجھے اس کے نقصانات بھی معلوم ہیں۔"

خلیل الرحمن قمر نے اس جواب کے ساتھ ہی اجازت چاہی اور ہمیں ان سے انٹرویو کر کے بہت اچھا لگا۔ شکریہ ان کا کہ اپنی مصروفیات سے ہمارے لیے انہوں نے ٹائم نکالا۔

عنیزہ سید

میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں۔" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا کہ یہ لڑکی تو ویسے ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اس ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی۔ "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

۳۰
تیسویں قسط

"میں شاید تمہیں جانتا ہوں' اگر پاکستان میں بہت سی لڑکیوں کا نام ماہ نور ہو تو بھی ایک ماہ نور کو میں ضرور جانتا ہوں۔" وودن زارے نے اپنے نام ماہ نور نامی لڑکی کا پیغام پڑھ کر جواب لکھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو' اس پاکستانی لڑکے کی تصویر دیکھ کر پاکستان میں موجود تمام ماہ نور نامی لڑکیوں میں سے کسی ایک ماہ نور نامی لڑکی نے ہی تم سے کیوں رابطہ کیا؟" لڑکی کا جواب آیا۔

"میں سعد سلطان کے حوالے سے ایک ماہ نور نامی لڑکی کو جانتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ ہم ایک دوسرے سے
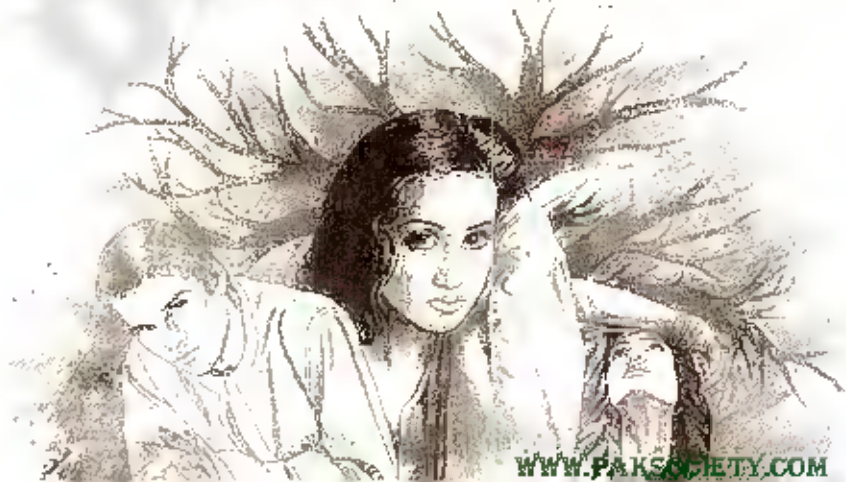
بالکل ناواقف ہونے کے باوجود دوست بن سکتے ہیں۔" وودن نے جواب لکھا اور لڑکی کی دوستی کی درخواست قبول کر لی۔

"تم سعد کو کیسے جانتے ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ ابھی کدھر ہے' کیا کر رہا ہے اور کس حال میں ہے؟" ماہ نور نے وودن زاوت سے سوال کیا۔

"میں سعد سلطان کو اتنا جانتا ہوں کہ اس کے سلسلے میں تمہاری بے چینی مجھے ٹھیک سمجھ میں آرہی ہے اور میں اس پر محظوظ بھی ہو رہا ہوں۔" وودن کے جواب نے ماہ نور کو چونکا دیا۔

"رہا یہ سوال کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کس حال میں ہے تو شاید میرا جواب سن کر تمہیں دکھ بھی ہوگا اور تم رونے بھی لگو گی (رونا اس لیے لکھ رہا ہوں کہ مشرقی خصوصاً" ایشیائی لڑکیوں کو سنا ہے رونے کا بہت شوق ہوتا ہے)" بریکٹ میں لکھے اس جملے کو آگے بھجوانے سے پہلے وودن کو اس پر ہنسی آرہی تھی۔

"نہیں مجھے مت بتانا۔ اگر وہ کسی ایسے حال میں ہے جسے جان کر میں رونے لگوں گی۔" ماہ نور نے فوراً" جواب دیا۔ "مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھنا۔" اس کا دل ہل گیا تھا۔

"کیسی مظلوم بات کی تم نے؟" وودن ہنسا۔ "لڑکیاں ہر جگہ ہی توہم پرست ہوتی ہیں خصوصاً" اپنی زندگی کے خصوصی مرد کے لیے۔"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ سعد میری زندگی کا خصوصی مرد ہے؟" ماہ نور چڑ گئی۔

"تمہارے اس کے بارے میں کیے گئے سوالات کے انداز نے' تمہاری بے چینی نے۔" وودن نے لکھا۔

"جی نہیں۔" ماہ نور بے نیاز بن گئی۔ "وہ صرف ایک دوست ہے۔"

"اچھا تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔" وودن نے لکھا۔ "ویسے اس نے کسی بھی عام دوست بالخصوص لڑکی کو اپنے بارے میں بتانے سے منع کر رکھا ہے۔ اس لیے میں معذرت خواہ ہوں میں تمہیں اس کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔"

"رکو! ایسی بھی بات نہیں ہے۔"

"مجھے نیند آرہی ہے کیونکہ یہاں آدھی رات گزر چکی ہے اور مجھے کام پر بھی جانا ہے صبح اٹھ کر۔" وودن نے لکھا اور سائن آؤٹ کر گیا۔

"اف!" ماہ نور کا دماغ گھوم گیا۔

"یہ کیا بات ہوئی!" اس کا دل مایوس ہونے لگا۔ "ہر بات ادھوری رہ جاتی ہے' تلاش کا ہر سرا نامکمل ہاتھ میں آتا ہے۔"

اس نے وودن زاوت کے ٹائم لائن کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ پھر اس کے دوستوں کی فہرست دیکھنے لگی اور اس فہرست میں اسے اپنی تلاش میں آگے بڑھنے کا ایک نیا نکتہ ہاتھ لگ گیا۔

☼ ☼ ☼

"نہیں!" بلال سلطان جو اس وسیع کمرے کے وسط میں کھڑے تھے بولے۔ "ماضی کے چند جھروکے ایسے ہیں جن کو میں بالکل بھی خوشگوار خیال نہیں کرتا لہٰذا میں ان پر بات نہیں کروں گا۔"

"کیسے نہیں کرو گے؟" کمرے کے مشرقی کونے سے ایک نسوانی مگر مضبوط آواز ابھری تھی۔ "ماضی کے بدنما' ناخوشگوار بھدے جھروکوں کے پیچھے ہی تو اصل کہانیاں چھپی ہیں' تم ان پر کیسے بات نہیں کرو گے۔"

"اوہو!" بلال ہنسے۔ "آج کی فلاسفی ظہور اور ماضی کی فلاسفی ظہور میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا سوائے بالوں میں

جھلکتی چاندی کے۔ تمہارا لہجہ ابھی بھی ویسا ہی تلخ ہے اور تمہاری پیشانی پر ابھی تک وہی خمن بل ہیں' حالانکہ ان میں مزید کا اضافہ ہو جانا چاہیے تھا۔"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ ہم سب کی ایک ہی جگہ موجودگی کو تم ہنسی میں اڑا سکتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔" فلزا نفریبا" غرائی تھی۔

"اچھا!" بلال نے زبردستی اپنی ہنسی روکی۔ "تو اب لوگ اپنے دانت تیز اور پنجے نکال کر یہاں پہنچے ہیں۔"

"دیکھیے بلال صاحب! بہتر ہوگا آپ تشریف رکھ کر بات کریں۔" چوہدری سروار نے بلال کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب!" بلال مسکرائے۔ "مجھے تو آپ کے فارم ہاؤس کی جادوئی کشش یہاں کھینچ لائی ہے۔ میں نے سوچا خود جا کر دیکھوں' یہ کیسا طلسم ہوش ربا ہے جس کے اندر داخل ہوتے ہی آئینوں میں اصل چہرے نظر آنے لگتے ہیں۔"

"دیکھیے ایسی کوئی بات نہیں ہے بلیز! آپ بیٹھ جائیے۔" چوہدری سروار نے ایک اور کوشش کی۔

"بات کچھ خاص ہے ضرور اس فارم ہاؤس میں۔" بلال نے چوہدری صاحب کی درخواست کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا "دیکھیے نا۔ اس ایک جگہ پر سراج سرفراز' رابعہ کلثوم اور فلزا ظہور سب جمع ہیں' کون ہے جو یہاں نہیں ہے۔ ایک اٹیک وہی ہے جسے تلاش کرنے میں میرے کتنے ہی ماہ و سال ضائع ہو گئے۔"

"دیکھیے بھائی صاحب!" چوہدری صاحب کا لہجہ مزید شیریں ہوا۔ "آپ کو بیٹھ کر تحمل سے بات کرلی چاہیے۔"

"رہنے دیجیے چوہدری صاحب!" اب کے کمرے میں سنائی دی جانے والی آواز رابعہ کلثوم کی تھی۔ "بلال سلطان صاحب صرف اپنے مطلب کے بندے ہیں' ان سے ان کے مطلب کی بات پوچھ لیجیے' ان کے اردگرد بسنے والے لوگ بھی انسان ہیں' یہ کہاں مانیں گے۔"

"اوہ!" بلال سلطان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔ "یہاں تو سب ہی پتنگوں کو پر لگ گئے ہیں۔ افسوس میں اتنا عرصہ ان کی پرواز کے نظاروں سے محروم رہا۔"

"پتنگوں کا لفظ تو تم نے شاید ہمارے مروت کے استعمال کر لیا۔" فلزا ظہور اپنی جگہ سے اٹھ کر بلال سلطان کے سامنے آکر کھڑی ہوئی۔ "کہنا تو تم چیونٹیاں ہی چاہتے تھے نا!"

بلال سلطان نے تمسخرانہ انداز سے فلزا کی طرف دیکھا اور پھر چوہدری صاحب سے مخاطب ہوگئے۔

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب! میں یہاں بیٹھ کر سب ہی کی سن لیتا ہوں۔" وہ چوہدری صاحب کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔ "سناؤ بی چیونٹی! کیا سنانا ہے۔" یہ بات انہوں نے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہی تھی' لیکن ان کے سامعین جانتے تھے کہ ان کی مخاطب فلزا ہی تھی۔

"جب میں سناؤں گی اور جو میں سناؤں گی' اسے سن کر تو تمہارے ہوش ہی اڑ جائیں گے بھگوڑے چوہے!" فلزا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "لیکن پہلے یہ بتاؤ تمہارا بڑا لڑکا کہاں ہے' وہ کیوں یہاں نہیں آیا جبکہ وہ تمہارے وقت بھی دے چکا تھا اور اس جگہ کا نام بھی۔"

"میرا بڑا لڑکا!" بلال ایک بار پھر ہنس دیے "بڑے' چھوٹے کی تفریق میں پڑنے کا تکلف تو تم نے خوامخواہ ہی کیا۔" انہوں نے سر جھٹکا "اور خوب!" انہوں نے فلزا کی طرف دیکھا۔ "تو یا وہ تم سے رابطے میں ہے' جبکہ میری نظروں سے تو کب کا اوجھل ہے۔ چوہدری صاحب!" پھر انہوں نے چوہدری سروار کی طرف دیکھا "عجیب

سا ہی اتفاق ہے 'میری اولاد کی گمشدگی میں ہمیشہ ان ہی خاتون کا ہاتھ نکل آتا ہے۔"

"یہ کیا چکر ہے بھائی صاحب؟" اس سے پہلے کہ قلزا کوئی کڑا جواب دیتی 'مولوی سراج کی سرسراتی آواز کمرے میں گونجی۔ "بیالڑکا 'چھوٹا لڑکا' بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"آپ چپکے بیٹھے رہیے مولوی صاحب!" رابعہ کلثوم نے مولوی صاحب کو گھورا۔ "ان صاحب کا کیا بھروسا؟" انہوں نے تیز نظروں سے بلال سلطان کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "معاملہ اور چکر کوئی بھی ہو 'یہ ہم پر کنوارے رہیں گے۔ یہ تو جب صاحب حیثیت نہیں تھے اس وقت بھی نگوڑے تھے 'اب تو خیر سے حیثیت کو بھی بھاگ لگے نظر آتے ہیں 'مشغلے اونچے اور شانیں بلند ہو گئی ہیں۔"

"ہوں!" بلال نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "پھر اب کیا کرو گی تم رابعہ بی بی؟"

"بھاگ جانا ہی بہتر ہے۔" رابعہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ایک بار آپ بڑے لوگوں کے کرتوتوں کا ان گناہ گار آنکھوں سے نظارہ کر لینے کا نتیجہ عمر بھر چوروں کی طرح گزارنے کی سزا بھگتنے میں لگ گیا۔ اب تو جو رہ گئی ہے وہ بہت کم ہے اور آپ صاحب لوگوں کے انداز حکمرانی سہنے کی ہمت بھی نہیں رہی۔"

"تمہیں رابعہ بی بی! ہم غلط سمجھے تھے۔ بھائی صاحب تو۔" مولوی سراج نے کہنا چاہا لیکن رابعہ کلثوم نے ان کی بات درمیان ہی میں کاٹ دی۔ "ارے چھوڑیے مولوی صاحب! آپ تو ہمیشہ ہی ان کے مرید اور وکیل رہے۔ ایسے مرعوب کہ عمر بھر یہ ہی کہتے گزر گئی 'جو بھی ہوا اس میں بھائی صاحب کا کوئی قصور نہیں۔ ارے اپنے سامنے سر کٹی لاش پڑے دیکھ کر بھی آپ کو یہ ہی لگتا رہا کہ بھائی صاحب بے چارے گنگا نہائے ہوئے ہیں۔ چھرے پکڑنا اس دنیا میں صرف طیفے لاڑوں کا کام ہے۔ بھائی صاحب کے تو مکھن لگانے کی چھری پکڑتے ہوئے بھی ہاتھ کانپتے ہیں۔ ہیں نا۔"

وہ طنزیہ انداز میں مولوی سراج سرفراز کی طرف دیکھنے لگیں۔ مولوی صاحب رابعہ بی بی کا اتنا سا ہی رعب دیکھ کر سہم گئے اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

"ارے واہ سراج سرفراز!" بلال سلطان یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کر مولوی صاحب کے قریب پہنچے۔ "معاف کرنا یار ہمیشہ تمہیں کوتاہ نظر ہی خیال کرتا رہا۔ آج معلوم ہوا اس ہجوم نسواں میں ایک تم ہی تو ہو جو مردم شناس ہو۔"

انہوں نے مولوی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھا کر اپنے برابر کھڑا کیا اور پھر گلے سے لگا لیا۔

"چوہدری صاحب!" پھر وہ چوہدری صاحب سے مخاطب ہوئے۔ "سراج کے والد کا تو پتہ کروائیے 'حواسوں میں آیا وہ لڑکا یا نہیں۔ سراج! تمہیں کیا سوجھی بھئی! اکل کے بالشت بھر لڑکے سے بیٹی بیاہ دی۔ کون ہے یہ لڑکا 'کہاں رہتا ہے 'کیا کرتا ہے 'آگا پیچھا دیکھ کر بیاہی لڑکی یا سر سے بوجھ کی طرح پھینک دی۔ دیکھنے میں تو بیچارہ یتیم ہی لگتا ہے۔ کسی مدرسے یا مکتب سے تو نہیں لے آئے تھے ساتھ۔ مدیحہ تو مولوی سراج سرفراز کا داماد گولیاں کھا کر خودکشی کرنے چلا تھا۔"

"نہیں بھائی صاحب! ہمارا تو بہت ہی پیارا لڑکا تھا۔" مولوی سراج نے بلال کے سوال پر چوہدری سردار کے منہ کے زاویے بگڑتے دیکھ کر کہا۔

"پیارا لڑکا!" بلال ہنسے۔ "کس کا ہے یہ پیارا لڑکا؟"

"تمہارا۔" مولوی سراج کے بجائے اس سوال کے جواب میں قلزا 'بلال سلطان کے روبرو آتے ہوئے غرائی تھی۔ "تمہارا لڑکا ہے ہماری بھگوڑے جوب!"

☼ ☼ ☼

سعد نے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا، جس کے چاندی جھلکاتے بال اس کے سر پر الٹا کر کنگھی کیے گئے تھے، اس ہیئر اسٹائل نے اس کی پیشانی کو کشادہ اور نمایاں بنا رکھا تھا اس کے چہرے کے خدوخال چھپے تھے۔ آنکھیں چھوٹی اور زیادہ نمبر کے شیشے جڑی عینک کے پیچھے چھپی تھیں۔ اس کی ٹھوڑی پر سفید اور سنہری بالوں کی چھوٹی سی داڑھی بھی تھی۔ اس نے سرمئی رنگ کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ کتابوں سے بھری دیوار گیر الماریوں سے سجے اس کمرے میں ایک بڑی سی دفتری میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔

"تمہاری یہ زندگی ایک معجزہ ہی تو ہے۔ اگر تم اس حادثے میں ختم ہو جاتے تو سننے اور دیکھنے والے اس موت کو ایک حادثہ ہی سمجھ کر یاد رکھتے۔ یہ تو تم زندہ بچ گئے تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ تم خودکشی کرنے چلے تھے۔ خدا کا شکر ادا کرو اس کو تمہارے لیے حرام موت منظور نہیں تھی۔" اس شخص نے چند منٹ پہلے اس سے کہا تھا۔

"نیت کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے پھر" اس نے اس شخص کا بغور جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "کیا میں نیت کے گناہ کا سزاوار نہیں ٹھہروں گا۔ اللہ کو تو حرام موت میرے لیے منظور نہیں تھی مگر وہ جو خودکشی کی نیت تھی اس کا کیا ہو گا۔"

"یہ ہی تو کہہ رہا ہوں اللہ نے تمہیں یہ زندگی عطا فرما کر نیت کے گناہ پر توبہ کا موقع عطا فرمایا ہے۔ اب تو یہ تم پر ہے کہ تم اس موقع کو توبہ کرنے میں گزارتے ہو یا پھر نئی نیتوں کی منصوبہ بندی میں۔"

"آپ کو یہ گمان کیسے ہوا کہ نئی نیتوں کی منصوبہ بندی بھی ہو سکتی ہے۔" سعد نے دفتری میز پر کہنیاں ٹکا کر ذرا سا آگے جھکتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ میں نے کئی ایسے لوگوں کی داستانیں پڑھ رکھی ہیں، جو خودکشی کی ایک کوشش ناکام رہ جانے کے بعد نئی کوشش کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور ہر نئی کوشش پہلے والی سے زیادہ خوف ناک اور ناقابل یقین ہوتی ہے۔"

"ایسا کون لوگ کرتے ہیں؟" سعد نے سوال کیا۔

"وہ جن کے راستے کھو نے ہو چکے ہوتے ہیں یا وہ جو اپنے راستے خود گم کر دیتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی ضد ہوتے ہیں جو طویل اور تاریک راستے کے آخر میں ایک فرضی شمع کی موجودگی کے گمان میں دانستہ مبتلا ہوتے ہیں اور اسی فرضی شمع تک پہنچنے کی آرزو لیے طویل اور تاریک راستہ طے کر لیتے ہیں۔"

"آپ نے منفی لوگوں کے بجائے مثبت لوگوں کی مثال دی ہے کیوں؟" سعد نے سوالیہ انداز میں ابرو چڑھایا۔

"اس لیے کہ میں خود زندگی کو مثبت نظر سے دیکھنے کا قائل ہوں۔" اس کے مخاطب نے اپنا چشمہ اتار کر اس کے شیشے نرم رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے مطابق میرے جیسے لوگ مثبت انداز فکر والے لوگوں کی ضد ہوتے ہیں۔"

وہ گہرا سانس لیتے ہوئے پیچھے ہٹا اور اپنی کرسی کی پشت سے کمر ٹکالی۔ جواب میں اس کے مخاطب نے اسے معنی خیز انداز میں دیکھتے اپنے شانے ہلکے سے اچکا دیے۔

"جانے دیں صاحب!" سعد نے اپنی آنکھوں پر دائیں ہاتھ کی انگلیوں کا دباؤ ڈالا۔ پھر اس نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر ان صاحب کی طرف دیکھا جن کا نام ڈاکٹر رضا حسین تھا اور جن سے ملوانے کے لیے بابر بطور خاص اس

رودزائے ان کے پاس لے کر آئی تھی۔ "آپ ملائشیا یا بجر غالبا" انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"میرا تعلق فلپائن سے ہے۔" ڈاکٹر رضا نے نرمی سے کہا۔

"کچھ ایسا ہی لگ بھی رہا ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔ "نادیہ نے شاید میرے بارے میں آپ کو تفصیل سے نہیں بتایا۔"

"نادیہ نے آپ کے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ آپ اس کے نصف برادر ہیں میرے لیے نادیہ کے حوالے سے آپ کا اتنا ہی تعارف کافی ہے۔"

"بہت خوب!" وہ مسکرایا "گویا اپنے بارے میں آپ کو مجھے خود ہی بتانا پڑے گا۔"

"میں غور سے سن رہا ہوں۔" ڈاکٹر رضا نے چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا۔

"کچھ عرصہ پہلے تک میں بھی طویل اور تاریک شاہراہ کے آخر میں جلتی فرضی شمع کے تصور میں غرق ہو کر راستہ عبور کر جانے والوں کی فہرست میں شامل تھا یا شاید یوں سمجھئے کہ میں ایسے لوگوں کی ایک قطار کا رہبر خیال کیا جاتا تھا۔"

"زبردست!" ڈاکٹر رضا نے کہا۔ "پھر؟"

"پھر یوں ہوا کہ میرے خود ساختہ مثبت انداز فکر کو حقیقت کے زہر کا پیالا پلا دیا گیا۔"

"ذرا رکیے۔" ڈاکٹر رضا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ "حقیقت کے زہر کا پیالا آپ کو زبردستی پلایا گیا یا آپ نے خود پیا؟"

"نہ تو کسی نے زبردستی پلایا نہ ہی میں نے اپنی مرضی سے پیا بلکہ یوں سمجھئے مجھے پینا پڑا کیونکہ حقیقتیں ایک کے بعد ایک میرے سامنے آتی چلی گئیں۔"

"اور آپ کے اعصاب بس اتنے ہی مضبوط تھے کہ جب تک حقیقت سے لاعلم تھے اپنی جگہ قائم رہے اور جب حقائق سامنے آگئے تو اعصاب ساتھ چھوڑ گئے اور آپ نے فیصلہ کر لیا کہ زندگی ہی سے منہ موڑ لیا جائے۔" ڈاکٹر رضا زیر لب مسکرا رہے تھے۔

"آپ مجھے بہت ہی بودا سمجھنے لگے غالبا" سعد نے تحمل سے جواب دیا "میرے اعصاب اتنے مضبوط تو تھے کہ میں حقیقتوں سے روشناس ہونے خود ان کی کھوج میں نکلا تھا۔"

"پھر ان کا سامنا کرنے کا یارا کیوں نہیں رہا؟"

"سامنا بھی کر لیا اور سمجھ بھی گیا۔" سعد نے سر ہلایا۔ "لیکن کچھ حقیقتیں انسان کے اپنے وجود پر سوالیہ نشان لگا دیتی ہیں اور جب ایسا ہوتا ہے تو جی نظریں چرانے کو چاہنے لگتا ہے مگر نظر چرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ایسے میں جی چاہتا ہے بس زندگی سے ہی منہ موڑ لیا جائے۔"

"ہوں!" ڈاکٹر رضا اب کے سنجیدہ نظر آئے۔ "گویا زندگی سے منہ موڑ لینے کا فیصلہ کر لینے کے بعد آپ نے ایک لمبی منصوبہ بندی کی۔ کسی الگ سے ناواقفیت کے ادارے آپ سکی ڈائیونگ کے لیے ساز و سامان اٹھائے وہر ڈیل پہنچ گئے اور وہاں آپ نامناسب وقت اور روشنی کا انتخاب کر کے سب سے بلند مقام پر پہنچے۔ موت سے نظریں ملاتے ہوئے ایک لمبی چھلانگ ماری اور اپنے تئیں مر گئے۔ ایک ایسی موت جو بظاہر حادثہ معلوم ہو تاکہ آپ کے لواحقین کو یہ ملال نہ رہے کہ آپ حرام موت مرے۔"

"میرے لواحقین!" سعد بے اختیار ہنس دیا۔ "مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی ڈاکٹر صاحب کہ کسی کو میری زندگی یا موت کا ملال ہو گا میرے کھاتے میں لواحقین کی فہرست تو کبھی تھی ہی نہیں۔"

"نادیہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

''نادیہ!'' سعد نے گہرا سانس لیا ''نادیہ کو میرے حادثے کی اطلاع دی جائے گی' یہ میرے وہم میں بھی نہیں تھا۔ میرا امریکی دوست میری توقع سے زیادہ سمجھ دار نکلا۔''

''گویا آپ ایک گمنام سیاح' ایک گمنام سکی ڈائیور کی قبر میں اترنے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔''

''یقیناً!'' بھی بار وہ ڈاکٹر رضا کے قیاس سے متفق ہوا۔

''اور پھر تو آپ کو اپنا منصوبہ ناکام ہو جانے پر بہت افسوس ہوا ہوگا۔''

''منصوبہ ناکام ہو جانے پر افسوس ضرور ہوتا اگر میں اس حادثے میں زندہ بھی بچ جاتا اور معذور بھی ہو جاتا۔'' اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''معذوری سے ڈرتے ہیں؟'' ڈاکٹر رضا نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' اس نے سر ہلایا ''معذوروں کے لیے دوسروں کے رویوں سے ڈرتا ہوں' کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر میں معذور ہو جاتا تو اپنے لیے کوئی دوسرا میں خود نہ ہوتا۔''

''میں آپ کی یہ بات سمجھ نہیں پایا۔'' ڈاکٹر رضا نے کہا۔

''اچھا ہے نہ ہی سمجھیں۔'' وہ بے دلی سے بولا ''بات آپ کے سمجھنے کی ہے بھی نہیں۔''

''چلیں ٹھیک ہے نہیں سمجھتے۔'' ڈاکٹر رضا نے کہا ''یہ بتائیے اب کیا ارادہ ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے شانے اچکائے ''میں فی الحال بے ارادہ ہوں۔''

''آپ نے نادیہ کو یوں کہا۔ اس کی زندگی کیسا مثبت موڑ اختیار کر گئی۔''

''ہو سکتا ہے۔'' وہ بے نیازی سے بولا ''مثبت اور منفی کے ہر انسان کے پاس اپنے پیمانے ہوتے ہیں۔''

''گویا آپ کے پیمانے' عام انسانوں کے پیمانوں سے مختلف ہیں۔ برائی اور اچھائی' سچ اور جھوٹ' مثبت اور منفی کے پیمانے۔''

''آپ گفتگو کو رفتہ رفتہ جس سمت موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں میں اسے سمجھ رہا ہوں۔'' سعد نے ڈاکٹر رضا کی طرف دیکھا۔ ''اس سوال کے بعد آپ ایمان' یقین اور اعتقاد کی طرف جائیں گے' پھر میرے کسی دین کی تقلید کرنے والا دین ہونے پر سوال کریں گے اور پھر اس سے اگلا قدم کوئی نصیحت ہوگی' وعظ ہوگا یا پھر تنقید؟''

ڈاکٹر رضا نے جواب دینے کے بجائے سعد کی طرف دیکھتے دیکھتے آنکھیں جھپکائیں۔

''چھوڑیے ڈاکٹر صاحب!'' وہ محظوظ ہوتے ہوئے سر جھٹک کر بولا ''نادیہ کو میرے بارے میں شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں گمان اور بدگمانی کے درمیان ہچکولے کھا رہا ہوں۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں غلط فہمی اور ناسمجھی کا شکار ہو چکا ہوں۔ اسی لیے وہ اپنے تئیں میری عقل اور شعور کے ابہام دور کرنے اور ان کی گرہیں کھولنے کے لیے مجھے آپ کے پاس لے کر آئی ہے۔'' اس نے ایک بار پھر سر جھٹکا۔

''مجھے آپ کی قابلیت اور علم پر کوئی شک نہیں۔ آپ کی ذہنی استعداد اور راہنمائی بھی یقیناً قابل رشک ہوں گی۔ لیکن میری بھولی بہن نہیں جانتی کہ میں حقیقت سے آگاہی کے اس سفر میں کیسے کیسے راہ عبور کر کے یہاں پہنچا ہوں۔ کوئی سل پر بیٹھی چھتی' کوئی نور فاطمہ کی جھونپڑی' کوئی شربت کا پیالہ' کوئی سائیں اختر کی تنبیہ میرے بڑھتے قدم نہیں روک سکی۔ اسے کیا معلوم کہ گمان اور یقین کے اس سفر میں کیسی کیسی رکاوٹوں نے میرا راستہ روکا تھا' لیکن حقیقت کی روشنی اتنی طاقت ور تھی کہ میرا راستہ تاریک ہوا نہ طویل' نہ ہی مجھے فیصلے کی سرحد پر پہنچنے میں کوئی مشکل پیش آئی آپ کو۔'' اس نے دائیں بائیں نظر ڈالتے ہوئے کہا ''خواہ مخواہ ہی زحمت دی میری اس محبت بھرے دل والی بہن نے۔''

''آپ نے کبھی پڑھا یا سنا ہے کہ سائنس کے کسی قانون کو قانون بننے سے پہلے کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑتا

ہے۔" ڈاکٹر رضا نے اس کی بات کا جواب دینے کے بعد ایک غیر متوقع سوال کیا۔ سعد نے انہیں حیرت سے دیکھا۔

"آپ سے پہلے کسی چیز کے بارے میں کسی سائنس دان کے ذہن میں کوئی سوال اٹھتا ہے۔" ڈاکٹر رضا نے انگلی پر گنتے ہوئے کہا۔

"پھر وہ اس سوال پر تحقیق کرتا ہے۔" انہوں نے بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی کی پور پر دائیں ہاتھ کی انگلی رکھی۔

"پھر اس کے چند ساتھی اس کے ساتھ اسی تحقیق پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

پھر خیالات کے اس مجموعے پر تجربہ گاہوں میں تجربے کیے جاتے ہیں۔

پھر تجربات کی بنیاد پر اس سوال کے جواب کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس کی تشریح کی جاتی ہے۔

پھر ایک سے زیادہ سائنس دانوں کا تجزیہ ایک سا نکلنے لگے تو پھر اس کو ایک نظریہ قرار دیا جاتا ہے۔ نظریے پر تحقیقاتی مقالے لکھے جاتے ہیں اور اگر تمام لوگوں کی تحقیق اس سوال کے جواب کی تائید کر لی ہو تو آخر کار اسے سائنس کا ایک قانون بنا دیا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر رضا سات انگلیوں کی پوریں گننے کے بعد سانس لینے کو رکے۔

"لیکن آپ کا سلسلہ تو بالکل ہی مختلف ہے' آپ کے ذہن کے سوال نے اپنے ہی اندر سے اٹھنے والے جواب کو قانون قرار دے دیا۔" "مجھے نجانے ایسا کیوں لگ رہا ہے۔"

سعد حسب عادت اپنا نچلا ہونٹ دانت تلے دبائے ڈاکٹر رضا کی بات سن رہا تھا۔

"اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ عام انسان کے ذہن میں اٹھنے والے سوال کا جواب کس مرحلے پر جا کر قانون بننا چاہیے۔" ڈاکٹر رضا نے اس سے سوال کیا۔

"جی ضرور بتایئے۔" اس نے خود کو کہتے سنا اور یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں نرمی تھی اور اس کا انداز مؤدبانہ سا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمہاری نے جنون کے انداز میں دائیں بائیں سر پٹخا۔ اسے اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں عجیب سی اینٹھن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چارپائی سے بمشکل ذرا سا سر اٹھا کر سامنے دیکھنے کی کوشش کی۔ سعدیہ اداس' معصوم' پریشان حال اس کی پائنتی بیٹھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ کمہاری کی ٹانگ پر دھرا تھا' جسے وہ ہولے ہولے دبا رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں اپنے دوپٹے کا پلو تھامے وہ آنکھ سے آنسو خشک کرنے میں مصروف تھی۔

"اوئے کمہار والئے پتر!" اسے قریب سے ماسٹر کمال کی آواز سنائی دی" ذرا ڈھنگ سے ہوش تو کر لے پہلے۔"

"مم' ماسٹر جی!" ماسٹر کمال پر نظر پڑتے ہی کمہاری کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی "میں مر چلا جے میں کنک (گندم) میں رکھنے والی گولیاں کھائی ہیں۔"

ماسٹر کمال ہنس دیا۔ "اوئے! تو تو گولیوں کی دہشت سے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ کھائی تو نے خاک تھیں؟"

"نہیں ماسٹر جی!" کمہاری نے پہلے کی طرح جنون میں دائیں بائیں سر پٹخا "تہاڈا نئیں پتا میں نے گولیاں کھائی ہیں اور میرا آخیر وقت آن پہنچا ہے۔ سعدیہ باؤ!" اس نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھا کر سعدیہ کی طرف دیکھا "بھین جی اور مولی صیب کو بلا لینا تھا' اپنے ہاتھ سے مینوں رخصت کرتے۔" پھر اس نے ماسٹر جی کو مخاطب کیا۔

"ماسٹر جی! میری قبر بابے منگو کے دربار کے صحن میں بنانا' وہاں ہر ویلے لوک آوندے رہندے ہیں۔ سارے دن میں ایک یا دو اللہ کے بندے تو میری قبر پر فاتحہ پڑھیں گے ہی نا۔ میری قبر پر کتبہ لکھوایئے گا جس پر

لکھا ہو گا یہاں وہ بے چارا دفن ہے۔ جس کا کوئی نام نشان نہیں۔ ایسی قبروں کی لوگ خوب پروا کرتے ہیں۔ سائیں لوگ سمجھ کر ہار اور پھول بھی چڑھاتے ہیں اور دیے بھی جلاتے ہیں۔" وہ بولتے بولتے ہانپنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

"اوئے جا اوئے جھلیا!" ماسٹر کمال نے اسے زور سے ڈپٹا "جو لوگ مرنے والے ہوتے ہیں جنہوں نے زہریلی گولیاں کھائی ہوتی ہیں، ان کو اتنی لمبی چوڑی وصیتیں کرنے کی مہلت ملتی ہے جھلا۔ اب بس کر یہ ڈراما اور اٹھ کر بیٹھ جا۔ تجھے تو بڑی خیراں ہیں۔ اٹھ سارے لوگوں میں نہ خود کو تماشا بنا نہ ہی سعدیہ پتی کو۔"

"اوئے نہیں مخول نہ سمجھو ماسٹر جی! میں میدے پنساری کی دکان سے گولیاں لے آیا اور میں نے وہ گولیاں کھائی تھیں۔" کماری بلند آواز میں بولا۔

"بنا اس جھلے کو سعدیہ پتر! بتا اسے۔" ماسٹر کمال نے سعدیہ کو مدد کے لیے پکارا "یہ جھلا تو گولیوں کی شکل دیکھ کر ہی کملا ہو گیا تھا۔ مرنا اتنا آسان ہوتا تو لوگ روز گولیاں کھا کھا کر مرنا یا کرتے۔"

"کماری!" اب کے سعدیہ کماری کی پائنتی سے اٹھ کر سرہانے بیٹھ گئی "نہیں وہم ہے کہ تم نے گولیاں کھائی تھیں گولیاں تو یہ دیکھو میرے ہاتھ میں ہیں۔" اس نے اپنی بند مٹھی کھولی۔ کماری نے پھٹی پھٹی نظروں سے سعدیہ کی ہتھیلی پر رکھی گولیوں کی پڑیا دیکھی اور جنونیوں کی طرح ان پر جھپٹا سعدیہ نے فوری طور پر اپنا ہاتھ بند کر کے پیچھے کر لیا۔

"اے یہ گولیاں مینوں دے دو سعدیہ باجی! میں جیونا نہیں چاہندا۔" وہ چلایا۔

"اگر تم اپنے یہ ڈرامے بند نہیں کرو گے کماری! تو یہ گولیاں میں کھالوں گی ابھی اور اسی وقت۔" سعدیہ نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔ کماری نے بے یقینی سے سعدیہ کی طرف دیکھا اور ہارے ہوئے انداز میں کہنیوں پر تھوڑا اونچا ہوا۔

"نجانے کس کس نے اس ہنگامے میں تمہارا تماشا دیکھا ہے۔" سعدیہ نے غصے سے کہا۔

"چوہدری صاحب کے ساتھ اتنے معزز مہمان بھی تمہارا واویلا سن کر تمہاری طرف دوڑے چلے آئے۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ لوگ ہمارے بارے میں ہم اتنے بے وقوف اور لاچار ہیں کہ بغیر وجہ کے موت کو گلے لگانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ چوہدری صاحب کے سامنے میری نظریں شرم کے مارے اٹھ نہیں رہی تھیں۔ کتنی سبکی ہوئی ہو گی ان کی سب کے سامنے۔"

"وہ تو بھلا ہو چوہدری صاحب کا!" ماسی رشیدہ نے کہا۔ "جو سب کو فوراً اکٹھا کر کے مہمان خانے لے گئے نہیں تو ساروں نے دیکھنا تھا اس جھلے نے ہوش میں آ کر جو جو تماشے کیے ہیں۔"

"چیونٹی تو تجھ سے ماری نہیں جاتی۔ دودھ دوہنے جاتا ہے تو بھینسوں کی ٹکریں آرام سے کھا لیتا ہے۔ انہیں شکار تک نہیں سکتا، چلا تھا گولیاں کھا کر مرنے۔"

ماسٹر کمال نے کماری کے بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اوئے یوں مرنا تو بزدلوں کا کام ہے، کمزوروں کا کام ہے۔ تو تو بہادر ہے، بڑے سوہنے دل والا بندہ ہے تو کیوں بے وقت ہی مرنے چلا تھا۔"

کماری لمبے لمبے سانس لیتا سب کی سن رہا تھا۔ نظریں جھکا کر وہ سب کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بات اس کی سمجھ میں آنے بھی لگی تھی۔ وہ مرا تھا نہ ہی مرنے والا تھا۔ اس کی زندگی نے نہ صرف اس کی ممکنہ موت سے دست پنجہ کر لیا تھا بلکہ اسے پچھاڑ بھی دیا تھا۔ زندگی ابھی اپنی تمام تر حقیقتوں اور تلخیوں کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔ اب کیا اس کو نئے سرے سے زندگی کی ان حقیقتوں سے نظریں چرا ہوں گی جن کو نہ کوئی تسلیم کرتا

تھا نہ ہی وہ اس کے دل سے نکلی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"تم نے کبھی تفصیل سے سعد سے بات کی۔ اس کے اگلی زندگی کے بارے میں کیا منصوبے ہیں؟" وودان زاوے نے نادیہ سے پوچھا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ ابھی اس کا ذہن کوئی اگلا منصوبہ بنانے کے قابل ہے۔ اس کی باتوں میں اور اس کی سوچ میں ایک عجیب سا خلا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی گومگو کی کیفیت میں ہو جیسے اس کے اندر ایک انجانی سی کشمکش چل رہی ہو۔" نادیہ نے کہا۔ "وہ کیا سوچتا ہے۔ وہ کس الجھن میں ہے یہ تو میں نہیں جان پائی لیکن جو اندازہ مجھے اس کے بارے میں ہو سکا ہے اس کے مطابق وہ ایک عجیب دکھ کی کیفیت میں ہے جیسے کسی بھی غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرتے ہوئے کبھی ہم اس بے یقینی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کیا یہ سب ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہم نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ بھی یوں بھی ہو جائے گا۔"

"کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ اس ساری صورت حال کا ذمہ دار وہ خود ہے۔" وودان زاوے نے کہا۔

"کسی حد تک۔" نادیہ نے جواب دیا "لیکن اس کے ساتھ یہ سب ہو جانے میں بڑا قصور ناہموار حالات کا بھی ہے۔ میں بہت حد تک اس کی اس صورت حال میں ڈیڈ کو قصوروار سمجھتی ہوں یہ اور بات ہے کہ اس کا اعتراف میں نے اس کے سامنے کبھی نہیں کیا۔"

"ہوں!" وودان زاوے جیسے کچھ سوچتا ہوا بولا "تمہارا کیا خیال ہے اس کے یوں ہو جانے میں اپنے باپ کی غیر متوقع شخصیت سے اچانک سامنا ہو جانے کے علاوہ کوئی اور وجہ بھی شامل ہے۔"

"یقینی طور پر۔" نادیہ نے سر ہلایا۔ "وہ اس غیر متوقع سامنے سے ایسا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے ان حقیقتوں سے راہ فرار اختیار کر لی اور ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنی محبت کو اپنے دل کے حساس ترین معاملات کو بھی ہاتھ سے گنوا دیا۔ اور میں اس کو اس میں بھی غلط قرار نہیں دوں گی۔ دل برداشتہ ہونے کا عمل بعض اوقات اتنی شدت سے ہم پر حملہ کرتا ہے کہ دل ہر چیز سے اچاٹ ہو جاتا ہے ہم اپنی سوچوں صورت حال سے فرار حاصل کرنے کی خاطر نہ ہی اپنے نفع کو یاد رکھتے ہیں نہ ہی نقصان کو ایسا ہی سعد کے ساتھ بھی ہوا۔" نادیہ کے لہجے میں دکھ تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں یا تم یا ہماری مشترکہ کوششیں اس کو اس صورت حال سے باہر نکال سکتی ہیں؟"

"پتا نہیں۔" نادیہ نے سر ہلایا "میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی وہ مسلسل غصے اور غم کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ اس کیفیت کے اندر کچھ پچھتاوے بھی شامل ہیں۔"

"پچھتاوے!" وودان چونکا "کیسے پچھتاوے؟"

"سارو خان کو بیچ منجدھار میں چھوڑ آنے کا پچھتاوا 'قلزا ظہور کے حوالے سے ادھوری معلومات کی گرہیں لے کر آنے کا پچھتاوا' اپنے کسی نصف برادر کی موجودہ صورت حال کا پچھتاوا اور سب سے بڑھ کر ماہ نور کو بغیر کچھ بتائے کچھ سمجھائے یہاں چلے آنے کا پچھتاوا۔۔۔۔ اب تم ہی بتاؤ جن مختلف کیفیتوں میں وہ مبتلا ہے ان سے اسے نکالنا کیا ہمارے لیے میرے لیے تمہارے لیے ممکن ہے۔"

"پھر؟" وودان نے سوال کیا۔

"فی الحال تو میں نے اسے ڈاکٹر رضا حسین کے پاس لے جانا شروع کیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کے سب مسائل کی بنیادی وجہ یقین کی کمی ہے۔ ایک پر یقین انسان کسی بھی صورت حال کا سامنا ہو جانے پر یوں ڈگمگاتا نہیں جیسے وہ ڈگمگا گیا۔"

"کیا ڈاکٹر رضا کے پاس جانے سے اسے کچھ فرق پڑا؟"

"پتا نہیں۔" تادیب نے شانے اچکائے۔ "ابھی زروان سے سوال کرتا ہے' بحث کرتا ہے' کبھی کبھی ان سے الجھ بھی جاتا ہے۔ لیکن وہ تجربہ کار انسان ہیں' نا سمجھے پرفی لائے بغیر اس کی تحلیل نفسی میں مگن رہتے ہیں' مجھے اس کے مسئلے کا یہی ایک مثبت حل نظر آیا تھا۔ دیکھو شاید میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"تم نے بہت اچھا کیا۔" زروان نے ستائشی انداز میں کہا "لیکن میرے پاس ایک اور تجویز بھی ہے۔ کہو تو بتاؤں۔"

"ضرور۔" تادیب نے تجسس سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو پھر غور سے سنو!" زروان اسے اپنی تجویز کی تفصیل سنانے لگا۔ وہ غور سے سن رہی تھی اور سنتے ہوئے اس کی آنکھوں کی چمک بھی بڑھ رہی تھی یوں جیسے زروان کی تجویز اسے اچھی لگ رہی ہو۔ ڈیڑھ گھنٹے کی اس ایک بات گفتگو کے بعد تادیب سعد کے بارے میں پہلے سے زیادہ مطمئن نظر آنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں مشکور ہوں گی اگر تم مجھے سعد کا پتا دے دو۔" ماہ نور نے زروان زادے کے نام تیسرا پیغام لکھا تھا۔ "میں نے اس کے بارے میں تمہاری بات تفصیل سے پڑھی ہے' مجھے اس میں عجیب سا مجہول نظر آتا ہے' سعد کو سکی آئل میں کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ کیوں سکی ڈائیور بننے کی کوشش کرے گا۔"

"اگر تم سعد کو جانتی ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ کتنا غیر یقینی شخص ہے' اس کے بارے میں کوئی بھی قیافہ لگانا مشکل ہے یا نہیں' بتاؤ!"

اگلی رات اسے زروان کا جواب ملا۔ ساتھ ہی اس کی ڈائیونگ گیئر میں ملبوس سعد کی تصویر بھی۔ ماہ نور نے اس تصویر میں سعد کو عرصے بعد دیکھا تھا۔ وہ مکمل سکی ڈائیور کیمرے کی آنکھ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ماہ نور نے اس تصویر کو چھوٹا' بڑا کر کے بار بار دیکھا تھا۔ کیا یہ بڑی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔ کیا وہ چہرہ اتنا ہی جان دار تھا جیسا پہلے ہوا کرتا تھا اور اس کے دل نے ہر بار اپنی ایک دھڑکن روک دی تھی۔ اس چہرے پر عجیب سی اجنبیت نظر آ رہی تھی۔ ایک ایسا تاثر جس سے وہ بالکل بھی واقف نہیں تھی۔

"ہاں وہ غیر یقینی ہے۔" کتنے ہی لمحوں کی تاخیر کے بعد اس نے جواب ٹائپ کیا۔

"Totally unpredictable" اس کے لکھے الفاظ تھے۔

"جو شخص بندر کا تماشا دکھانے والے کا روپ دھار سکتا ہے' مجلے میں گیت گانا سائیں بن سکتا ہے' کمہار بن کر مٹی کے برتن بنا سکتا ہے' لوک میلے میں علاقائی گیت سنا تا جدید گلوکار بن سکتا ہے۔ اس کے لیے بغیر دلچسپی کے سکی ڈائیور بننا کون سا مشکل ہوگا۔"

"اب تم سمجھی ہو۔" زروان نے مزاحیہ شکل کے ساتھ جواب بھیجا۔

"کیا وہ تمہارے ساتھ ہے' امریکا میں؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"نہیں۔" زروان نے سادہ جواب بھیجا۔

"پھر؟"

"کیا تم اسے کھوجنا چاہتی ہو' کیا تم اسے ملنا' اسے پانا چاہتی ہو؟" زروان نے پوچھا۔

"ہاں!" ماہ نور کے جواب کے اندر اس کی خواری کی تھکن اور جذبات کی پوری شدت چھپی ہوئی تھی۔

"کیا تم یہ بات یقین کے ساتھ کہہ رہی ہو؟"

"پورے یقین کے ساتھ۔"

"پھر میرے پیغام کو غور سے پڑھو۔" زوون نے لکھا اور کچھ دیر بعد ایک تفصیلی پیغام ماہ نور کی نظروں کے سامنے تھا۔ جسے پڑھنے کے بعد اس کی آنکھوں کو خود پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں مکمل سناٹا چھا گیا تھا۔ بلال سلطان بے یقینی سے فلزا ظہور کو دیکھ رہے تھے۔ فلزا ظہور دونوں بازو سامنے باندھے پورے اعتماد کے ساتھ بلال سلطان کے سامنے کھڑی تھی۔ رابعہ کلثوم اور مولوی سراج سر فرزم بخود بیٹھے تھے۔ یوں جیسے پردے پر چلنے والی کسی فلم کے وقفے کے دوران اس کے اگلے تحول سے بھرپور منظر کے انتظار میں سانس روکے بیٹھے ہوں۔ اس پورے منظر میں صرف چوہدری سردار ایک ایسا کردار تھے جو پوری طرح پرسکون تھے اور اسی سکون سے بیٹھے اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے میں مصروف تھے۔

"اس وقت تو تم مجھے چونکانے کے لیے کوئی بھی بات کر سکتی ہو۔" بلال سلطان نے اس طویل سکتے سے نکلتے ہوئے فلزا ظہور کو مخاطب کیا اور مڑ کر چوہدری سردار کی طرف دیکھنے لگے۔

"چوہدری صاحب! یہ بھی غالباً" آپ کے فارم ہاؤس کا ہی کمال ہے۔ شاید یہاں کسی کو بھی کسی کا بیٹا بنا دینا اور کسی کو کسی کا بھی باپ بنا دینا بھی ایک اعلیٰ قسم کا مذاق سمجھا جاتا ہے۔"

"یہ فارم ہاؤس ہے بلال صاحب! یہاں مذاق کا کیا کام۔" چوہدری صاحب اسی پُرسکون انداز میں بولے "یہاں تو کام کا کام ہوتا ہے۔"

بلال نے چوہدری صاحب کے جواب پر توصیفی نظروں سے انھیں دیکھا جیسے انھیں یہ جواب پسند آیا تھا۔

"رہی فلزا صاحب کی بات تو معاف کیجئے گا! یہ آپ کے سوال کا جواب تھا۔ مذاق نہیں۔" چوہدری صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ ہی تو مولوی صاحب سے پوچھ رہے تھے کہ کھاری کس کا بیٹا ہے۔"

"ہاں تو؟" بلال نے سر ہلایا۔ "اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ جو بولے اس کو اس بے چارے لڑکے کا باپ بنا دیا جائے۔ میں نے تو یہ سوال صرف اس لیے کیا کہ سراج بے چارہ سادہ لوح آدمی ہے۔ راستہ بھر مجھے بتا رہا اس نے کیسے کیسے اپنی بیٹی کو چند جماعتیں پڑھا رکھی ہیں۔ اب اس کا یہ داماد دیکھ کر جو الف 'ب بھی پڑھا نہیں لگتا مجھے خیال آیا کہ کہیں داماد کے سلسلے میں اس کو کوئی دھوکا نہ ہو گیا ہو۔"

"دھوکا ہی تو ہو گیا ہے بے چارے کے ساتھ۔" فلزا نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "بے چارہ بیٹی کا رشتہ طے کرتے ہوئے سوچ بھی نہیں سکتا ہو گا کہ کسی خونی لٹیرے کے بیٹے کو رشتہ دے رہا ہے۔"

تایا رابعہ نے فلزا کی بات سنی اور زور سے آنکھیں بند کر کے اپنے گھومتے سر کو قابو کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"دیکھ لیں چوہدری صاحب! ایک الزام اور لگا۔" بلال نے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ "خونی لٹیرا!"

"آپ اگر خود پر چھایا تشنج کا مزاج دور کر لیں تو شاید کوئی بات آپ کی سمجھ میں بھی آسکے اور ہمارے بھی۔" چوہدری صاحب نے اب کے سنجیدگی کے ساتھ کہا "میں تو خود بھی نہیں جانتا کہ فلزا بی بی کا آخر آپ کے ساتھ کیا بیر رہا ہے جو وہ آپ کو دیکھ دیکھ کر تلملا رہی ہیں۔"

"ان کے ساتھ بیر۔۔۔" بلال نے طنزیہ نظروں سے فلزا کی طرف دیکھا "ان کی طرف تو ایک لمبا چوڑا حساب نکلتا ہے میرا 'لیکن دیکھ لیں۔" انہوں نے اپنے بازو دائیں بائیں پھیلائے "میں پھر بھی پُرسکون ہوں تحمل سے بات کر رہا ہوں۔"

"ونیاں بھریوں تو نہیں۔ آج ہی تو موقع بنا ہے' اسی چھت کے نیچے سارے حساب کتاب پورے کر لیجئے آپ لوگ۔" چوہدری صاحب نے کہا اور پھر مولوی سراج کی طرف دیکھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا مولوی صاحب! آپ بھی ان سے جڑی کسی داستان کا حصہ رہے ہیں اور اگر رہے ہیں تو دیکھیے قدرت نے اس درمیانی وقت میں بھی آپ کو ان سے جوڑنے کا کیا انتظام فرمایا۔ کھاری اور سعدیہ کی شادی آپ کے جانے اور بلال صاحب کے انجانے میں ہو گئی مگر کیا رشتہ قائم ہو گیا آپ دونوں کے درمیان سبحان اللہ بھئی سبحان اللہ۔"

"لیکن اب آپ بھی پہیلیاں بجھوانے لگے چوہدری صاحب!" بلال سلطان اب کے چونک گئے "سراج کی بیٹی کی شادی سے میرے انجان پن کا کیا تعلق ہے بھئی۔"

"بہت گہرا تعلق ہے بلال صاحب!" چوہدری صاحب نے نرمی سے کہا۔ "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں آرام سے تشریف رکھ کر سنیے' لگتا ہے آج بہت سی گتھیوں کو سلجھنا ہے۔"

"کسی بھی اور بات سے پہلے میرا حساب بے باق کر دیجئے چوہدری صاحب!" رابعہ کلثوم نے پہلی بار چوہدری صاحب کو براہ راست مخاطب کیا۔ "یہ شخص" انہوں نے بلال سلطان کی طرف اشارہ کیا "میری بہنوں جیسی سہیلی کا قاتل ہے۔ قتل تو خیر اس نے بہت بعد میں کیا' اس ذکھیاری سے اس کا بیٹا چھین کر خود فرار ہو کر اسے جیتے جی تو یہ بہت پہلے مار چکا تھا' اس مری ہوئی' آہیں اور سسکیاں بھرتی عورت کو چھرے کی تیز دھار سے قتل کرنے کا کارنامہ سرانجام دینے کے بعد اس نے مجھے اور مولوی سراج کو دھمکیاں دیں کہ یہ قتل کا پرچا ہمارے نام کٹوائے گا' جبکہ ہمارا قصور صرف اتنا تھا کہ ہم اپنی سہیلی کے ایک ٹیلی فون پر دیے گئے پیغام "فوراً" مجھ تک پہنچو" کے جواب میں دن بھر کی خواری کے بعد عین اس وقت اس کے گھر پہنچے جب یہ شخص اسے قتل کرنے کے بعد اسے اور خود کو بھی خون میں نہلائے' آلہ قتل یعنی وہ چھرا ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا۔"

"آلہ قتل بلال صاحب کے ہاتھ میں تھا' خون میں نہائے ہوئے بھی یہ تھے۔ پھر آپ نے ان کی یہ دھمکی کیسے مان لی کہ پرچہ آپ پر کٹوا دیں گے۔" چوہدری صاحب کے لہجے میں رابعہ کلثوم کے لیے بے حد احترام تھا۔

"ہمیں ماننی پڑی چوہدری صاحب! غربت بیس ماندگی اور کم علمی انسان کی بہت بڑی دشمن ثابت ہوتی ہیں۔" رابعہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "ہم جب جائے وقوعہ پر پہنچے تو ایک انتہائی غیر متوقع منظر دیکھ کر جذباتی ہو جانا لازمی تھا۔ میں اپنے جذبات پر قابو نہ پاتے ہوئے لاش سے لپٹ کر رو رہی تھی اور دیرینہ تعلق کی بنا پر مولوی سراج ان صاحب کے گلے لگ کر آلہ قتل ان سے چھیننے کی کوشش کرنے لگے' ساتھ ساتھ یہ دہائی دیتے جا رہے تھے۔ نہیں بھائی صاحب! آپ تایا جی کو قتل نہیں کر سکتے' یہ آپ نے کیا کر دیا بھائی صاحب! یہ چھرا آپ کے ہاتھ میں سجتا نہیں۔ لائیں یہ چھرا مجھے دے دیں میں زمین کھود کر کہیں اسے دفن کر دوں گا۔ میں قتل کا الزام آپ پر نہیں آنے دوں گا۔"

رابعہ کلثوم نے نمناک نظروں سے سراج سرفراز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جنہوں نے ان کی یہ بات سن کر سر جھکا لیا۔

"بس۔" پھر رابعہ کلثوم نے ایک لمبی سرد آہ بھرنے کے بعد چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ "اسی کوشش میں میرے اور مولوی سراج کے کپڑوں پر خون کے دھبے بھی لگے اور آلہ قتل بھی اس چھینا جھپٹی میں مولوی صاحب کے ہاتھ آگیا۔"

"اوہ!" چوہدری صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"پھر یہ صاحب گرج کر بولے سراج! چھرا مجھے واپس کر دو اور بھاگ جاؤ یہاں سے۔ دیکھو! جو میں کہہ رہا ہوں

دونہیں کرو گے تو بس کسی آن بھی پولیس یہاں پہنچنے والی ہے' میں اپنی بیوی کے قتل کا پرچا تم دونوں پر ڈال دوں گا۔"

"اوہو!" چوہدری صاحب گڑبڑا کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ فلزا ظہور نے ایک طنز بھری نظر بلال سلطان پر ڈالی۔
"چوہدری صاحب! ہماری شامت کہ اسی وقت کہیں سے پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔"
مولوی سرفراز نے اپنی سرمہ لگی آنکھیں سکیڑ کر معصومیت سے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔
"ساتھ ہی ہماری چندروزہ بچی نے رونا شروع کر دیا۔" رابعہ نے کہا۔ "ان صاحب کی تنبیہہ جاری تھی۔ بھاگ جاؤ' ورنہ قتل تم پر ڈال دوں گا۔ ہم غریب' پس ماندہ کم علم لوگ تھے۔ قتل خود پر پڑ جانے کے بعد کے منظر دونوں کی نظروں کے سامنے ایک ساتھ گھومنے لگے۔ بچی نے رو کر اپنا آپ یاد دلایا۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' چھرا وہیں پھینک' بچی کو کندھے سے لگا' وہاں سے نکلنے کی کی۔"
"ان ہی خون آلود کپڑوں اور ہاتھوں سمیت؟" چوہدری صاحب نے پوچھا۔
"اس وقت یہ تو یاد ہی نہیں رہا کہ ہمارا حلیہ کیا ہو رہا تھا۔ بس نکلنے کی پڑی تھی۔ اوپر سے ان صاحب کی دھمکیاں جاری تھیں۔ ہم یوں بھاگے کہ آج تک پیچھے مڑ کر دیکھنے کا حوصلہ نہ کیا۔" رابعہ کلثوم زار و قطار رونے لگیں۔

"رات کے اندھیرے میں بھاگے تھے' صبح کی روشنی پھیلی تو ایک دوسرے کا حلیہ دیکھا۔ کپڑوں پر جابجا خون کے دھبے۔ رابعہ بی بی کے پاس کپڑوں کا تھیلا تھا جو برنان منڈی سے ساتھ لے کر چلے تھے۔ چھپتے چھپاتے لاہور سے کئی میل کے فاصلے پر ایک گاؤں پہنچے جہاں ایک جگہ کھیتوں پر ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ میں نے پہرے داری کی اور رابعہ بی بی نے لباس تبدیل کیا' رابعہ بی بی نے پہرے داری کی اور میں نے لباس تبدیل کیا۔ نہا دھو کر ہاتھوں پیروں سے خون کے دھبے چھڑا کر ہم اللہ کے آسرے پر آگے چل دیے۔ اللہ جل شانہ کا کرم ایسا تھا کہ ہمارے اس عمل کے دوران ٹیوب ویل کے آس پاس کوئی پرندہ بھی نہیں۔ جیسے ہی آگے چلے اکا دکا لوگ راستے میں نظر آتے رہے۔ ہمارا خوف' نظروں کے سامنے آنے والے ہر شخص کو پولیس کی وردی پہنا مارا اور ہم ایک دوسرے سے بھی بات کیے بغیر بے نام نشان راستوں پر بس چلتے ہی گئے۔ ایک جگہ لاری اڈا نظر آیا۔ وہاں پہنچ کر ساہیوال جانے والی ایک بس پر بغیر سوچے سمجھے سوار ہو گئے۔ غنیمت تھا کہ چند سو روپے ایک پوٹلی میں لے کر برنان منڈی سے چلے تھے' وہ محفوظ تھی۔ بس اس کے بعد ساہیوال پہنچے۔ اس کے نواحی دیہات کی مسجدوں میں پڑے رہے' جگہ جگہ نوکریاں کیں' اپنی شناخت چھپانے کے لیے ہلکان ہوتے رہے۔ دن یونہی گزرتے گئے۔ چھوٹی سی بچی اسی خواری میں جوان ہو گئی۔ ماں باپ کو یوں دنیا سے کٹ کر رہتے دیکھ کر سو سوال ذہن میں پالتی رہی۔ رابعہ بی بی حد سے زیادہ محتاط تھیں۔ اس احتیاط نے بچی کے اندر بغاوت پیدا کر دی اور اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے' چوہدری صاحب! بے نام' بے شناخت گھاری ہمارا اوڑھنا ہے۔ اس پر بھی بھائی صاحب کہتے ہیں' آنکھ بچھا بھی دیکھا لڑکے کا کہ نہیں۔ انہیں کون بتائے کہ خوف کے جس راستے پر انہوں نے ہمیں ڈال دیا تھا اس پر چلتے تو ہم اپنا آپ بھی بھول گئے تھے' کسی اور کا کیا پوچھتے۔"
مولوی سراج کی اس طویل بات کے دوران کمرے میں ایسی خاموشی چھائی تھی کہ سوئی گرنے تک کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔
"اسی لیے سعدیہ بیٹی کا بے فارم اور پیدائش کا سرٹیفکیٹ نہیں تھا آپ کے پاس؟" چوہدری صاحب کو یاد آیا۔
"ہمارے اپنے شناختی کارڈ پرانے ہو گئے' نوزائیدہ کے مارے نئے شناختی کارڈ نہیں بنوائے آج تک کہ کسی شناخت کی زد میں نہ آجائیں۔ سعدیہ بے چاری کا پیدائشی سرٹیفکیٹ اور بے فارم بنانے کا ہوش کس کو تھا۔" رابعہ کلثوم

نے کہا۔

"مولوی سراج سرفراز صاحب!" اسی دم فلزا ظہور اپنی جگہ سے اٹھ کر عین مولوی صاحب کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ "آپ تو مذہب کو' اللہ تعالیٰ کو' اللہ تعالیٰ کے حسن انتظام کو اور مکافات عمل کے پروسیس کو مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ حسن اتفاق پر غور کیجئے کہ جس افتخار احمد عرف کھاری کو بے شناخت بے نام و نشان آپ گردان رہے ہیں' وہ اسی شخص کا اپنا سگا بیٹا ہے' جس نے آپ کی ساری زندگی ایک مجسم خوف کے سپرد کر ڈالی۔" فلزا نے آگ برساتی نظروں سے بلال سلطان کی طرف دیکھا۔

"اب اتنے سالوں بعد کسی کی اولاد میری ولدیت کے کھاتے میں ڈال دینے سے تم اس حساب کتاب سے نہیں بچ سکتیں فلزا ظہور' جو تمہاری طرف میرا نکلتا ہے۔" بلال سلطان نے پُرسکون انداز میں کہا۔

"میں کسی کی اولاد کو تمہاری ولدیت کے کھاتے میں نہیں ڈال رہی۔" فلزا نے جواب دیا "کھاری تمہارا ہی بیٹا ہے' جسے تم نے اس خونی رات کو میرے حوالے کیا تھا۔"

"تم نے کہا تھا' وہ مر گیا۔" بلال سلطان کے منہ سے الفاظ اب کے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے تھے۔

"میرا گمان تھا۔ وہ مر گیا ہو گا۔" اس بار فلزا کی آواز دھیمی پڑی تھی۔

"جہاں' جس طرح میں نے اسے رکھ دیا تھا اور اپنا آپ اس ذمہ داری سے چھڑوا لیا تھا' اس میں اس کا مر جانا لازمی تھا۔ اس بس اسٹاپ پر صبح کے اس وقت پھرتا کوئی بھی آوارہ کتا' کوئی بھی جنگلی بلی گوشت کے اس ذرا سے لوتھڑے کو چیر پھاڑ کر رکھ سکتی تھی مگر۔" فلزا نے رک کر گہرا سانس لیا "ایسا نہیں ہوا اللہ کو اس کی زندگی منظور تھی۔"

اس پورے وقت میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ بلال سلطان کا چہرہ سفید پڑا اور ان کی آنکھیں پھیلی تھیں۔ اس سے پہلے کی کئی ساری باتیں گویا متوقع تھیں۔ ایک صرف یہی بات ناقابل یقین اور غیر متوقع تھی۔ وہ کافی دیر تک کچھ اور بولنے کے قابل نظر نہیں آرہے تھے۔

"اسے قدرت کی ستم ظریفی سمجھ لو یا اپنی خوش قسمتی کہ وہ بچہ چوہدری سردار کی گود میں پہنچ گیا' جنہوں نے اتنے برس اسے اپنے پاس رکھا' پالا پوسا اور وہ بچہ آج کا افتخار احمد عرف کھاری بن گیا۔"

اپنی بات کہتے کہتے فلزا کی نظر رابعہ کلثوم پر پڑی جو اپنی داستان غم بھول کر اس نئے انکشاف پر دم بخود بیٹھی تھیں۔ رابعہ سے نظر ہٹا کر فلزا نے بلال سلطان کی طرف دیکھا اور اسے ایسا لگا جیسے بلال کو دل کا دورہ پڑنے والا ہو' جیسے ان کا جسم اور زبان مفلوج ہو رہی ہو۔ وہ سوالیہ نظروں سے چوہدری سردار کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن خواہش کے باوجود اپنے سوال کو الفاظ میں ڈھال نہیں پا رہے تھے۔

"یہ درست ہے بلال صاحب!" چوہدری سردار نے آہستہ آہستہ سر ہلاتے ہوئے کہا "ادب اور فن مصوری پرستوں کی جس محفل میں محض ایک روز پہلے آپ نے اور فلزا ظہور نے شرکت کی تھی' اس میں میں بھی موجود تھا۔ یقیناً" آپ دونوں کو وہاں میری موجودگی یاد نہیں ہو گی کیونکہ میں ایک عام آدمی تھا۔ لیکن مجھے آپ تھوڑے بہت مگر فلزا بی بی خصوصا" یاد تھیں۔ ان کے جو فن پارے وہاں دکھائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک دو فن پارے مجھے پسند آئے تھے اور میں انہیں خریدنا چاہتا تھا لیکن اس وقت وہ برائے فروخت نہیں تھے خیر۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ "اس سے اگلے روز مجھے فیصل آباد جانا تھا۔ میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ نصف شب کو ہی سفر پر روانہ ہو گیا۔ شب دن میں ڈھلنے لگی تھی' جب ایک قصبے کے بس اسٹاپ کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہاں رک کر کسی اسٹال سے چائے کے دو کپ لے آئے' کیونکہ ہم دونوں کو ہی اونگھ آنے لگی تھی۔ ڈرائیور گاڑی روک کر چائے لینے چلا گیا اور میں گاڑی میں ہی بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا' جب اچانک میری نظر ٹھہرائی'

سی چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی فلزا ظہور پر پڑی۔ میں اس ایک نظر میں ہی انہیں پہچان گیا تھا۔ پہچانتا کیسے نہیں' محض ایک روز پہلے ہی تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ابھی تک ان کا لباس بھی وہی تھا۔ انہیں وہاں دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس قصباتی بس اسٹاپ پر یہ کیا کر رہی تھیں وہ بھی تنہا۔ میں نے دیکھا ان کی گود میں کپڑے میں لپٹی کوئی چیز تھی' جسے انہوں نے وہاں کھڑی ایک بس کی اوٹ میں رکھ دیا اور خود تیزی سے چلتی دوسری جانب نکل گئیں۔"

چوہدری صاحب نے رک کر بلال کی طرف دیکھا جنہوں نے شدت کرب سے اپنی آنکھیں بھینچ رکھی تھیں۔

"عجیب بات یہ تھی کہ جونہی فلزا بی بی وہاں سے ہٹیں۔ کپڑے میں لپٹا بچہ چیخ مار کر رو دیا۔ میں نے گھبرا کر گاڑی کے دروازے کو کھولا اور باہر نکل کر اس جگہ پہنچنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ڈرائیور چائے لے کر آگیا۔ میں ذرا کی ذرا اس کی طرف متوجہ ہوا' اس کی بات سننے میں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ لگا ہوگا' جس کے بعد میں نے دوبارہ بچے کی طرف دیکھا تو وہ وہاں سے غائب تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ ایک منٹ کے اندر بچہ کہاں گیا۔ اگر بس اسٹاپ پر موجود کسی اور دوسرے شخص کی نظر اس پر پڑی تھی تو پھر تو ہنگامہ مچ جانا چاہیے تھا' لیکن وہاں وہی پہلے سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے تیزی سے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے ایک بھکارن نما عورت جاتی نظر آئی جس نے سینے سے کوئی شے لگا رکھی تھی۔"

چوہدری صاحب نے رک کر ایک بار پھر بلال سلطان کی طرف دیکھا جنہوں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے تھے۔ ان کے چہرے پر واقعی اذیت پھیلی تھی۔

"میں نے ڈرائیور سے کہا' سب کچھ وہیں چھوڑ کر بھکارن کا پیچھا کرے۔ ٹی اسٹال والے کے برتن وہیں زمین پر رکھ کر ہم نے گاڑی بھکارن کے پیچھے لگا دی۔ وہ بھاگتے قدموں سے آگے جا رہی تھی۔ وہ ایک بار اس نے پیچھے مڑ کر بھی دیکھا' جس سے مجھے اس کا چہرہ نظر آگیا۔ ہم اس کے سر پر پہنچا ہی چاہتے تھے کہ وہ مڑ کر ایک تنگ گلی میں گھس گئی' جہاں گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔ ہم دونوں گاڑی وہیں چھوڑ کر اس کے پیچھے گلی میں پیدل ہی داخل ہو گئے لیکن اس گلی سے کئی ذیلی گلیاں نکلتی ادھر ادھر جا رہی تھیں۔ اس کی تلاش میں ایک دو گلیوں میں جھانکنے کے دوران ہی وہ غائب ہو گئی۔ ہم پاگلوں کی طرح سب گلیوں میں دیکھتے پھرے۔ آنے جانے والوں سے پوچھتے رہے مگر اس بھکارن کو نہ ملنا تھا وہ نہ ملی۔"

"لے گئی اس بچے کو؟" رابعہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"جی بہن جی! وہ بھکارن اس بچے کو لے گئی۔" چوہدری صاحب نے سر ہلایا۔ "میں مایوس ہو کر واپس گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ دل چاہا اس قصے پر فاتحہ پڑھ کر آگے بڑھ جاؤں لیکن نجانے میرے اندر کیوں کوئی مجھے اکسا رہا تھا کہ بچے کو ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔ میں نہیں جانتا کس طاقت نے مجھ سے گاڑی کا رخ مقامی تھانے کی طرف کروایا۔ وہاں جا کر تھانے دار سے میں نے سارا قصہ کہہ ڈالا۔ میں اللہ کے کرم سے صاحب حیثیت تھا' میرے تعارف اور حیثیت نے تھانے دار کو بھی فوری عمل پر مجبور کر دیا۔ پولیس کے سپاہی ادھر ادھر بھگا دیے گئے' بھکاریوں کے ٹھکانوں اور بستیوں کو کھنگال دیا گیا۔ وہیں کہیں سے معلوم ہوا کہ جینا نامی ایک بھکارن کہیں سے ایک نوزائیدہ بچہ اٹھا لائی تھی۔ اس تلاش میں کئی دن نکل گئے۔ تھانیدار خود میرے ساتھ ہر اس جگہ پہنچا جہاں اس بھکارن کی موجودگی متوقع تھی۔ کتنی ہی خواری کے بعد ہم اس تک پہنچ ہی گئے۔ وہ بچے کو ایک مہینہ گود میں ڈالے ہمیں دھوکا دیتی ادھر ادھر بھاگ رہی تھی' جب ہم اس کے سر پر جا پہنچے۔ بچہ اس سے بازیافت کروا کر کچھ کاغذی کارروائی کے بعد تھانیدار نے بچہ میرے حوالے کر دیا۔"

چوہدری صاحب بات مکمل کرتے ہوئے رکے۔

"آپ کیوں اس بچے کے پیچھے اتنا خوار ہوئے چوہدری صاحب! آپ نے کیوں اسے حاصل کر کے ہی دم لیا؟"
رابعہ کلثوم نے ایک بار پھر بے اختیار سوال کیا۔
"میں نے بتایا نا کہ محض ایک روز پہلے ہی تو فلزا بی بی سے ملاقات ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں بے شمار سوال تھے الجھنیں تھیں۔ وہ بچہ فلزا بی بی کا تو ہرگز نہیں تھا۔ یہ مجھے یقین تھا کیونکہ ایک روز پہلے ہونے والی ملاقات میں ایسے کوئی آثار مجھے نظر نہیں آئے تھے کہ فلزا بی بی بچہ پیدا کرنے جا رہی ہیں۔ پھر وہ بچہ کون تھا اور فلزا بی بی نے اسے یوں کتوں بلیوں کا شکار ہو جانے کے لیے وہاں کیوں چھوڑا تھا۔ خود چوروں کی طرح کیوں غائب ہو گئی تھیں۔ ان ہی سوالوں اور الجھنوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں وہ بچہ لے آؤں۔ میں نے سوچا شاید وہ بعد میں پچھتاوے میں مبتلا ہو جائیں۔ میں کسی بھی طرح ان سے رابطہ کر کے بچہ ان تک پہنچا دوں گا۔"
"پھر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ بچہ آپ کے پاس ہی کیوں رہ گیا۔" رابعہ کا اگلا سوال تھا۔
"ان سے پوچھیے۔" چوہدری صاحب نے فلزا کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا میں ان سے رابطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ کیا میں نے ان سے بچے کے بارے میں استفسار کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ بچہ محفوظ ہے، اسے لے جایئے یا آپ تک پہنچا دیا جائے اور کیا میری ہر کوشش کے جواب میں انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ان پر الزام لگا رہا تھا، بہتان باندھ رہا تھا۔ وہ کسی بچے کو نہیں جانتیں۔ نہ ہی انہوں نے کوئی بچہ اس بس اسٹاپ پر رکھا تھا۔ کیا میری چند کوششوں کے بعد انہوں نے نہ صرف اپنا رابطہ نمبر بلکہ اپنا ٹھکانہ بھی بدل نہیں لیا تھا۔"
رابعہ کلثوم کی سوالیہ نظریں فلزا کی طرف مڑ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے ہمیشہ مجھ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ میں بچوں کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہوں اور ان پر غیر ضروری پابندیاں لگانے کی بھی مرتکب ہوتی ہوں۔" فائزہ نے جتا کر زوار کی طرف دیکھا جو پچھلے ایک گھنٹے سے فائزہ کے الفاظ کی گولہ باری کی زد میں تھے۔
"میں آپ کو کتنی بار بتا چکا ہوں کہ میں ایسا ہرگز نہیں سمجھتا۔" زوار نے ایک مرتبہ پھر اپنا کمزور سا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ "بلکہ میں تو تہہ دل سے آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے میرے بچوں کی بہت دل لگا کر تربیت کی۔ ایسی تربیت جس کے زمانہ بھی گن گاتا ہے۔"
"یہ تربیت کی میں نے۔" فائزہ نے کسی سمت اشارہ کیا "لعنت ہے ایسی تربیت پر جو بچوں کو اپنی من مانی سے نہ روک پائے۔ آپ نے دیکھا نہیں کیا حلیہ ہو رہا ہے لڑکی کا۔ یوں جیسے سالوں سے سوئی نہیں، نہ ڈھنگ سے پہننے اوڑھنے کا ہوش ہے نہ ہی خود پر دھیان دیتی ہے۔ صرف آپ نے اس کا ساتھ دیا تو میں خاموش ہو گئی کہ اسے اسلام آباد چھوڑ دیا جائے۔ لیکن یہ وہاں سے کچھ سیکھ کر آنے کے بجائے جو سیکھا ہوا تھا لگتا ہے وہ بھی بھلا آئی ہے۔ پڑھائی کا سلسلہ ختم ہوا تو کری کا بیڑا غرق ہو گیا۔ لڑکی کے طور اطوار بنا ہو گئے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ یہ وہی بلاور ہے۔ جو میری بیٹی تھی۔"
"تھی سے کیا مراد ہے آپ کی۔ بلاور ابھی بھی آپ ہی کی بیٹی ہے۔" زوار نے مسکرا کر کہا۔
"نہیں میں ایسی بے ہنگم، غیر منظم اور لاپروا اولاد کی ماں کہلوانا ہرگز پسند نہیں کروں گی۔" فائزہ کی پیشانی پر بلوں کا اضافہ ہو گیا۔
"یقین کریں کہ وہ ایسی نہیں ہے۔" زوار نے سمجھانا چاہا۔
"وہ ایسی نہیں تھی لیکن پچھلے کافی عرصے سے وہ ایسی ہو چکی ہے۔ میں اس کو ایک ہفتے میں سیدھا کر دوں اگر

آپ کی شہ اسے حاصل نہ ہو۔"

"میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا کیونکہ شاید میں اسے آپ سے زیادہ سمجھتا ہوں۔" زوار کے لہجے میں استحکام آ گیا۔

"تو کیا آپ اس کا نیا مطالبہ بھی مان لیں گے؟" فائزہ نے ابرو چڑھایا۔ "یاد رکھیے! اگر آپ نے ایسا کیا تو پھر میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔"

"میں اس کے نئے مطالبے کو بالکل سپورٹ کروں گا۔" زوار مسکرائے "اور یقین جانیے ایسا کر لینے کے بعد بھی وہ آپ کی ہی بیٹی رہے گی۔ آپ اس کی ذرا سی تکلیف پر ویسے ہی ردعمل ظاہر کریں گی جیسے ہمیشہ کرتی رہی ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" فائزہ نے سختی سے کہا۔ "ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھو بھلا لڑکی من مانی پر من مانی کیے چلی جا رہی ہے اور یہ ٹھنڈے ٹھنڈے اسے شہ دیے جا رہے ہیں۔"

"آپ میری نگرانی پر اسے اجازت دے دیں' یقین جانیے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔" زوار نے رسان سے کہا۔

"اسے اجازت دے دوں۔" فائزہ نے تیوری چڑھائی "وہ جو فٹ بال نما لڑکا اس کے ساتھ آیا ہے۔ اس کے ساتھ اسے وہاں جانے کی اجازت دے دوں' جہاں جانا چاہتی ہے۔"

"جی بالکل!" زوار نے کہا۔

فائزہ منہ موڑ کر بیٹھ گئیں۔ "آپ جانتی ہیں کہ وہ ایک سمجھ دار لڑکی ہے" زوار نے سمجھانا چاہا۔ "وہ سوچے سمجھے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔"

"میں جانتی ہوں کہ وہ ایک جذباتی لڑکی ہے' پل بھر میں فیصلہ کر لینے والی اور بعد میں وہ ایسے فیصلوں پر کتنا پچھتاتی ہے' یہ وہ کسی پر ظاہر نہیں کرتی۔"

"بچوں کو تجربے کرنے دینے چاہئیں۔ انہی سے گزر کر انہیں سمجھ آتا ہے کہ ان کے لیے کیا درست ہے کیا غلط۔"

"یہ آپ کا نظریہ ہو گا میرا نہیں۔"

"کب تک بچوں کی انگلی پکڑ کر انہیں چلانے کی کوشش کرتی رہیں گی۔" زوار جھنجلانے لگے۔

"میں ایسا کبھی نہ کروں اگر یہ بچے اپنے لیے درست فیصلہ کرنے کی استطاعت رکھتے۔"

"اچھا ایسا ہے کہ آپ جو چاہتی ہیں' وہ سلمان پر آزمالیں۔ ماہ نور کے سلسلے میں کچھ دیر مجھے فیصلہ کر لینے دیں۔"

"ٹھیک ہے۔" فائزہ تیزی سے اٹھیں۔ "بعد میں اگر آپ کے فیصلے غلط نکلے تو مجھ سے مت کہیے گا۔"

"اوکے... کوئی آپ سے نہیں کہے گا۔" زوار کو لگا ان کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

"تمہاری ماں کو کنونس کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔" کچھ دیر بعد وہ ماہ نور سے کہہ رہے تھے' جو ایک شام قبل ہی اسلام آباد سے لاہور پہنچی تھی۔

"آپ کو کنونس ہیں نا بابا؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"مجھے یقین نہیں۔" زوار نے سراہا۔ "لیکن جو تم کرنا چاہ رہی ہو' اگر اس میں بھلائی ہے تو مجھے تم پر بھروسا کرنا چاہیے۔"

"آپ ابراہیم سے ملے؟" ماہ نور نے موضوع بدلا۔ "آپ نے دیکھا وہ کتنا سویٹ لڑکا ہے۔"

"ہاں وہ ایک اچھا اور سمجھ دار لڑکا ہے۔"

"ابراہیم سعد کے لیے مجھ سے زیادہ پریشان ہے۔" ماہ نور نے کہا۔

"اس ایک لڑکے نے اپنی ناقابل فہم طبیعت کی وجہ سے کتنے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔" زوار نے سرہلایا۔

"وہ ایسا ہی ہے۔" ماہ نور نے کہا۔ "شاید آپ اس بڑا ماکو سمجھ نہیں پائے جس سے وہ گزرا ہے۔"

"میں نے تم سے کہا تھا۔ سردار بھائی سے بات کرلو۔"

"میں نے ان سے بات کرلی ہے' وہ کہہ رہے تھے کہ تم جو سمجھ رہی ہو وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مگر ایک عجیب بات انہوں نے کی۔" ماہ نور کو یاد آیا۔

"وہ کیا؟"

"وہ کہہ رہے تھے' میں زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا کیونکہ یہاں ماحول بہت گرم ہے۔"

"ماحول گرم ہے یا موسم گرم ہے؟" زوار چونکے۔

"موسم تو خیر اب اتنا گرم نہیں رہا لیکن پتا نہیں' سردار چچا کی اس بات کا کیا مطلب ہے؟"

"ان کو بہت سے کام رہتے ہیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد گاؤں واپس آئے ہیں نا۔ لوگوں کے جھگڑے نمٹاتا ہوں گے' تصفیے کراتا ہوں گے' اسی میں مصروف انہوں نے کہہ دیا ہو گا۔" زوار مسکرائے۔

"ہوں!" ماہ نور نے سرہلایا۔ "بابا! آپ سکندر انکل سے کہہ کر میرا کام جلد کرا دیں گے نا!"

"ہاں میں نے اس سے بات کرلی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا جو تھوڑا وقت روٹین میں لگتا ہے' وہ تو لگے گا ہی لیکن کام ترجیحاتی بنیادوں پر ہو جائے گا۔"

"آئی لو یو بابا!" ماہ نور مسکرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"انسان کے ذہن میں کوئی سوال اٹھتا ہے۔" ڈاکٹر رضا کہہ رہے تھے یہ ان کے ساتھ سعد کی اگلی ملاقات تھی۔

"وہ اس سوال کا جواب اپنی عقل کے مطابق دینے کی کوشش کرتا ہے... جب عقل جواب دینے سے قاصر ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ارد گرد دیکھتا ہے' کیا اس کے گردوپیش میں کوئی چیز اس کے اس سوال کا جواب دے سکتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے ہم خیالوں سے ذہن کی الجھن کا ذکر کرتا ہے۔ کئی سر جڑتے ہیں تو سوال کا کوئی نہ کوئی مشترکہ جواب نکل ہی آتا ہے۔ اس جواب پر تحقیق ہو سکتی ہے' اس کے حقائق و جزئیات پر غور کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق تمام شکوک و شبہات پر بحث ہوتی ہے۔ اس بحث مباحثہ میں کہیں نہ کہیں سوال کا وہ جواب موجود ہوتا ہے جو سوال کرنے کے دل کو لگتا ہے۔

بس یہیں اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ پھر اس جواب کو حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا جاتا ہے۔ اسے ہی قانون کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔"

"اچھا ہے!" سعد نے سرہلایا۔ "آپ کا انداز اچھا ہے' مگر یہ گمان مت کیجئے گا کہ میں کسی سوال کے جواب کو پانے کے لیے ان تمام مرحلوں سے گزرے بغیر ہی کوئی قانون بنا گیا ہوں گا۔"

"پھر بھی آپ کو جواب نہیں ملا؟" ڈاکٹر رضا نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جواب ہی نے تو فرار پر مجبور کر دیا۔"

"مجھے ماویہ آپ کے ذہن کی سب الجھنوں سے آگاہ کر چکی ہے۔"

"تو؟" سعد نے ان کی طرف دیکھا۔ "آپ کو کیا لگا' میں غلط یا باقی سب لوگ صحیح؟"

"بابا۔ آپ نے تو دونوں طرف ایک ہی بات کردی۔" ڈاکٹر رضا ہنسے۔

"کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ گھما پھرا کر آپ بھی مجھے ہی غلط قرار دیں گے۔ جیسے اختر نے کہا جیسے زرفاطمہ نے کہا جیسے ہر وہ شخص کہے گا جو مجھے جانتا ہو گا۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔" ڈاکٹر رضا نے کہا۔ "میرے خیال میں آپ نے وہی کیا جو ایک صحیح الدماغ شخص کو کرنا چاہیے تھا۔"

سعد نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا "کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ وہی کہنا چاہ رہے ہیں جو کہہ رہے ہیں۔"

"ایک سو فی صد!" ڈاکٹر رضا مسکرائے۔

"شکر خدا!" سعد نے چھت کی طرف دیکھا۔ "کوئی تو ہے جس نے میرا نقطہ نظر سمجھا! لیکن ایک اختلاف مجھے بھی ہے آپ سے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ ابتدائی ذہنی جھٹکے کے بعد آپ جیسے تحمل پسند شخص کو سنبھل جانا چاہیے تھا اور اپنے ذہن میں اٹھتے سوال 'شکوک اور گمان' کم از کم ایک بار اپنے والد سے پوچھنے چاہیے تھے۔"

"آپ انہیں جانتے نہیں۔" سعد نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ "وہ بند دروازوں کے پیچھے چھپے شخص ہیں۔ ان کے بند دروازوں پر کوئی عمر بھر بھی دستک دیتا رہے دروازے نہیں کھلیں گے۔"

"کسی کو اپنی صفائی کا موقع دیے بغیر اسے مجرم قرار دینا بھی قانون فطرت کے خلاف نہیں ہے کیا۔" ڈاکٹر رضا نے سوال کیا۔

"آپ ایک آئینہ خانے میں کھڑے ہوں اور وہاں موجود ہر آئینہ ہر عنوان کے نیچے ایک ہی چہرہ دکھا رہا ہو تو آپ کو کسی بیان یا صفائی کی ضرورت پڑے گی کیا؟" سعد نے الٹا سوال کیا۔

"آئینوں پر اعتبار کرتے ہیں گویا آپ!"

"آئینے بھی جھوٹ بولتے ہیں کیا؟" سعد نے براہ راست ڈاکٹر رضا کی آنکھوں میں جھانکا۔ جس کے ردعمل میں انہوں نے فوراً" اپنا چشمہ آنکھوں پر لگا لیا۔

"آئینے جھوٹ بولتے ہیں یا نہیں' یہ الگ بحث ہے' لیکن کبھی کبھی ہمیں آئینے میں وہی عکس نظر آنے لگتا ہے جو ہم دیکھنا چاہ رہے ہوتے ہیں' اسے اشتباہ کہتے ہیں' اشتباہ نظر۔"

"میں ایسا کوتاہ نظر نہیں۔" سعد برا مان گیا۔

"ان خاتون کی پینٹنگز کو آپ نے اپنے والد کی فرضی محبت سے خود ہی جوڑ لیا۔ خاتون سے سوال کیا نہ ہی والد سے' کیا یہ آپ نے ٹھیک کیا؟" ڈاکٹر رضا براہ راست سوال پر اتر آئے۔

"کبھی کبھی سوال کیے بغیر ہی جواب مل جاتے ہیں اور وہ جواب اتنے واضح ہوتے ہیں کہ سوالوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔"

"واہ! آپ تو بہت ذہین آدمی ہیں۔" ڈاکٹر رضا نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے یہ بتائیں کہ اگر آپ چیزوں کے بارے میں اتنے واضح ہیں تو پھر آپ کی پریشانی کی وجہ کیا ہے؟"

"میں پریشان نہیں ہوں۔" سعد نے سر ہلایا۔ "میں مایوس ہوں' زندگی نے بہت برا پلٹا کھایا ہے' میری ترجیحات ایک بڑی شکست سے دوچار ہو گئی ہیں اور مجھے اپنے سامنے کا راستہ واضح نظر نہیں آتا' یوں لگتا ہے مجھے زندگی کو دوبارہ سے منظم کرنا ہو گا' لیکن یہ کیسے ہو گا' میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"آپ اپنے مسئلے کا حل چاہتے ہیں کیا؟" ڈاکٹر رضا نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔ "شاید میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔"

"مطالعے کی عادت ہے آپ کو؟" ڈاکٹر نے سوال کیا۔

"بھی تھی، اب نہیں، پوری توجہ سے کچھ نہیں پڑھ پاتا۔"

"اگر میں آپ کو کچھ پڑھنے کو دوں تو پڑھیں گے کیا؟"

"میرا معاملہ نادیہ سے مختلف ہے ڈاکٹر صاحب، وہ واہموں کا شکار تھی آپ نے اس کے سامنے کا منظر اس پر واضح کر دیا، جبکہ میں سب کچھ جانتا ہوں، سمجھتا ہوں مگر جو کچھ جان اور سمجھ چکا ہوں اس سے مایوس ہوں۔"

"آپ فکر مت کریں۔ میں آپ کو راستہ دکھانے والا ہوں نہ ہی کچھ واضح کرنے جا رہا ہوں، میں صرف آپ کے وقت کا مثبت استعمال چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، دیجیے جو آپ دینا چاہتے ہیں، میں ضرور پڑھوں گا۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

اگلے لمحے اس کے ہاتھ میں قرمزی جلد والی ایک کتاب تھی جس کا عنوان اس کی قرمزی جلد پر سنہرے حروف میں لکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میری مان، جہاں سے پتا چلا ہے، وہاں پہنچ جا اور اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو جا۔"

اس رات سونے کے لیے ایک ہی جھولداری میں اس کی چارپائی کے ساتھ بچھی چارپائی پر لیٹتے ہوئے خان چاچا نے اسے مشورہ دیا تھا۔

"اس کا اب کیا فائدہ۔" اس نے اپنے موبائل پر ایم ایم ایس کے ذریعے بھیجی گئی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو خان چاچا! وہ اپنے قدموں پر کھڑی ہے۔ اگرچہ دیکھنے میں مکمل نارمل نہیں لگتی۔" اس نے موبائل خان چاچا کے سامنے کیا۔

خان چاچا کتنی ہی دیر اس تصویر کو غور سے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے آنسو اس کی آنکھوں کے گوشے بھگوتے ہوئے رخساروں پر ڈھلک آئے۔

"یقین نہیں آتا۔ یہ تو معجزہ ہے معجزہ۔"

"آپ کو معلوم ہی نہیں کہ یہ معجزہ کس شخص کے ہاتھوں ممکن ہوا..... مگر مجھے معلوم ہے۔" وہ جیسے خود سے کہہ رہا تھا۔

"بہت اچھا ہوا نا ایسا ہو گیا، ہے نا خان چاچا؟" اس نے کروٹ بدل کر خان چاچا کی طرف دیکھا۔

"ہاں..... بہت اچھا۔" خان چاچا ابھی بھی تصویر میں گم تھا۔

"لیکن دکھ تو اس بات کا ہے کہ یہ معجزہ جسے ممکن ہونا ہی تھا، ہمارے ہاتھوں کیوں نہیں ممکن ہوا۔ وہ غیر ہاتھوں میں چلی گئی اور ایسا ہماری بے حسی کی وجہ سے ہوا۔ اب ہم میں سے کوئی بھی کس منہ سے اس کا سامنا کرے گا۔"

وہ رک رک کر بول رہا تھا۔

"دکھ..... میرے شہزادے!" خان چاچا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "تیرا جو من تجھے اللہ نے دیا ہے نا، اسی کے ساتھ جا۔ اس کے سامنے چلا جا۔ کچھ نہیں ہوتا میرے یار! وہ سرکس کی بچی ہے، سرکس والوں سے منہ موڑ ہی نہیں سکتی۔ تو دیکھ لینا۔ میری بات سچ ثابت ہو گی۔"

"بات نہیں ہو گی خان چاچا!"

"تے ہور کی؟" نور فاطمہ مسکرائی۔ "رات لمی سی تے گلاں مکدیاں نئیں سن' فجر ویلے تک اوہدے اندر دا بھانبھڑ ٹھنڈا ہو گیا سی۔ اوس نے کہا بے بے توں ننگا کھوڑ میں وضو کردا اے' توں آپ ای دس کدی کوئی کافر وی وضو کردا اے؟" اس نے لڑکی سے سوال کیا۔

"آپ نے ایسا کیا جادو پھونکا کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا؟" لڑکی نے اب کے سر اٹھا کر پوچھا اور کھسک کے نور فاطمہ کے قریب ہوئی۔

"میں۔" نور فاطمہ ایک دفعہ پھر مسکرائی۔ "میں اوہدے نال اوہدے دل دیاں گلاں کیتیاں' اوہدیاں سنیاں اوہدیاں ای کیتیاں۔"

"دل کی بات کیا تھی؟" لڑکی کے چہرے پر تجسس ابھرا۔

"اوجدے نال پیار کردا اے' اوہدیاں گلاں کنھیں لگا' نور فاطمہ مسکرا کر بولی "اودا باغ بڑا اچا اے بے بے' اوتے کدی وی تیری ایس گلی وچ نہ آئے گی۔"

لڑکی کے چہرے پر تاریک سایہ لہرایا۔

"اوتے تیرے ان بھانڈیاں وچ کبھی وی روٹی نہ کھاوے گی' کبھی وی ایس چارپائی تے نہ سووے گی۔"

لڑکی نے اپنے سامنے آئے لڑکے کی طرف دیکھا اور پھر اس سے نظریں چرا لیں۔

"تم نے دیکھا' تمہارے بارے میں اس کی ریزرویشنز کیسی ہیں۔" لڑکے نے ہنس کر اس سے کہا۔

"غلط سوچتا ہے وہ' غلط کہتا ہے۔" لڑکی نے جھنجلا کر کہا۔

"میں اوہنوں آکھیا' نہ وے جھلیا' جی نوں جی جوندی اے' پیار محبت ہور کی ہوندی اے۔" نور فاطمہ ان دنوں کی بات سمجھے بغیر بولی۔ "جے اوہنوں تیرے نال سچا پیار اے تے فیر او تیرے نال اک مک ہو جائے گی' جو توں ایں اوہ وی توں ای ہو جاوے گی۔"

لڑکی نے آنکھیں میچ لیں۔ اس کی پلکیں بند آنکھوں پر لرز رہی تھیں۔

"میری گل سن کے او بولیا' بے بے دل خوش کیتا ای' پھر ہنسنے لگا تے بولن دی لگا' اوہنے مینوں دسیا کڑی بڑی سوہنی اے تے اودھا دل اوس توں وی بوہتا سوہنا اے۔ اوہدیاں اکھاں سوہنیاں' اوہدے وال وی سوہنے' او جد کھل (ہسدی) اے تے ساری دنیا ساہ لینا بھل جاندی اے' بس ساری دنیا اوہدے ول ای تکن لگ جاندے اے۔"

لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جنہیں وہ الٹے ہاتھ سے خشک کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

"ناریاں دو تکر چک تک کر دا دل سی اوہدا!" نور فاطمہ بولی "اوہدے دل وچ پیار ای پیار سی' پیار دا پورا سمندر وگدا سی اوہدے اندر' سویر ہوئی تے میں سمجھا وے جھلیا ہن تے اونہ کریں کے جو کرن نوں ساں' میں آکھن لگا سیں بے بے ہن کے نوں کج نہ آکھاں گا بس لانبھ کر جاواں گا۔ میرا دل ہسیا تے میں سوچیا الو بن ای نے میرے رب سوہنے نے مینوں بالن چکدی نوں اوتھی گزدی وے پچھے نئیں لایا سی' میرا رب سوہنے دے ہر کم وچ کوئی نہ کوئی گھوڑی (گہری) بات ضرور ہوندی اے۔"

"لیکن وہ تو اپنی کرنی سے نہیں رکا ماں جی' وہ تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا گیا' غائب ہو گیا ہم سب کی نظروں کے سامنے سے۔" لڑکے نے کہا۔

"جو کج او کرن چلا سی او تے نئیں نا کیتا اوہنے۔" نور فاطمہ نے کہا۔

"کیا کرنے چلا تھا؟"

"اپنے سکے پیو نوں فیر (فائر) مارن چلا سی او۔" نور فاطمہ نے اس ساکت ماحول میں جیسے کوئی بم پھوڑا تھا۔

"تو میرے کہنے پر ایک دفعہ ہمت کر۔ ایک بار ضرور جا کرایہ، جیب خرچا سب میں دوں گا۔" خان چاچا پریا رانی کی تصویر دیکھ کر جیسے جی اٹھا تھا، جوش میں آکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آپ کو یقین ہے وہ منہ نہیں موڑے گی؟" اس نے بے یقینی سے خان چاچا کو دیکھا۔

"مجھے پورا یقین ہے۔" خان چاچا کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے، میں ایک بار ان بی بی سے رابطہ کرتا ہوں جنہوں نے اس کی تصویر مجھے بھیجی تھی۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

"بڑی سوہنی رات تھی وہ، ہم دونوں ماں بیٹے نے باتیں کرتے ہی گزاردی رات۔"

نور فاطمہ نے اپنے سامنے بیٹھے نوجوان لڑکے اور لڑکی سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ یہ دونوں مہمان ادھر ادھر سے اس کے بارے میں پوچھتے لمبی خواری کے بعد اس تک پہنچے تھے۔

"وہ آپ تک پہنچا کیسے ماں جی؟" لڑکے نے جس کا قد زیادہ لمبا نہیں تھا اور جسم بھرا بھرا سا تھا، پوچھا۔

"اونہوں ہنری کی موڑ کر میرے پاس لے آئی سی۔" نور فاطمہ مسکرائی "نئیں تو اس نے کہاں میرے ول آونا سی توبہ توبہ!" اس نے انگلیوں سے کچے فرش پر دو لکیریں سی کھینچنے کے بعد کانوں کو ہاتھ لگائے "غصے کا تو بڑا ہی تیز تھا اوہ۔"

"ماں جی! اسے غصہ نہیں آتا، میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" لڑکے نے ایک بار پھر مداخلت کی۔

"نئیں آتا ہووے گا۔" نور فاطمہ نے بے نیازی سے کہا۔ "پر اس دن تے او غصے وچ بھا مجر بنا ہویا سی او سدھی راہ بھول گیا، اس کی گڈی دا تیل ختم ہو گیا، اسے میں بہانے سے ایدھر لے آئی اپنی گلی وچ، خوشی محمد نے اس رات نوں کوئی نئیں سی آنا، میں اونہوں جھوٹ کہا کہ خوشی محمد آجاوے گا تے، اونوں تیل لا دیوے گا، اس نمانے نوں غصہ تے چڑھنا ہی سی۔"

"آپ نے اس سے یہ جھوٹ کیوں بولا ماں جی؟" لڑکی جو اب تک اس کے سامنے کچے فرش پر گھٹنے موڑ کر ان پر سر رکھے بیٹھی خاموشی سے سن رہی تھی، بولی۔

"وہ جس طرح گڈی دا ہرن (ہارن) بجا رہا تھا اور تیل والی سوئی وکھدا نئیں سی، او بس تو ں ہی مینوں پتا چل گیا

سی کہ اے وچارہ بڑے غصے وچ اے تے ایس غصے وچ اپنا ای نقصان کرن چلا اے۔"

"آپ والی اللہ تھیں کیا جو آپ کو پتا چل گیا تھا؟" لڑکا بولا۔

"توبہ توبہ!" نور فاطمہ نے ایک مرتبہ پھر کانوں کو ہاتھ لگایا "میں تے بڑی گناہ گار آں' میری کی مجال میں ولی اللہ بن جاواں' میرے اجیے ہتھے نصیب کتھے۔"

"پھر کیسے پتا چلا آپ کو۔"

"میرے بچے جب ایک ایک کر کے مر گئے تے چوہدریاں نے پرچہ بے گیا' او دتوں دا میتوں بادا ے میں وی غصے وچ آ تا بہا غفرا بن گئی تے چوہدری دی شکل تاں میں سوچیا تاں چوہدریاں' بعد وچ کج تھ میرے آباں چوہدریاں دے 'آنے باباں گنیاں تے نقصان اپنا ای ہو یا سی۔ ایس واسطے میتوں اس جوان دا غصہ دیکھ کے پتا چل گیا کہ اسو را ہو گیا ہے' انہوں کلی وچ بٹھا کے ٹھنڈا پانی پلا واں نے بہت پیار دیاں دو گلاں وچ اج دی رات انہوں وی کھلا رلواں' تاکہ کج غصہ لتھ جائے۔"

"پھر اس کا غصہ اتر گیا کیا؟" لڑکی نے سوال کیا۔

☼ ☼ ☼

"میرے پاس ایسا کہنے کی دو وجوہات ہیں' اگرچہ کوئی دوسرا انسان ان سے متفق نہیں ہوگا۔" افزا نے کہنا شروع کیا۔

"رکیں بی بی! ذرا ٹھہریں۔" رابعہ کلثوم نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ اپنے برقع کی ٹوپی اٹھا کر انہوں نے چہرے پر دوپٹے سے نقاب کر رکھا تھا۔

"مجھے بچے والی اس ساری داستان پر ہی شک ہے' اس شخص کا" انہوں نے بلال سلطان کی طرف اشارہ کیا۔ "میری بہنوں جیسی سہیلی سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا تھا' اس کو پلائے جانے والے زہر نے اس کا چہرہ بگاڑ دیا' اس کے بعد یہ شخص اپنا بچہ لے کر اسے بے چارگی کی حالت میں چھوڑ کر فرار ہو گیا' وہ بے چاری کشیدہ کاریاں کر کے اور بچوں کو ناظرہ قرآن کی تعلیم دے کر گزارہ کر رہی تھی' پھر وہ اس کا بچہ کیسے پیدا کر سکتی تھی' یہ کہانی جھوٹ ہے' سراسر بے سروپا۔ میری اس بات کے گواہ مولوی سراج سرفراز ہیں۔"

انہوں نے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔

"جو کچھ یہاں بیان ہو رہا ہے۔ اسے سن کر میرے تو کان خود پر یقین نہیں کر پا رہے۔" مولوی سراج نے کہا۔ "میری تو عقل ویسے بھی کم کام کرتی ہے' اگر وہ سب ہو گیا تھا جو چوہدری صاحب اور یہ بیگم صاحبہ سنا رہی ہیں تو پھر یہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔"

"اب اس الزام کا جواب صرف آپ دے سکتے ہیں بلال صاحب! بولیے!" چوہدری سردار نے بلال سلطان کی طرف دیکھا اور بری طرح چونک گئے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

مصباح علی

کہسار اس کے نقش پا سے فضاؤں میں اس کا ترنم بکھرا تھا۔ اس کی آواز میں زندگی تھی۔ کسی ایسے پنچھی کی طرح جو مست پروا کو سنگ لیے نغمے گگن میں آزاد تیرتا ہو۔ فضاؤں میں اڑے تو اس کی پرواز سب سے منفرد اور جب پر سمیٹے دھرتی پر اترے تو شکاری کو مبہوت کرے۔ شکاری کے لیے ایسے پنچھی کا شکار قابل فخر تھا۔ وہ گھات لیے جھاڑیوں کی اوٹ میں تھا۔ لیکن اسے تو گھات کی ضرورت نہیں تھی۔

صرف لفظوں کا طلسم اس پر چل سکتا تھا۔ کیونکہ وہ مصنف نازک تھی۔

وہ بظاہر معمولی شکل و صورت کی مالک تھی لیکن اس کے لب و لہجے میں سحر بھرا تھا۔ گفتگو کے دوران صرف ایک سانس بھرنے میں ہی کتنے اسرار چھپے تھے۔ وہ ایف ایم کی مشہور و معروف آر جے تھی۔ اس کے دو گھنٹے کے مقبول ترین پروگرام میں سینکڑوں کالز آتی تھیں۔ لوگ طویل گفتگو کرنا چاہتے۔ وہ مشکل سے ہی چند آن ایر کر پاتی۔ مگر اس کی کال۔۔۔ اس کی کال کو کبھی مس نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ پروگرام کے علاوہ بھی اس سے رابطے میں رہتا تھا۔ آج بھی وہ پروگرام سے واپسی پر گھر جا رہی تھی اور وہ آن لائن تھا۔

"میم! میں حیران ہوں آپ کو ابھی تک کسی نے مشورہ نہیں دیا۔ پلیز! ایک بار صرف ایک بار ٹرائی تو کریں۔"

"آپ کیوں مجھے خوش فہمی میں مبتلا کرنے پر تلے ہیں۔" اس کی آواز میں کھنکھناہٹ تھی۔ "جناب میں صرف بول سکتی ہوں' لکھنا ایک مشکل کام ہے۔"

"مشکل ہے ناممکن تو نہیں۔" وہ تڑپا۔ تڑپ گیا تھا۔ "جب آپ لکھ سکتی ہیں تو پھر لکھیں۔۔۔ بلکہ آپ لکھیں گی' آج اور ابھی جا کر لکھیں گی۔" وہ آواز میں وزن پیدا کر کے بولا۔

"اچھی۔۔۔" وہ کھنکی ہنسی بھی تھی۔ "ابھی تو جناب میں تھکی ہوئی ہوں' یقیناً گھر جا کر آرام کروں گی۔" آرام کا تو صرف اس نے ارسل کو ٹالنے کے لیے کہا تھا۔

اس نے گھر جا کر آرام نہیں کیا تھا۔ آج وہ اپنے قلم کا جادو آزمانے بیٹھی تھی۔ وہ رات گئے تک لکھتی رہی' بہت کچھ لکھ ڈالا تھا۔

مرحا چار سال سے ایف ایم پر بطور آر جے کام کر رہی تھی۔ ارسل سے اس کا تعارف ابتدائی دنوں کی ایک کال کے ذریعے ہوا تھا۔ اس نے مرحا کے پروگرام کو بھرپور سراہا تھا۔ پھر یہ کئی معمول میں شمار ہونے لگی۔ ارسل کے انداز گفتگو پر اور بہت سی کالز آنے لگیں۔ یوں یہ سلسلہ اس کے پروگرام کی مقبولیت کا سبب بنا۔ یہ مقبولیت اتنی بڑھی کہ اسے دوسرے چینلز سے بہترین آفرز آنے لگیں۔ جب ارسل نے اسے ناول نگاری کا مشورہ دیا۔ وہ اس کے بہترین بلکہ قریب ترین دوستوں میں شامل ہو گیا تھا۔

ان کا رابطہ صرف ٹیلی فون تک نہیں رہا تھا۔ بلکہ ایک دوسرے سے کئی بار مل بھی چکے تھے۔ پہلی اتفاقیہ ملاقات ایک سیاسی جلسے میں ہوئی' جہاں مرحا کو بطور کمپیئر دعوت دی گئی تھی۔ اس کے بعد پبلک لائبریری اور پھر باقاعدہ طے شدہ ملاقات ہوتی رہتی جو گھنٹوں گفتگو پر محیط ہوتی۔ ارسل کا بھرپور اصرار تھا کہ اس میں بہترین مصنف چھپا ہے۔ اسے سامنے آنا چاہیے۔ اس کے بھرپور اعتماد و اصرار پر اس نے خود کو آزمایا اور ایک چھوٹا سا افسانہ لکھ کر شائع ہونے بھجوایا۔ جواب معذرت کے ساتھ وصول ہوا۔ رد ہونے کے احساسات سے وہ خاصی ٹوٹی تھی۔ مگر حوصلہ بڑھانے کے لیے شیشہ گر موجود تھا۔

"آپ دلبرداشتہ نہ ہوں یار شروع میں ایسا ہوتا ہے۔ آپ لکھیں اور لکھیں' کبھار ضرور آئے گا۔ آپ نے ہار نہیں ماننی۔"

ہر مسودے کی معذرت پر وہ اسے خوش فہمی کے آئینے میں اتار دیتا تھا۔ اس کا حوصلہ بڑھتا گیا۔ وہ مسلسل لکھ رہی تھی کہ سراہنے والا ایک ہی کافی تھا۔ وہ لکھنے میں اتنی مگن ہو گئی کہ گرد و پیش سے بیگانہ ہو گئی۔ اس کے معمولات میں فرق آیا۔ مگر اسے کچھ محسوس نہ ہوا۔ مسلسل رد ہونے نے اس میں ضد بھر دی۔

اس میں شدت آنے لگی۔ وہ ارسل کے پر زور اصرار پر چھوٹے چھوٹے خیالات کو طویل کہانی کی شکل دینے لگی۔ وقت کی قلت رکاوٹ بنی تو اس نے ایک ایک کر کے ایف ایم کے پروگرام چھوڑ دیے۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اس کے سسرال والے خاص کر منگیتر مزید انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر مرحا کا ایک ہی انکار۔

"نہیں ابھی نہیں۔ آپ انہیں ٹال دیں' مجھے پہلے اپنا ناول مکمل کرنا ہے۔"

اس کتاب کو مکمل کرنے کے لیے اس نے بہت محنت کی تھی۔ جہاں قدم ڈگمگاتے تو وہ خوش فہمی کی لکیر کو اپنے چند جملوں سے مزید گہرا کر دیتا۔ وہ آنکھیں بند کیے اس کے لفظوں کے حصار میں جکڑی جا رہی تھی۔ وہ اس کے سنگ درخشاں مستقبل کی پلاننگ کرتا' نیلے فلک سے اونچی اڑان دکھاتا اور وہ خود کو تیرتا محسوس کرتی۔ وہ ایک کرپشن آفیسر کے ساتھ شاعر بھی تو تھا' کسی کے روپ پر تصنیف لکھنا اس کا کاروبار بھی تھا اور فن بھی۔ اس کا فن مرجانے کے خوابوں میں مکمل کیا تھا۔ وہ مسودہ اس کی تین سالہ محنت تھا۔ وہ کئی پبلشرز کے پاس لے کر گئی۔ مگر سب نے اسے بیچنے کا زیاں کہہ کر معذرت کرلی۔ وہ تقریب با تکمیل ہونے کو تھی' مگر حوصلہ دینے کو وہ صورت گری کافی تھا۔

"مرجانے! آپ حوصلہ مت ہاریں' اس میں کچھ ردوبدل کرکے دوبارہ لکھیں۔ بلکہ ایسا کریں بس۔" وہ کچھ رک کر بولا۔ "آپ کسی نئے موضوع پر کچھ نیا لکھیں۔ یہ محبت وحبت تو پرانی باتیں ہو گئیں۔"

"کیا مطلب کیا پرانی باتیں' دنیا وہی ہے' وہی یقرار حوا' آدم' وہی ساتھ کی خواہش' وہی مسائل' جذبات و ضروریات' احساسات' پھر کیا نیا اور کیا پرانا۔" وہ جھنجلا گئی۔

"سوری میم! آپ تو خاصی مایوس نظر آ رہی ہیں۔ آپ یقین رکھیں' ضرور کامیاب ہوں گی۔ ایک بار پھر کوشش کریں۔" اس کے نخرے لہجے کی ہی پھوار تھی جو اس کے دل کو تازہ دم کردیتی' وہ پھر سے اپنا آپ جلا کر رہ جاتی۔ کچھ ہی عرصے میں وہ اسی مسودے میں تھوڑی سی ردوبدل کروائی تھی۔

وہ آج اس کے آفس کی طرف نکلی تھی' تاکہ مسودہ اسے بطور تحفہ دے۔ راستے میں اس نے ایف ایم آن کرلیا۔ اس نے ایک عرصے بعد ایف ایم آن کیا تھا۔ شاید' لمبے عرصے کی ذہنی تھکن کے بعد آج وہ کچھ ریلیکس تھی۔ چینل پر کوئی کال چل رہی تھی۔ کوئی زندہ دل قہقہہ تھا۔ وہ یہ قہقہہ پوری دنیا میں پہچان سکتی تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ محترمہ! آپ بہترین اداکاری کرسکتی ہیں' بلیو بی' آپ کی آواز سے ایک بہترین اداکارہ کی شبیہ بنتی ہے۔ آپ کو اپنا ٹیلنٹ ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

"نہیں عثمان صاحب! میں صرف بول سکتی ہوں' مجھ میں اداکاری کی صلاحیت نہیں۔" اس نے تردید کی۔

"آپ خود اپنی صلاحیتوں سے آگاہ نہیں' ایک بار کوشش کرکے تو دیکھیں۔" وہ بضد تھا۔

"عثمان صاحب آج سے کئی سال پہلے ہماری ایک کامیاب ٹیچر کو کسی نے لائر بننے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے ٹیچنگ چھوڑ کر لاء کیا اور کئی سالوں سے کورٹ کچہری کے دھکے کھا رہی ہیں۔ شاید آج تک ایک کیس بھی نہ جیتا ہو۔ بلکہ اکثر اوقات وہ کلائنٹ دیتے ہوئے وہ رو پڑتی ہیں۔ اتنی سینسیٹو ہیں وہ۔ جانے کس کی باتوں میں آکر انہوں نے اپنا کیریئر چھوڑ دیا۔ مگر میں اپنی صلاحیتوں سے خوب واقف ہوں اور ویسے بھی میں یہ جاب گنوانا نہیں چاہتی' کیونکہ میں اس

وقت ایف ایم کی پیک پر ہوں۔" اس نے پروفیشنل قہقہہ اچھالا۔ "ویسے" اس نے لفظ کو خوب کھینچا۔ "لوگوں کو خوش فہمی میں مبتلا کرنا آپ کا مشغلہ تو نہیں؟"

"کیسی بات کررہی ہیں آپ۔ بلیو می میم! میں زندگی میں پہلی بار کسی کی گفتگو سے متاثر ہوا ہوں۔ آپ کوشش تو کریں۔" اسے اپنے انداز پر اعتماد تھا۔

"بس مجھے۔ میں کسی کی باتوں میں نہیں آتی' صرف اپنے دماغ کی مانتی ہوں۔" وہ اپنے کھنکتے لہجے میں بولی۔

"ہاہاہا۔" بھرپور قہقہہ ہوا کے دوش پر ابھرا تھا۔ "عورت اور دماغ کی مانتی ہو' امپوسبل ہے۔ لیکن آپ تو خاصی عقل مند لگتی ہیں۔" وہ مسلسل ہنس رہا تھا۔

"ویسے یہ آپ تھے بے وقوف کس چکر میں بنا رہے تھے۔" آر جے رودابہ اس کی فطرت سمجھ گئی تھی۔

"فول صرف اپریل میں ہی تو نہیں منایا جاتا۔" اس کا پھر قہقہہ ابھرا تھا۔ "بے وقوف بنانے میں کتنا مزہ آتا ہے' کبھی آزما کر دیکھیے گا۔ ذرا سی تعریف سے خود کو ہواؤں میں اڑتا دیکھنا ہے' پروں کی طاقت جانے بغیر۔"

اس کے قہقہے مرحا کی روح کھینچ رہے تھے۔ آواز' انداز وہی تھا' مگر وہ نام بدل کر بات کررہا تھا۔ وہ لب بھینچے لمبے سانس لینے لگی۔ آنکھوں میں گزشتہ تین سال کی تھکن تھی۔ اس کی گفتگو مرحا کے لیے اعصاب شکن ضرور تھی' مگر اس کے مسلسل لکھنے کا جنونی انداز اور متواتر رد ہونے سے وہ ایک لکھاری کی طرح اعصابی طور پر بہت مضبوط ہو گئی تھی۔ وہ ذہنی طور پر ہر وقت معذرت' رد' انکار جیسے حوصلہ شکن الفاظ کے لیے تیار رہتی تھی' اس لیے بلال آنکھوں کی حد سے باہر نکلا تھا۔

"یعنی وہ تعریفیں کرکے تھے بے وقوف بنا رہا۔ اس کی باتوں نے تھے کر روپیش بنا دیا' میں بھی کیریئر کے عروج پر تھی' مگر اس نے تھے بیکار کردیا' جنون بھر دیا۔ اس کا تعلق اسی کیٹیگری سے ہے' جو تھن انجوائے منٹ کے لیے دوسروں کو ان کی راہ سے بھٹکا دیتے ہیں۔ صرف لہجے اور الفاظ کے طلسم سے۔" اس نے سر جھٹک کر اپنی سوچوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔

اس نے اپنی گاڑی اس کے آفس کے سامنے لاک کی اور بھرپور اعتماد سے چلتی ہوئی اس ڈور تکلیل کرا اندر داخل ہوئی۔ بے شک اندر سے وہ بری طرح ٹوٹ چکی تھی۔ مگر عورت کی بڑی خوبی کہ اپنے ٹوٹے دل کے ٹکڑے چھپا کر متقابل کے سامنے فولاد بن جانا کے مصداق اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ پہلے حیران' پھر پوشہ کی طرح اترا' کھڑا ہوا' وہ بھی اس کے مقابل کھڑی تھی۔

"مسٹر ارسل یا عثمان آپ کی تھوڑی سی انجوائے منٹ سے میرا فائدہ ہو گیا' آپ کے مذاق سے میری بہترین صلاحیت سامنے آگئی۔ اس بے وقوف کا مسودہ۔" وہ بے وقوف خاصا چبا کر بولی۔

"ایک نامور پبلشر نے اشاعت کے لیے لے لیا ہے اور نہ صرف اشاعت بلکہ پہلی سو جلد وہ خود خریدے گا۔ یہ اگریمنٹ ہو چکا ہے اور مسودے کی ایک کاپی میں آپ کے لیے بطور تحفہ لائی ہوں۔ تھینک یو۔ آپ نے میری خفیہ صلاحیت کو اجاگر کرنے میں میری مدد کی۔"

اس نے دانت جما کر طنز کیا اور اپنا ہاتھ ہینڈ بیگ میں ڈالتے ہوئے ایک فائل باہر نکالی اور شیشے کی میز پر اس کے سامنے جتانے والے انداز میں رکھی۔ مرحا آنکھیں سکیڑے ایک طنزیہ نظر ارسل پر ڈال کر مڑی۔

"اور ہاں۔" اس نے خفیف سا گردن کو خم دیا اور بھنویں اچکا کر بولی۔

"میری اگلے ماہ شادی ہے' ضرور تشریف لایے گا' میں کارڈ بھجوا دوں گی۔"

وہ گم صم آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے گیا۔ غالباً" اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ بچا نہ تھا اور وہ بھی کارڈ کا کہہ کر اس کے حیران کن تاثرات دیکھنے کے لیے رکی نہ تھی۔

☆

کینیڈا سے آنے کے بعد میں پہلی بار اپنی پرانی سہیلیوں سے ملی۔ ہم سب شام کے وقت حفصہ کے گھر کے لان میں چائے پیتے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ میں چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے باتیں کرتی اپنی سہیلیوں کے چہرے باری باری دیکھ رہی تھی۔ ان سب میں گزشتہ سالوں میں بہت تبدیلیاں آئی تھیں۔ تبدیلیاں تو مجھ میں بھی بہت آئی تھیں۔ شاید ان سب سے زیادہ۔ نادیہ کا وزن پہلے زیادہ ہوا کرتا تھا اب وہ پہلے کی نسبت بہت دبلی ہو گئی تھی۔ دو ماہ بعد اس کی شادی ہونے والی تھی' چند ماہ پہلے اس کا نکاح اس کے تایا کے بیٹے سے ہو چکا تھا۔ میرے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ میں نے سدرہ کو دیکھا' ایک بیٹے کی پیدائش کے بعد وہ بہت موٹی ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ اب گول لگنے لگا تھا۔ فریحہ کے کپڑے پہلے سے زیادہ قیمتی اور خوب صورت تھے۔ وہ آج کل نوکری کر رہی تھی اور حفصہ جو ہم سب میں سب سے پیاری تھی' ظاہر اور باطن دونوں لحاظ سے۔ اس کی شادی کو چار سال ہو گئے تھے وہ ایک بچی کی ماں تھی۔

"باہر جا کر تم بہت بدل گئی ہو عرشہ۔" حفصہ نے

عدل شاد

اچانک مجھے مخاطب کیا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"واقعی اچھی تبدیلی ہے یا بری؟" میں نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔ حفصہ کالج کے زمانے سے میری بہترین دوست رہی تھی۔ اس سے بہتر کوئی مجھے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر تبدیلی مثبت ہے اور اگر منفی ہے تب بھی وہ جھوٹ نہیں بولے گی۔ ہماری دوستی ہی ایسی تھی۔

"اچھی۔۔۔ تم پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو۔" اس نے کہا۔ میری باقی سہیلیوں نے تائید کی۔ مجھے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ تمہاری اسکن بہت گلو کر رہی ہے۔" فریحہ نے کہا۔

"فریش لگ رہی ہو۔" سدرہ بولی۔

وہ بھی سوچ رہی ہوں گی کہ میرے ساتھ ہونے والے "سانحے" کے بعد میں کیسے اتنی خوب صورت اور "فریش" لگ رہی ہوں۔ گو کہ انہوں نے ایسی کسی سوچ کا اظہار نہیں کیا۔

"تم پاکستان کب آئی تھیں؟" سدرہ نے پوچھا۔

"تین مہینے ہوگئے ہیں تقریباً۔ چدرہ تاریخ کو آئی تھی۔" میں نے بتایا۔

"اور ہم سے اب ملنے آئی ہو؟ مجھے پتا ہوتا کہ تم آئی ہو تو اسی وقت تم سے ملنے آجاتی۔ تم نے اتنے دن فون بھی نہیں کیا۔" حفصہ نے شکوہ کیا۔ اس کا شکوہ بھی بجا تھا۔ وہ میری بہترین دوست تھی اور میں نے اس سے رابطہ تک نہ کیا تھا۔

"بس ان دنوں وقت نہیں ملا۔ حالات کچھ ایسے ہوگئے تھے۔" میں نے کہا۔ میری سہیلیاں خاموش رہیں، پھر حفصہ بولی۔

"تمہارے بارے میں سنا تو بہت افسوس ہوا۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گویا مجھے حوصلہ دیا۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے چند دن پہلے معلوم ہوا۔ مجھے بہت دکھ ہوا کہ تمہارے ساتھ ایسا ہوا ہے۔" ثانیہ نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ سدرہ اور فریحہ نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔ ان سب کی آنکھوں میں میرے لیے نرمی اور ہمدردی تھی۔ میں ان کو بتانا چاہتی تھی کہ میں اپنی تکلیف میں نہیں ہوں، جتنا وہ سمجھ رہی ہیں۔ جو ہوتا ہے، اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ مگر میں نے خاموش رہنے اور فقط سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"لیکن ایسا ہوا کیوں؟" فریحہ نے پوچھا۔ میں نے لمحہ بھر کو سوچا کہ اسے کیا جواب دوں۔ پھر میں نے اسے وہی جواب دیا جو گزشتہ تین ہفتوں سے سب کو دے رہی تھی۔

"میں فی الحال اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔"

انہوں نے میری بات کا برا نہیں مانا۔ وہ کسی نئے موضوع پر بات کر رہی تھیں۔ مگر میرا دھیان ایک بار پھر کہیں اور تھا۔ مجھے ایسا کرنے پر افسوس تھا، مگر میرے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ سب اپنی مصروف زندگیوں سے وقت نکال کر صرف میری خاطر حفصہ کے گھر جمع ہوئی تھیں اور میں ان کی باتیں بھی ٹھیک سے نہیں سن رہی تھی۔

میں حال میں واپس تب آئی جب کچھ دیر بعد فریحہ کو اس کا بھائی لینے آگیا۔ پیچھے میں، حفصہ، سدرہ اور ثانیہ رہ گئے۔

"معید بھائی ٹھیک ہیں؟" سدرہ نے حفصہ سے پوچھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کا لہجہ معنی خیز لگا۔

"ہاں... اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ٹھاک ہیں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ اپنے شوہر کے بارے میں وہ ہمیشہ بہت خوشی اور پیار سے بات کرتی تھی۔ مجھے اس کا یوں اپنے شوہر کے بارے میں بات کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کے حالات میرے حالات سے مختلف تھے۔

"تمہارا خیال رکھتے ہیں؟" سدرہ پوچھ رہی تھی۔

"بہت... ان کی نیچر ہی ایسی ہے۔ میرا اور منی کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں۔ بس آج کل ذرا مصروف رہتے ہیں۔ ان کی پروموشن ہوئی ہے نا ماشاء اللہ۔" اپنے شوہر کے بارے میں بتاتے ہوئے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اس کی بات مکمل ہونے پر میں نے کہا۔

"او یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مبارک ہو بہت بہت۔" "تھینک یو" وہ مسکرائی اور بولی۔ "تھینک یو۔"

مگر ساتھ ہی میں نے سدرہ اور ثانیہ کو معنی خیز نظروں کا تبادلہ خیال کرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے احساس ہوا کہ کوئی بات تھی جو انہیں معلوم تھی اور مجھے معلوم نہ تھی۔

"حفصہ! میں نے ایک بات سنی ہے۔" سدرہ ہچکچا کر بولی۔ مجھے اس کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ اس کے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔

"کیا؟" حفصہ نے پوچھا۔

"تم میری بات کا برا مت ماننا۔ مجھے کہیں سے یہ بات پتا چلی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں نے جو سنا

ہے وہ غلط ہو۔ لیکن بس..." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے کن انکھیوں سے نانیہ کو دیکھا۔

"ایسی کون سی بات ہے سدرہ جو تم مجھ سے نہیں کہہ پا رہی ہو۔ بولو بھی۔" حفصہ نے ہنس کر کہا۔

"فہد بھائی کا کسی لڑکی کے ساتھ چکر ہے۔" اس نے کہا۔ حفصہ نے لمحہ بھر کے لیے اسے گھورا' پھر بولی "مذاق کر رہی ہو؟"

"نہیں مذاق نہیں کر رہی۔" حفصہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جیسے اسے سدرہ کی بات پر یقین نہ ہو۔

"اچھا... لو میں ڈر گئی' اب بس کرو۔" وہ غیر سنجیدگی سے بولی۔

"سدرہ مذاق نہیں کر رہی حفصہ۔" نانیہ بولی' حفصہ نے ان دونوں کے تاثرات دیکھے جیسے فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ وہ واقعی سنجیدہ ہیں یا نہیں۔ ان کے چہروں پر شرارت کی رمق نہ تھی۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے؟" اس نے نانیہ سے پوچھا۔ "احسن نے بتایا تھا... کہ فہد بھائی کے آفس میں کوئی لڑکی آئی ہے اور کبھی وہ اس کے ساتھ باہر چلے جاتے ہیں۔" نانیہ بولی' احسن اس کے تایا کا بیٹا اور منگیتر تھا۔ جو اس کمپنی میں کام کر رہا تھا۔ جہاں حفصہ کا شوہر کام کرتا تھا۔

"تو؟ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان کا اس سے افیئر ہو۔" حفصہ خفگی سے بولی۔ "کوئی آفیشل کام بھی ہو سکتا ہے۔"

"اس کا آفس کے کسی کام سے کوئی تعلق نہیں ہے حفصہ۔" نانیہ نے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر اس کی کوشش لاحاصل نظر آ رہی تھی۔

"تو شاید وہ کوئی رشتہ دار ہو' یا اسے کوئی کام ہو' آنی کزنز ہیں فہد کی۔" حفصہ کے لہجے میں خفگی بڑھ رہی تھی۔

"کزنز یوں تو نہیں آتیں آفس میں' اور نہ ہی یوں روز روز باہر جا کر سیر کرتی ہیں۔ تم خود بتاؤ کیا فہد بھائی کی کوئی ایسی کزن ہے؟" نانیہ بولی۔

حفصہ خاموش ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مگر اسے اب بھی نانیہ کی بات پر یقین نہ آ رہا تھا۔

"لوگ بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔" اس نے دلیل دی۔

"لیکن حفصہ... ان کے سارے آفس میں یہ بات مشہور ہے۔ جو بات سب کی زبان پر ہو وہ غلط نہیں ہوتی۔ زبان خلق نقارہ خدا ہوتی ہے۔" نانیہ نے جواباً دلیل دے کر سمجھانے کی کوشش کی۔ حفصہ خاموش ہو گئی۔ اس کے تاثرات سے اس کے احساسات کا اندازہ لگانا ممکن نہ تھا۔ "ہم تمہیں فہد بھائی سے بدگمان نہیں کر رہے۔ ہم تمہیں بتا رہے ہیں' تاکہ تم دھیان رکھو۔ مرد ذات اعتبار کے قابل نہیں ہوتی۔" سدرہ نے سمجھایا۔ حفصہ اب بھی خاموش تھی اور اس کے چہرے پر کوئی واضح تاثر نہ تھا۔ کچھ دیر بعد سدرہ نے اپنی گھڑی دیکھی۔

"اب مجھے جانا ہے... پھر اندھیرا ہو جائے گا تو میرے لیے ڈرائیو کرنا مشکل ہو جائے گا۔" نانیہ کو بھی اس نے اپنی گاڑی پر گھر چھوڑنا تھا۔

"ارے کچھ دیر تو رکو نا۔" حفصہ نے اصرار کیا۔

"دیکھو عرشیہ اتنے عرصہ بعد پاکستان آئی ہے۔ زیادہ وقت ساتھ گزار لیتے۔" جواباً سدرہ نے اپنے شوہر' بچے اور گھر سے منسلک وجوہات بیان کیں اور بالآخر وہ اور نانیہ رخصت ہونے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

"تم اور تمہاری بیسٹ فرینڈ کچھ وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارو۔" سدرہ نے میری اور حفصہ کی مشہور قریبی دوستی کی طرف اشارہ کیا۔

ان کے جانے کے بعد ہم دونوں لان میں تنہا رہ گئے۔ سورج کی روشنی بہت کم ہو چکی تھی۔ حفصہ کسی سوچ میں گم تھی۔ میں کسی حد تک اس کا مسئلہ سمجھتی تھی۔ مجھ سے بہتر سب کون سمجھ سکتا تھا؟

"تمہیں سدرہ اور نانیہ کی بات پر یقین ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" حفصہ نے مسکرا کر سر نفی میں ہلایا۔
"مگر جس طرح وہ بنا رہی تھیں کہ احسن بھائی اور ان کے کولیگز یہ بات نوٹ کرتے ہیں۔ تمہیں نہیں لگتا کہ واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا عریشہ! میں فہد کو نہیں جانتی۔ وہ ایسے نہیں تھا۔ میں ان سے کسی اور بات کی توقع تو شاید کر سکوں، مگر وہ مجھے جھوٹ نہیں کہہ سکتے۔" اس نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

میرے سامنے میرے ماضی کے کتنے ہی لمحے گھوم گئے۔ "انسان کے بارے میں کوئی یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ ایسے لوگ بے وفائی کرتے ہیں جن سے آپ کبھی بھی ایسی توقع نہیں کر سکتے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ میرے لہجے کی گہرائی پر اس نے سر اٹھا کر غور سے مجھے دیکھا۔ پھر اس نے پوچھا۔
"کیا تمہارے ساتھ ایسا ہوا تھا؟"

مجھے اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر اپنے لیے بے پناہ ہمدردی نظر آئی۔ اس نے دھیرے سے پوچھا۔ "کیا اس لیے تمہاری منگنی ٹوٹی ہے؟"
میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ مجھے اس بارے میں بات کرتے ہوئے تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ کسی کو اس بارے میں کچھ بتایا تھا۔
"ہاں۔" وہ جواب میں کچھ نہیں بولی۔ بس ہمدردی سے مجھے دیکھتی رہی۔ تین مہینے پہلے میری منگنی کا ٹوٹنا... اور پھر میرا فوراً" وہاں سے پڑھائی چھوڑ کر ملک واپس آنا... اس سب کے بعد سب کو میری تکلیف کا احساس تھا۔
"اتنی دھوم دھام سے تمہاری منگنی ہوئی تھی۔" اس نے افسوس سے کہا۔
"لیکن اگر اس نے تمہارے ساتھ ایسا کیا ہے تو وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا۔ بہت اچھا ہوا کہ شادی سے پہلے ہی تمہیں اس کی اصلیت معلوم ہو گئی۔"
"ہاں... مگر تمہاری شادی ہو چکی ہے اور اگر فہد بھائی ایسا کر رہے ہیں تو..." میں خاموش ہو گئی۔
"فکر مت کرو میری جان! میں جانتی ہوں تمہیں فکر ہے کہ جب آپ کے ساتھ ایک مرتبہ برا ہوا ہو تو آپ ہر رشتے سے ڈرنے لگتے ہیں۔ مگر یہ فہد ہیں۔ تم خود جانتی ہو کہ وہ میرے اور میری بیٹی کے ساتھ کتنے اچھے ہیں اور پھر میں ان کی بچی کی ماں ہوں۔" وہ مجھے بہت بے وقوف لگی۔ اس کی باتیں بچکانہ تھیں۔
"وہ تم سے پیار کرتے ہیں؟"
"ہاں... وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔"
"تو وہ لڑکی؟ جو ان کے آفس میں آئی ہے؟" وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ مگر مجھے پروا نہیں تھی۔ میں جاننا چاہتی تھی۔ مجھے معاملے کی سنگینی کا اندازہ تھا۔

"مجھے اندازہ ہے وہ کون ہے۔ ان کی ایک پرانی کولیگ تھی جس سے ان کی اچھی بات چیت تھی۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی تو منہ دکھائی کا تحفہ انہوں نے اس کی پسند سے خرید کر دیا تھا۔ تمہیں تو پتا ہے ان کی کوئی بہن نہیں ہے اور ابھی ہماری شادی کی سالگرہ آ رہی ہے۔ میں نے ان کے بریف کیس میں ایک انگوٹھی دیکھی تھی۔"

"ہاں... ڈائمنڈ کی انگوٹھی عریشہ۔ اتنی خوب صورت ہے کہ بس۔ تم دیکھنا شادی کی سالگرہ پر وہ یہاں ہو گی۔" اس نے ہنس کر اپنا ہاتھ لہرایا۔ "مجھے لگتا ہے کہ وہ انہوں نے اس کی پسند سے میرے لیے خریدی ہو گی۔ ان کی اپنی پسند اچھی نہیں ہے اس معاملے میں۔"
میں خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ مزید بولی۔
"میرے پاس بھی ان کے لیے ایک تحفہ ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔ اس کے گال سرخ تھے۔
"کیا...؟"
وہ آگے کو جھکی اور رازداری سے بولی۔ "ہمارا دوسرا بچہ آنے والا ہے۔"
میں نے ایک تیز سانس اندر کو کھینچا اور بولی۔
"مبارک ہو۔"

"کسی سے ذکر نہ کرنا۔ بس تمہیں بتایا ہے۔" وہ بولی۔ پھر اس نے کہا۔

"لوگوں کا کام ہے باتیں بنانا۔ ذرا سی بات ہو تو کہانیاں گھڑ لیتے ہیں۔"

"ہاں۔ مگر۔ کبھی کبھی ایسی کہانیاں سچ بھی ہو جاتی ہیں۔ جو ہم نہیں سوچتے وہ ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ میرا ماضی اس بات کی گواہی تھا۔ مگر وہ نہیں سمجھی۔ نہ سمجھی ہی تھی۔

"اس کا مطلب یہ تو نہیں نا کہ ہم شک کریں۔ دیکھو عریشہ تمہارے آگے زندگی پڑی ہے۔ ایک انسان کے پیچھے تم اپنی زندگی خراب نہیں کر سکتیں۔ تمہاری شادی ہو گی پھر ان شاء اللہ تمہارا شوہر تم سے پیار کرے گا۔ پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ کیسا رشتہ ہے اور ہاں۔ اس پر اعتبار کرنا۔ ایک فضول آدمی کی وجہ سے اپنے آنے والے شوہر پر شک مت کرنا۔ اچھا۔۔؟" میں اثبات میں بھی سر نہ ہلا سکی۔ وہ میری باتوں کو میرے ماضی سے منسلک کر رہی تھی۔ وہ سمجھ کیوں نہیں رہی تھی کہ ایسا واقعی ہو جاتا ہے۔ میں اسے اپنے ماضی کی کہانیاں سنائی۔ بے وفائی کے قصے سنائی تو شاید۔ شاید وہ سمجھ سکتی کہ کیسے کوئی کسی کے لیے کسی اور کو چھوڑ دیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کی باتوں سے مجھے اپنی غلطیوں کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

"اب تم واپس کینیڈا جانا اور اپنی پڑھائی مکمل کر کے آنا۔ اپنی ساری محنت ایک شخص کے پیچھے کیوں برباد کر رہی ہو" وہ کہہ رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی۔ صرف محنت؟ میں تو بہت کچھ اس ایک شخص کے پیچھے برباد کر چکی ہوں اور مزید بہت کچھ برباد کرنے والی ہوں۔ مگر اس کی باتوں نے میرے اندر کچھ بدل دیا تھا۔ میں اب سمجھ سکتی تھی کہ میری چند غلطیوں نے میرے ساتھ ساتھ میرے کتنے ہی چاہنے والوں کو تکلیف دی تھی۔

ایک گھنٹے بعد میں اپنے گھر میں اپنے کمرے میں تھی۔ گزشتہ گھنٹوں کی تمام باتیں میرے کانوں میں کسی ریکارڈنگ کی طرح بار بار چل رہی تھیں۔ بظاہر میں کھڑکی سے باہر آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ در حقیقت میں فیصلہ کر رہی تھی۔

میں نے اپنا موبائل اٹھایا اور وہ نمبر ملایا جو مجھے ازبر تھا۔ جو مجھے اس شخص کی آواز سنانے والا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے کسی اور چیز کی پروا نہ رہی تھی۔

"ہیلو۔ عریشہ! میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔" مجھے اس کی پیار بھری خوب صورت آواز سنائی دی۔

"فہد!" میں نے اس کا نام لیا۔ میرا لہجہ ہمیشہ سے مختلف تھا۔ "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"کیا ہوا؟" اس نے میرے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کیا۔ "میں اب مزید آپ سے نہیں مل سکتی۔ میں یہ سلسلہ آج سے ختم کرتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو عریشہ! مجھے پتا تھا ایسا ہوگا۔ منع کیا تھا میں نے تمہیں حفصہ سے ملنے سے۔ بس یہی پیار تھا تمہارا؟" وہ غم و غصہ سے بولا۔

"بس یہی پیار؟" میں نے بے یقینی سے دہرایا۔ "میں نے اپنے منگیتر کو آپ کے لیے چھوڑا۔ اپنی پڑھائی چھوڑی۔ گھر والوں کو ناراض کیا۔ اپنی بہترین دوست کو دھوکا دیا۔"

"پھر۔۔؟ پھر کیوں چھوڑ رہی ہو مجھے؟" وہ گویا التجا کر رہا تھا۔ "حفصہ کو پتا چل گیا ہے کیا؟"

"فہد۔ میں نے ایسی عورت کبھی نہیں دیکھی۔ نہ میں ایسی ہوں نہ کوئی اور ایسا ہو سکتا ہے۔ جتنا حفصہ آپ پر اعتبار کرتی ہے کوئی نہیں کر سکتا۔ آپ کو اس کا اعتبار کبھی نہیں توڑنا چاہیے۔ میرے لیے تو کبھی نہیں۔ قدر کریں اس کی۔" میں نے کہا۔ میرے سامنے حفصہ کا چہرہ گھوم رہا تھا اور میں شرمندہ تھی۔ اسے میں نے یہ تو بتایا تھا کہ میرے ماضی میں بے وفائی تھی۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ بے وفائی میرے منگیتر نے نہیں میں نے کی تھی۔

فون بند کرنے سے پہلے میں نے آخری بات کی۔

"آئندہ مجھ سے ملنے یا مجھے کال کرنے کی کوشش مت کرنا۔" ویسے بھی چند روز تک میں کینیڈا واپس جا رہی تھی۔

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لندن کی جامع مسجد میں مؤذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرا ایک علی طالب عمر اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت کنجوس ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کر پارہا۔

عمر شہروز کا کزن ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت پر یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچے پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول

اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر سمجھ دار اور فیاض ذہین ہیں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

علی اصغر بابا اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈ پا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ ستارا اور اس کے پاس پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ اس مچھلی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ گرینڈ پا اور بابا وضاحت سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امائمہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہروز کو بتاتی ہے۔ شہروز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر امی سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والدین سن لیتے ہیں تو وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ اسے سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرا بند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی بات نہ کر سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امائمہ کی والدہ شہروز کو فون کرتی ہیں۔ شہروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔ جس کے بعد عمر کے والد امائمہ کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کروا دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امائمہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امائمہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امائمہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امائمہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امائمہ عمر اسے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ فضل الٰہی نے بھیجا ہے۔

روبی قطر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈپا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسٹر ایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی کے انکار پر بادر وہ کوہ کو بلوا لیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کر دیتی ہیں۔

میری کالج میں طلعت اور راشد سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

عمر اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتا دیتا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امائمہ کی خاطر دلچسپی لیتا ہے۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امائمہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کر پا رہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امائمہ کو گلے لگا کر مبارک باد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری۔ گھر جا کر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہ کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہ پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہ نے مسٹر ایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا نگران مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کر لیا اور کوہ نے مسٹر ایرک سے شادی کر لی۔

نور محمد احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار، عمدہ خوشبو، نفیس گفتگو، اعلا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔ اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صبا نور دین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبا نے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلعت اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنا لیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوبت مار پیٹ تک آ گئی۔

امائمہ اور عمر میں دوستی ہو گئی لیکن دونوں کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہ کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات جیتا راؤ سے ہوئی۔ وہ اب نیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگا دیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلعت کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلعت اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصوروار ٹھہراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو ہی مورد الزام ٹھہرا کر لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئرمین حسن حمید کو والی جنید اور طلعت کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کر دیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہو جاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی پھیرو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آ کر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ "وہ آج سے اس کے لیے مر چکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر جاتا۔ نور محمد احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتا رہا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بوجھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سمجھانا مشکل لگتا ہے۔

بلی نبا کو بے حد چاہتا ہے' لیکن وہ انتہائی خود غرض' مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔
بلی کے گھر فیملی فرینڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فوٹو گرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے نبا کو ملواتا ہے۔ نبا' عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کیمرے سے رقص کرتی نبا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور نبا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی' نبا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن نبا اس بات پہ بلی سے ناراض ہو جاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ نبا جیسی بناوٹی' خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔
بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو اور کے عوف سے تعلقات ہیں' زارا کے والدین زارا اور شہروز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں' جبکہ شہروز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے' کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کرلیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہروز' زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے کرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے زبردستی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال تحت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔

ساتویں قسط

اس کا سارا انہماک اپنے لیپ ٹاپ میں تھا۔ لفظ اس کے سامنے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر عاجزی سے جیسے بکھرے پڑے تھے۔ وہ جس قدر انہیں جتنا تھا اتنا ہی گم ہو جاتا تھا۔

"ایک دنیا تھی جو مکمل نہیں ہوئی تھی اور ایک وہ تھا جو کب سے مکمل تھا۔ اکملیت کی تلاش میں بھٹکتا انسان اپنے دل میں کیوں نہیں جھانکتا۔ وہ اندر کہیں مکمل نہیں ہے تو پھر باہر بھی اسے اکملیت نہیں ملے گی اور اگر وہ اندر کہیں مکمل ہے تو اسے باہر کی اکملیت کی ضرورت کیا ہے۔"

"واہ۔" اس نے بے ساختہ سراہا تھا۔ منہ میں جیسے چاشنی سی گھل گئی تھی۔ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے وہ کس قدر مطمئن انداز میں ایک نئے جہان کو تسخیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ صرف حرفوں سے گندھے لفظ نہیں تھے یہ کسی کی زندگی تھی اور ان میں زندگی کے جتنی ہی کشش تھی' اسرار تھا' لطف تھا۔ وہ جتنی پرتیں کھولتا تھا اتنا ہی سر دھنتا تھا۔ لفظ رنگ نہیں تھے کہ تصویر بن جاتے اور رنگ لفظ نہیں تھے کہ کتاب بن جاتے مگر لکھنے والے نے ایسے لکھا تھا کہ وہ رنگ اور لفظ دونوں کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ تصویر اور کتاب دونوں کا لطف لے رہا تھا۔ دل بوجھل تھا۔ مگر مضطرب نہیں تھا۔ اسے بہت پہلے سے یقین تھا کہ جب وہ ان رنگوں جیسے لفظوں کو ضرورت کھولنے میں کامیاب ہو جائے گا تو کچھ ایسا ضرور ہوگا جو اسے چونکا دے گا اور اب وہ ہر لفظ پر چونک رہا تھا۔ اسے اپنی کئی سالوں کی محنت وصول ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"ٹوں۔ ٹوں۔" سارا تسلسل جیسے سیل فون نے توڑ ڈالا ہو۔ اس نے ناپسندیدگی سے اس جانب دیکھا تھا۔ فون سائیڈ ٹیبل پر پڑا تھا۔ اس نے ناگواری سے فون اٹھایا تھا۔ ارادہ تھا صرف دیکھے گا کہ کال کرنے والا کون ہے اور گھنٹی بند کر کے دوبارہ سے اس سفر پر نکل جائے گا جہاں سے کھینچ کر اسے لایا گیا تھا لیکن چمکنے والا نام دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی جیسے چمکنے لگی تھیں۔

"ڈاکٹر زارا۔" اس نے بشاشت سے مسکراتے ہوئے گہری سانس بھری تھی۔ وہ اب فون سننے کے علاوہ کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا انہماک ختم ہو چکا تھا۔

اللہ نے دنیا میں کچھ لوگ بنائے ہی اس لیے ہیں کہ وہ آپ کے ارادوں کو سومنات کے مندروں کی طرح توڑتے پھوڑتے رہیں۔ سومنات کے مندروں نے بھی ٹوٹ جانے کے بعد اتنا سکون محسوس نہیں کیا ہوگا جتنا اس لمحہ وہ کر رہا تھا۔ اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے فائل کو بند کرنا شروع کیا تھا۔ لیپ ٹاپ کے ایک کارنر میں آج کی تاریخ نمایاں تھی۔

2012ء کا تیسرا مہینہ اور گیارہویں تاریخ تھی۔

لمحہ بھر میں بسا! صفحہ اسکرین پر چمکنے لگا' جس پر بڑا بڑا لکھا تھا۔

"عہد الست" اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا تھا۔

"اعداد ہماری زندگی میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ہمارا آنا' ہمارا جانا۔ یہاں اس دنیا میں قیام سب کچھ کہیں نہ کہیں ہندسوں کے تحت متعین کیا جاتا ہے۔ ہندسے ہمارے اردگرد بکھرے ہیں۔ اللہ ایک' منکر نکیر دو' ادوار تین' کتابیں چار' نمازیں پانچ۔"

احمد معروف نے بے حد طمانیت سے کہا تھا۔ نور محمد کی آنکھیں ابھی بھی الجھی الجھی سی تھیں۔ حالانکہ وہ رو نہیں رہا تھا۔ وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر بال میں آ بیٹھے تھے۔ رات کافی گہری تھی اور احمد معروف کے پاس کرنے کے لیے رات سے بھی زیادہ گہری باتیں تھیں۔ خنکی بھی ہو چلی تھی۔ چند دن گزرتے لوگ کرسمس کی تیاریوں میں لگ جاتے۔ 2006ء کا سورج بہت جلد 2007ء سے حلف لے کر اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاتا۔ ایک اور سال گزر جاتا۔ ایک اور سال آ جاتا۔

"دین اور دنیا کی حقیقت اعداد بہت اچھی طرح سمجھا سکتے ہیں۔"

بہت نرمی سے اپنا نقطہ نظر بیان کر رہا تھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ دین سیدھا "راستہ" ہے جبکہ دنیا گول "دائرہ" ہے۔ اول الذکر "ایک" ہے جبکہ موخر الذکر دنیا "صفر" آپ تسلیم کریں یا نا کریں مگر یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ آپ "ایک" ہو کر نہیں جی سکتے' کیونکہ یہ آپ کی اوقات نہیں۔" "اکائی" "صرف" رب کائنات کو بجتی ہے۔ جبکہ "صفر" آپ کا مقام نہیں۔ اللہ نے انسان کو زمین پر اپنا نائب مقرر کیا ہے کیا وہ "صفر" کو اپنا نائب مقرر کرے گا۔ صفر کا مطلب کچھ نہیں اور اللہ نے فرشتوں سے سجدہ "کچھ نہیں" کو نہیں کروایا ـــــ اس لیے آپ کو ان دونوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ یہی ہے وہ طریقہ جو اللہ نے بتایا اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا۔ آپ کو اسے اپنانا پڑتا ہے۔ آپ کو "دس" ہونا پڑتا ہے۔ یعنی ایک اور صفر ایک ساتھ اکٹھے۔ باہم..... آپ دین کو چھوڑ کر دنیا میں ضم ہو جائیں' یہ بھی ناپسندیدہ اور دین کے ہو کر دنیا سے کنارہ کرلیں' یہ بھی ناپسندیدہ۔ آپ کو دس کا راستہ اپنانا پڑتا ہے۔"

"یہ آسان کام نہیں ہے احمد معروف..... آپ "کاملیت" کی بات کر رہے ہیں۔ یہاں دو ہندسے ملتے ہیں۔ ایک اور دس.... دس اکملیت ہے۔ اکملیت انسان کا نصیب ہی نہیں ہے۔ اکملیت ہماری زندگیوں میں کہیں ہے ہی نہیں۔"

نور محمد کو اس کی باتوں سے تسلی نہیں ہوئی تھی۔

"میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ یہ ہماری زندگیوں میں ہے۔ یہی تو مسئلہ ہے کہ ہم نا "دس" ہوتے ہیں نا "دس" ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اکملیت ہمارا نصیب نہیں ہے یا ہماری زندگی میں کہیں نہیں ہے۔" احمد معروف اس کے قریب ہوا تھا۔ نور محمد اس کا چہرہ تکنے میں مگن تھا۔ وہ احمد معروف کے سامنے خود کو کبھی کبھی بالکل احمق سمجھتا تھا۔

"آپ نے زندگی میں کسی کو دیکھا ہے جو مجسم "دس" ہو.....؟" اس نے پراسرار سے لہجے میں سوال کیا۔ احمد معروف نے مسکرا کر گردن ہلائی۔

"ہاں ـــ" وہ حاملہ ماں جو پورے دنوں سے ہوتی ہے۔ وہ مکمل "دس" ہوتی ہے۔ اس کا وجود "ایک" اور اس کے وجود میں چھپی اس کی اولاد "ایک بڑے

سے "صفر" کے روپ میں اس کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ "بچہ" کائنات کی سب سے خوب صورت چیز ہوتی ہے۔ اس بچے سے زیادہ خالص چیز دنیا میں کوئی اور نہیں ہوتی۔ یہ جزدان میں لپٹے کسی صحیفے کی طرح مقدس ہوتا ہے اور ایک ماں اس صحیفے کی طرح کے وجود کو اپنے وجود میں نو مہینے تک سمیٹ کر رکھتی ہے۔ ماں ہی وہ مکمل روپ ہے جس میں ہم مجسم "دین" دیکھ سکتے ہیں۔ اکملیت کی اس سے بہتر مثال کہاں ملے گی۔ ماں ہی وہ ہستی ذات ہے جو اس ننھے وجود تک رسائی رکھتی ہے جو اللہ کا کلمہ حق پڑھ کر اس دنیا میں آتا ہے جو اس کا خاص ہوتا ہے کہ خود اللہ نے اس سے اپنی وحدانیت کا عہد لیا ہوتا ہے۔ "وہ عہد الست" میں بندھ کر سیدھا ماں کے وجود میں آجاتا ہے۔ "بچہ" اللہ کا سب سے خوب صورت تحفہ ہے جو اس کائنات کو عطا کیا جاتا ہے۔ وہ پیکر "دین حق" کا عہد کرکے اس دنیا میں آتا ہے۔ اتنی خالص اور اتنی پاکیزہ چیز شاید ہی کوئی اور ہوتی ہو اور وہ جو اس خالص تحفے کو اٹھائے پھرتا ہے۔ اس سے زیادہ مقدس کیا ہوگا۔ یہ ہے وہ مجسم "دین" جو ہم اس دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک ماں ہی ہے جو دین اور دنیا کے درمیان پل کی طرح ہوتی ہے۔ اللہ جب ایک عورت کو "ماں" کے درجے پر فائز کرتا ہے تو انسانیت کی تکمیل کر دیتا ہے۔ ایسی عورت کا درجہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ماں کی دعا اللہ جلدی سنتا ہے اور درد زہ میں تو دعا رد نہیں کی جاتی۔ دین اور دنیا کا مکمل مجسم روپ ایسی عورت کی شکل میں نظر آتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اور دنیا کے درمیان ربط اور ہم آہنگی کو برقرار رکھنا ہی دراصل وہ راستہ ہے جو ہمیں ہماری اس منزل تک پہنچائے گا۔ جسے "جنت" کہتے ہیں۔ انسان کا کام دین میں گم ہو جانا ہے تاکہ اسے سیکھ کر اس دنیا میں گم نہ ہونے کے طریقے سیکھ سکے۔ اس ربط کو اس گتھی کو سمجھنے اور سلجھانے والا ہی دراصل کامیاب انسان ہے۔ حضرت انسان ہے۔ جس کے لیے یہ کائنات بنائی گئی۔" احمد معروف نے رک کر گہری سانس بھری تھی۔

"یہ ربط اور ہم آہنگی سکھانے والی سب سے پہلی ہستی ہوتی ہے ماں... کیونکہ وہ خود اس ربط کی جیتی جاگتی مثال ہوتی ہے۔ جس کی ماں یہ ربط سیکھ جاتی ہے اس کی اولاد خود بخود یہ ربط سیکھ جاتی ہے۔ اللہ عورت کو ماں بناتا ہے اور پھر ماں کو "دین" بنا دیتا ہے۔ یہ ماں ہی ہے جو کائنات کو دین بنا دیتی ہے۔ یہی اکملیت ہے۔"

وہ خود کسی ادراکی روشنی کیفیت میں تھا۔ نور محمد نے اس کا چہرہ دیکھا پھر اس نے آستین سے آنکھیں صاف کی تھیں۔

"ماں تو ہر شخص کو ملتی ہے احمد معروف! لیکن ہر شخص مکمل نہیں ہوتا۔"

"نہیں نور محمد... ہر عورت "ماں" نہیں ہوتی۔ کسی کسی کو صرف ماں نام کی عورت ملتی ہے۔ ایسی عورت جس کے دل میں اکرام نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ماں وہ ہوتی ہے جس کے دل میں ممتا ہوتی ہے جس کے دل میں ممتا نہیں ہوتی وہ ماں بھی نہیں ہوتی۔ ممتا بے حد خالص جذبہ ہے۔ اللہ اس جذبے کو انسان کے لیے محسوس کرتا ہے۔ وہ جب انسان سے اپنی محبت کا ذکر کرتا ہے تو پلڑے میں ممتا نام کا ترازو رکھ کر اسے ستر گنا سے زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اللہ کی اس محبت کا ایک گنا جس ماں کے دل میں ہو بس وہی "ماں" ہے۔" احمد معروف نے اس کا چہرہ دیکھا۔ نور محمد کی آنکھیں پھر بھر آئی تھیں۔

"ماں..." اس نے دہرایا۔ اسے یاد آیا اس کی بھی کوئی ماں تھی۔ اسے یاد آیا اس کے سینے میں چبھن جیسی چیز کا نام ماں تھا۔

اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ رات کے اس پہر کیوں اس قدر بے چین تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اسے دنیا میں یاد کرنے والی ہستی کون تھی۔ وہ یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

اسے کب پروا تھی کہ دنیا میں کوئی اسے ایسے اکملا

سے جیسے بھوکا پیٹ روٹی مانگتا ہے۔

کوئی اس کے لیے ایسے ہمکتا ہے جیسے شیر خوار ماں کی آغوش کے لیے ہمکتا ہے۔

اس نے کب سوچا تھا کہ کسی کو اس کی ایسے خواہش ہو سکتی ہے جیسے کسی نفس کو سورج کی تپتی جھلستی آگ جیسی شعاعوں سے بچنے کے لیے سائے کی خواہش ہوتی ہے۔

اسے کب پروا تھی کہ وہ کسی روزہ دار کے لیے وقت افطار پانی کا پہلا گھونٹ ہو سکتا ہے۔

اس کے ذہن میں کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ وہ حالت نزع میں سسکتے تڑپتے وجود کا کلمہ حق ہو سکتا ہے۔

وہ تڑپ تڑپ کر رونے لگا تھا۔

"آپ کون ہیں احمد معروف… آپ کہاں سے آگئے ہیں مجھے میرا ماضی یاد دلانے… میں تو سب بھول گیا تھا۔ آپ کیوں مجھے سب یاد کروا رہے ہیں۔" وہ بلک رہا تھا۔

اسے وہ ماں یاد آگئی تھی جو اسے کبھی بھولی نہیں تھی۔ احمد معروف نے اس کے آنسوؤں کو بہنے دیا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری دلی مسکراہٹ تھی۔ اس کا کام ختم ہو چکا تھا۔

"میں بلس گرانٹ ہوں… میرے دوست مجھے بلی کہتے ہیں۔" اس نے دھیمی سی آواز میں کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا کیا خیال ہے یہ دنیا رہنے کے لیے کیسی جگہ ہے؟" میرے ساتھ بیٹھے لڑکی نما لڑکے نے پوچھا تھا۔ میں نے آنکھوں کو پھیلا کر کھلا رکھنے کی کوشش کی۔ میرا سر بھاری سا ہو رہا تھا اور آنکھیں جیسے دیکھنے کی صلاحیت سے عاری ہو رہی تھیں۔ یہ شاید الکحل کی زیادہ مقدار اپنے اندر انڈیلنے کے باعث ہو رہا تھا۔ یہ میرا شراب پینے کا پہلا موقع تھا۔ بلکہ میں کسی بھی بار میں اس مقصد کے لیے پہلی بار ہی آیا تھا۔ میں اپنے

آپ کو اپنے قریب رہنے والوں کو اپنے سے وابستہ
رشتوں کو اپنے دکھوں کو اس دنیا کو سب کو بھول جانا
چاہتا تھا۔ میں نے دیکھا تھا لوگ بار میں جاکر پیتے تھے تو
سب کچھ بھول کر ہی نکلتے تھے۔ مجھے ڈرگز ملتی تو میں وہ
بھی لے لیتا لیکن جو میرے بس میں تھا میں وہی کر رہا
تھا۔ میں یہی کر سکتا تھا کہ اپنے آپ سے انتقام لیتا
رہتا۔ میں ثنیا کو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

عوف بن سلمان سے بھی بغض ختم ہو چکا تھا کوہو
نے مجھے کبھی اس قابل ہی نہیں سمجھا تھا کہ میں اس کے
ساتھ کوئی رشتہ وابستہ کر سکتا۔ میں صرف اپنی ذات کو
تکلیف پہنچا سکتا تھا۔ مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ اپنے
آپ سے اس دنیا سے اور اپنے آپ کے اس دنیا میں
ہونے سے۔

میں نے آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے
دوبارہ اس لڑکے کی جانب دیکھا۔ اس کے بال لمبے تھے
اور اس نے ناک میں بالی پہن رکھی تھی۔ اس کے
چہرے پر میک اپ کے اثرات ختم ہو چکے تھے جو میں
پہلے بار کے اندر بیٹھے دیکھ چکا تھا۔ اس کا نام سیم تھا۔ وہ
پہلا شخص تھا جس نے میرے لیے پہلی ڈرنک آفر کی
تھی۔ ٹرکولا کے ساتھ سرکے والے کھٹے چپس
میرے لیے اس نے ہی منگوا کر دیے تھے۔ اسی نے
مجھے بتایا تھا کہ چپس کھاتے رہنے سے ہمیں شراب کا
نشہ آہستہ آہستہ چڑھتا ہے ہم زیادہ الکحل پی سکتے ہیں
اور دنیا کو گالیاں بکنے کے لیے زیادہ وقت مل جاتا ہے۔
میں نے اتنی الکحل اپنے اندر ڈال لی تھی کہ میں بے
قابو ہو گیا تھا۔ میں نے بار کے اندر بیٹھے ابکائی کر دی
تھی جس کی بنا پر ویٹرس نے مجھے گارڈز کو بلا کر بار سے
باہر پھینک دیا تھا۔ سیم کے ساتھ بھی شاید یہی ہوا تھا
جو وہ بھی میرے ساتھ باہر آیا تھا اور اب ہم دونوں فٹ
پاتھ پہ بیٹھے تھے۔

"یہ دنیا رہنے کے لیے اچھی جگہ نہیں ہے۔" اس
نے میری خاموشی سے اکتا کر خود ہی کہا تھا۔

میرا سر گھوم رہا تھا۔ میرے ذہن میں مختلف چیزیں
ایک ساتھ چل رہی تھیں لیکن نشہ اتنا ہو چکا تھا کہ
اب کچھ سوچنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔ میں وہاں
سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے گھر جانا تھا۔ میں اور کہاں
جاتا۔

"مجھے تمہارا انداز اچھا لگا... تم کمپرومائزنگ ہو۔
اپنے باپ کی طرح۔"

"ایک بات یاد رکھنا۔ کامیابی تب ملتی ہے جب
انسان سب سے پہلے اپنی ذات کے بارے میں
سوچے۔"

"میں بحیثیت اس کی ماں یہ بہتر فیصلہ کر سکتی ہوں
کہ وہ کہاں رہے گا۔"

یہ کوہو تھی۔ میری ماں پاپا کے نام پر دھبہ... مجھ
سے چند سال بڑے لڑکے کی گرل فرینڈ۔ دکھ بڑا ہی
نہیں تھا نا قابل بیان بھی تھا۔ مجھے اس بات کا صحیح
ادراک بھی نہیں تھا کہ مجھے کیا چیز زیادہ دکھ دے رہی
ہے۔ ثنیا کا رویہ اور کوہو کی گندی فطرت دونوں ہی مجھے
اندر سے توڑ گئی تھیں۔ میں ثنیا کی وجہ سے آبلہ بن گیا تھا
اور کوہو نے مجھے پھوڑا بنا ڈالا تھا۔ میرے سر میں درد کی
پہلے سے زیادہ شدید لہر اٹھی۔ میں نے جھکی ہوئی پشت
کے ساتھ مڑ کر دیکھا۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ قدم
ہر قدم پر لڑکھڑاتے تھے۔ سیم مجھے پکار رہا تھا کہ میں
وہیں سڑک پر بیٹھ جاؤں۔ میرا وزن یک دم میرے قابو
میں نہیں آ رہا تھا۔ سر بھاری ہو رہا تھا مگر باقی جسم اتنا
ہلکا پھلکا ہو رہا تھا کہ لگتا تھا کہ گر جاؤں گا۔

"تم مجھے چھوڑ کر کدھر جا رہے ہو... میرا انتظار
بھی نہیں کیا۔" سیم جھکولے کھاتے میری جانب آ رہا
تھا۔ میں جلتی بجھتی ٹیوب لائٹ جیسی آنکھوں کے
ساتھ رک گیا تھا۔

"تمہیں مجھ سے کچھ کام ہے؟" میں نے بمشکل
زبان ہلائی تھی۔

مجھے ٹوائلٹ جانے کی ضرورت بھی محسوس ہونے
لگی تھی۔ میں بس اب گھر جانا چاہتا تھا جہاں سے نکلتے
ہوئے میں نے سوچا تھا کہ کاش یہ میرا گھر نہ ہوتا۔
میرے ذہن سے اب تفکرات کا غلبہ ہٹ رہا تھا۔
عوف بن سلمان اور ثنیا اب مزید میرے دماغ سے چپکے

ہوئے نہیں تھے۔ کو ہو بھی جیسے کہیں گم ہو رہی تھی۔ وہ غنودگی جو رو کی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اب آنکھوں کے کناروں پر آ گئی تھی۔ میں وہیں کہیں گرنے والا ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند ہوتی تھیں تو سکون ملنے لگتا تھا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟" اس نے دہرایا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوبارہ وہیں سڑک پر بٹھا دیا۔

"یہ دنیا رہنے کے لیے بالکل میرے جوتے جیسی ہے "کاٹتی ہوئی"۔ ہے نا؟"

وہ میرا چہرہ دیکھتے ہوئے نجانے پوچھ رہا تھا یا جتا رہا تھا۔ میرے مثانے پر بوجھ بڑھ رہا تھا۔

"سیم! مجھے جانا ہے۔ مجھے حاجت محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے پھر غنودگی کو آنکھوں سے بھگانے کی کوشش کی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

"دنیا بے شک جوتے کے جیسی ہو۔ کاٹتی ہو، تکلیف دیتی ہو۔ لیکن میرے جیسے دوست کا ساتھ ہو تو مشکل، ہر تکلیف آسان ہو جاتی ہے۔ آزما کر دیکھو۔"

وہ میرے ہاتھ سہلانے لگا تھا۔ میں نے بہت شدت سے غنودگی کو بھگانا چاہا۔ مجھے نجانے کیوں سیم کے لمس سے کچھ غیر معمولی احساس ہوا تھا، جس کی مجھے ایک دم سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ ہاتھ کو سہلاتا ہوا بازو کی جانب بڑھنے لگا تھا۔

"مجھے حاجت محسوس ہو رہی ہے۔ کل ملتے ہیں سیم۔" میں نے زمین پر ڈھیر ہوتے ہوئے وجود کو سنبھالنا چاہا تھا۔

"کل بھی مل لیں گے دوست.... آج بھی مت چھوڑ کر جاؤ۔ کتنا سکون ہے یہاں۔"

وہ بھی مدہوشی کے زیر اثر محسوس ہوتا تھا۔ اس کی آواز میں نرمی کا تاثر غالب ہو رہا تھا۔ وہ اب میری پشت سہلانے لگا تھا۔ میرے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ غنودگی کا غلبہ بھاری تھا، میں مزاحمت کر رہا تھا۔ لیکن مجھ پر نشہ اس قدر سوار ہو چکا تھا کہ اپنے ہاتھ پاؤں پر اختیار ختم ہو رہا تھا۔ سیم کی انگلیوں نے میری پشت سے میری گردن تک کا سفر کر لیا تھا۔ مجھے انتہائی گندگی کا عجیب سا احساس ہوا۔ سیم کیا چاہتا تھا۔ انسان کا ضمیر مرنے سے پہلے مزاحمت ضرور کرتا ہے۔ میں نے سیم کو دھکا دیا تھا۔ میں وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا، لیکن میں بے بس تھا۔ میرا جسم نجانے کیوں میرا نہیں رہا تھا۔ میں زمین کے سینے پر گر گیا تھا اور سیم مجھ پ...

☼ ☼ ☼

"دنیا بہت گندی ہے بن بافع..." میں نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔ بن بافع نے مانوسیت کا بھرپور تاثر آنکھوں میں سموتے ہوئے گردن ہلائی۔

"آپ جس چیز کو کل رات پیتے رہے ہیں... اس چیز سے زیادہ گندی نہیں ہے دنیا۔"

میں نے منہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے سیاہ رنگ اور بھدے خدوخال کی := میں نجانے وہ کیا خوب صورت، مہربان سا چھپا بیٹھا تھا کہ میرا دل چاہا کہ میں بن بافع کی گود میں سر رکھ کر اپنا سارا دکھ بیان کر ڈالوں۔

"میں نے کل رات سے پہلے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ میں اس کے ذائقے اور خوشبو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے اس کے اثرات کے بارے میں سنا تھا، لیکن یہ اس قدر بد اثرات ہو سکتے تھے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یہ حادثات کا باعث بن سکتے تھے۔ میں نے یہ بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ کل رات شراب کے نشے میں میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اس سے زیادہ برا زندگی میں مزید کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نجانے کتنی دیر اس سڑک پر ہوش و حواس سے ماورا پڑا رہا تھا۔ جب حواس بیدار ہوئے تو مجھے احساس ہوا تھا کہ میں ذلت کی کس انتہا تک ہو آیا تھا۔ میرے کپڑوں پر سڑک پر پڑے کچرے کی غلاظتوں کے علاوہ بھی آلائشیں تھیں۔ واش روم جانے کے بجائے میں نے سڑک کو ہی ٹوائلٹ کے طور پر استعمال کر لیا تھا اور مجھے اتنا ہوش بھی نہیں تھا کہ میں اس چیز کا ادراک کر پاتا۔ میں نے ابکائی بھی کی تھی، جس کی بنا پر میری قمیص بالکل غلاظت سے بھر گئی

تھی۔ میرے وجود سے بساند اٹھ رہی تھی جو اس قدر ناقابل برداشت تھی کہ مجھے دوبارہ سے ابکائی آنے لگی تھی۔

مجھے صفائی سے عشق تھا' گندگی ہمیشہ سے میرے لیے باعث آزار تھی اور شراب کے نشے نے میرے پورے وجود کو گندگی میں ڈبو ڈالا تھا۔ ہوش میں آجانے کے بعد پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ کوہو' عوف بن سلمان اور دنیا نے مل کر میرے ساتھ اتنا برا نہیں کیا' جتنا برا میں نے خود اپنے آپ کے ساتھ کر ڈالا تھا۔ جسم نے میرا غلط استعمال کیا تھا اور میں نشے میں مزاحمت کرنے کے باوجود اسے روک نہیں پایا تھا۔ مجھے انتہائی دکھ تھا کہ یہ سب نشے کی وجہ سے ہوا تھا۔ ایسا بھی کیا ہو گیا تھا کہ میں آدمیت کے مقام سے ہی گر گیا تھا۔

میں بہت مشکل سے گھر پہنچا تھا۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اپنے رہائشی حصے کی جانب جاتا' میں ملازموں کے سامنے اس حلیے میں نہیں جا سکتا تھا۔ میں اپنی بے عزتی نہیں کروا سکتا تھا۔ اس لیے میں جیپ گرانیکسی کی طرف گیا تھا۔ میرا خیال تھا وہاں کوئی نہیں ہو گا۔ بن بانع شاید عوف کے ساتھ ہی رخصت ہو چکا ہو گا' لیکن بن بانع یہاں موجود تھا اور یہ اس شخص کا مہربان رویہ تھا کہ میں نے بے بس ہو کر اپنے ساتھ بیتنے والی ہر بات اسے بتا دی تھی۔ میرے اعصاب اس قدر مجبور ہو چکے تھے کہ اگر میں بن بانع سے یہ سب نہ کہتا تو شاید پھٹ جاتا۔ کوہو' عوف بن سلمان اور دنیا۔ میں نے ایک ایک شخص کو ایک ایک کر کے بن بانع کے سامنے کھول ڈالا تھا۔

بن بانع نے میرے لیے کپڑوں اور نہانے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں اب ان کے سامنے پشیمان بیٹھا تھا۔

"مجھے شراب نہیں پینی چاہیے تھی۔ میں اس کے منفی اثرات کو برداشت کرنے کے لیے بہت چھوٹا ہوں ابھی۔" میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ کو واقعی نہیں پینی چاہیے تھی۔ کسی کو بھی نہیں پینی چاہیے۔ اس کے اثرات کو برداشت کرنے کے لیے ساری عمر چھوٹا رہتا ہے انسان۔ آپ یہ لیموں پانی لیجیے۔ سر درد میں افاقہ ہو گا۔"

"مجھے لیموں پانی نہیں چاہیے بن بانع۔ آپ مجھے زہر لا دیجیے۔" میں نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

"زہر۔" اس نے دہرایا' اس کے لہجے میں تحیر تھا۔

"ایک حرام چیز آپ رات پی کر آئے ہیں اور ایک آپ اب مانگ رہے ہیں۔ آپ بار بار کیوں پچھتانا چاہتے ہیں سر۔ یہ کام تو ایک بار ہی کافی ہوتا ہے۔"

"مجھے کیا اپنی مرضی سے مرنے کا حق بھی نہیں حاصل۔ جب مجھے یہ دنیا راس نہیں آئے گی تو میں اس کو چھوڑنے کی ضد ہی کروں گا۔" میں نے تنک کر کہا جیسے چھوٹا بچہ پسند کی چیز دلوانے پر کہتا ہے۔

"ضد... زہر... آپ کو ہر وہ چیز پسند ہے' جو دکھ دینے کا باعث بنتی ہے۔"

بن بانع نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ کو یہ سب چیزیں ناپسند ہیں۔"

"میرے دین میں یہ سب چیزیں ناپسند ہیں... بلکہ میرا دین انہیں حرام قرار دیتا ہے۔"

بن بانع نے میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس لیموں پانی والے گلاس کو زبردستی مجھے تھما دیا تھا۔

"ہر وہ چیز جو کائنات کے تسلسل کو ذرا سا بھی خراب کرنے کا باعث بنے' ہر مذہب میں ناپسندیدہ اور حرام ہوتی ہے۔" وہ خود ہی وضاحت کر رہا تھا جو مجھے پسند نہیں آئی۔

"میں اس کائنات کے سامنے چیونٹی سے بھی گیا گزرا ہوں۔ میں اس کا تسلسل کیا خراب کروں گا۔ میرا اپنا تسلسل ہی ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ آپ کی سوچ ہے سر۔ آپ اس زمین کے چہرے پر موجود ہیں' اس دنیا کا حصہ ہیں تو آپ یقیناً اس کائنات کے تسلسل کے ذمہ دار ہیں۔ اس کے لیے جوابدہ ہیں۔ آپ کا یہاں موجود ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ اس کائنات کے تسلسل میں کس

قدر اہم ہیں۔"

وہ مؤدب کھڑا کہہ رہا تھا۔ میں نے ناسمجھی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھا' مجھے مزید وضاحت درکار تھی۔ اس نے میرا چہرہ دیکھا اور شاید پڑھ بھی لیا۔ وہ قابل آدمی تھا۔

"سر! انسان کی دنیا ایک دائرہ ہوتی ہے۔ اس دائرے میں وہ اکیلا نہیں ہوتا' اس سے وابستہ لاتعداد لوگ بھی اس دائرے میں ہوتے ہیں۔ انسان کا کیا جانے والا کوئی بھی ناپسندیدہ یا حرام عمل اس دائرے میں موجود لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پھر ان انسانوں کی زندگیوں میں بھی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ یہ بگاڑ ان سب انسانوں کے اپنے اپنے دائروں میں موجود دوسرے انسانوں پر بھی اثر ڈالتا ہے تو سوچیں ایک انسان کا چھوٹا سا حرام عمل ختم نہیں ہوتا' چھپتا نہیں ہے۔ وہ کائنات کے تسلسل کو بگاڑنے لگتا ہے۔ یہ یورینیم کی افزودگی سے زیادہ بڑا اور خطرناک عمل ہے۔ سر! اسی لیے میرے ذہن میں حلال حرام کی واضح تفریق ہے۔"

"حلال حرام...؟" میں نے پھر استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"بہت آسان سی بات ہے سر... حلال وہ جو اللہ نے جائز قرار دیے اور حرام وہ جو اس نے ناجائز قرار دے دیے۔ موت برحق ہے' ایک نہ ایک دن آہی جاتی ہے۔ یعنی موت حرام نہیں ہے' لیکن خودکشی حرام ہے۔ آپ نے فنا ہو جانا ہے۔ دونوں صورتوں میں' لیکن ایک چیز جائز ہے' جبکہ دوسری جائز نہیں ہے۔ ایک کام میں اللہ کی رضا ہے' جبکہ دوسری میں نہیں ہے۔ حرام اور حلال کے درمیان یہ جو فرق ہے نا' یہ تکلیف سے بچانے کی چیز ہے۔ ہر وہ چیز جو ابتدا میں ناپسندیدہ ہے' اپنی انتہا پر حرام بن جاتی ہے' کیونکہ یہ ابتدا میں تکلیف دہ اور انتہا پہ باعث ذلت بن جاتی ہے۔ انسان حرام چیز کو اپناتا ہے تو سمجھئے کائنات کے تسلسل میں بگاڑ کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ سارے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے۔ کڑی کو الٹا جوڑنے کی کوشش میں جو بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے وہی بگاڑ حرام کو حلال بنا لینے سے ہوتا ہے۔ جگ سا پزل کی مثال لے لیجیے۔ ایک غلط ٹکڑا لگا لینے سے ہر ٹکڑا غلط ہو جاتا ہے۔ آخر تک کوئی چیز اپنے تسلسل پر نہیں آپاتی۔ حرام کا استعمال بھی اسی طرح پہلے انسان اور پھر اس کی کائنات کے تسلسل کو بالکل بگاڑ دیتا ہے۔"

اس نے بات مکمل کر کے چہرہ دیکھا کہ آیا میں اس کی بات سمجھا ہوں یا نہیں۔ میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ مجھے چیزیں دیر سے سمجھ میں نہیں آتی تھیں' لیکن بعض اوقات دل چاہتا تھا کہ چیزوں کو مزید واضح کیا جائے۔

"حرام"... کا لفظ بہت مختصر' اس کا مفہوم بہت واضح' لیکن اس کا دائرہ بہت وسیع ہے... ہر وہ چیز جس کے اثرات' برداشت کرنے کے لیے پہلے انسان کا حوصلہ اور پھر وہ خود چھوٹا پڑ جائے' ہر وہ چیز جو اپنی ابتدا میں تکلیف یا خلجان اور اپنی انتہا پر کرب یا ذلت کا باعث بنے... حرام ہے... حرام ہے... حرام ہے..." وہ ابھی بھی سابقہ انداز میں کھڑا تھا۔

"شراب' موسیقی' زناکاری' خودکشی اور عشق۔" آخری الفاظ ادا کرنے میں اس نے کچھ توقف کیا۔ میں آخری لفظ پہ ہی چونکا تھا۔

"عشق...؟" میں نے خود ہی اپنی آواز کی سرسراہٹ کو محسوس کیا۔ نیا کا چہرہ ذہن کی اسکرین پر چمکنے لگا تھا۔

"عشق..." میں نے دہرایا تھا۔ اب کی بار میرا انداز سوالیہ تھا۔

بن بافع کے چہرے کے خدوخال میں نرمی کا عنصر بڑھ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ مہربان لگنے لگا تھا۔

"عشق ایک جذبہ ہے بن بافع... آپ اسے کیا ثابت کرنے پر تلے ہیں۔ یہ خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے" میں نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ اس نے گردن ہلائی۔

"خدا تک پہنچنے کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ "محبت" ہے۔ وہ محبت جو فرد واحد سے نہیں' جو انسان

سے نہیں بلکہ انسانوں سے کی جاتی ہے۔ خدا صرف انسانیت سے محبت کرنے سے ملتا ہے۔ محبت جذبہ ہے سراً عشق تو اس جذبے کو بدنام کرکے دیا جانے والا نام ہے شاعروں اور ادیبوں کی اصطلاح ہے انہوں نے محبت کو بگاڑ بگاڑ کر عشق بنادیا ہے آپ یوں سمجھ لیں کہ محبت سرکہ ہے اور عشق شراب ہے ان دونوں کے درمیان واضح فرق ہے یعنی سرکہ حلال ہے شراب حرام ہے۔ محبت میں جب وہ مقام آجائے کہ محبوب خدا لگنے لگے اور آپ اسے اپنے لیے ضروری سمجھنے لگیں تو وہیں رک جانا چاہیے محبت کو عشق میں ضم نہیں ہونے دینا چاہیے۔ عشق انسان کو کم ظرف بنا دیتا ہے' اس کی سوچ کو محدود کردیتا ہے وہ معشوق کے گرد طواف کرنے کو جائز قرار دینے لگتا ہے۔ عشق میں گم انسان پھر انسان نہیں رہتا۔ وہ انسانیت کے لیے ناکارہ ہونے لگتا ہے میں نے کہا نا۔ ہر وہ چیز جو آپ کو انسانیت کے مقام سے گرادے وہ حرام ہے تو عشق میں بھی یہی ہوتا ہے۔ انسان ہوش و خرد سے بیگانہ ہوجاتا ہے اسے اپنے جیسے مٹی گارے سے بنے انسان کی ایسی لگن لگ جاتی ہے کہ اسے کچھ اور سجھائی نہیں دیتا۔ اس سے بڑی بت پرستی کیا ہوگی کہ مٹی کا باوا مٹی کے باوے کے لیے مجنوں ہوجائے۔ عشق مجنوں کردیتا ہے۔ مجنوں پاگل کو کہتے ہیں اور پاگل پن سے خوف کھانا چاہیے کیونکہ اللہ مجنوں سے اتنا لاپروا ہوتا ہے کہ وہ پانچ نمازیں جو کسی حال میں معاف نہیں ہوتیں۔ مجنوں کو وہ بھی معاف ہوجاتی ہیں۔ عشق تو سرطان سے بھی برا مرض ہے۔ یہ عشق بس عشق حقیقی' عشق مجازی یہ صرف الفاظ کا ردوبدل ہے۔ یہ انسان کو مجنوں بنادینے کی چیزیں ہیں۔ اصل جذبہ "محبت" ہے اور محبت کبھی آپ کو آپ کے مقام سے نہیں گراتی۔ وہ آپ کو کبھی پاگل پن تک نہیں لاتی اس لیے محبت اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ میرا اللہ ننانوے ناموں سے مخاطب کیا جاسکتا ہے اور ان ننانوے ناموں میں کوئی ایک بھی "عاشق" نہیں ہے۔ ننانوے نام کھنگال کر دیکھ لیں وہ "محبت" ہے وہ "عاشق" نہیں ہے۔"

مجھے اس کی سب باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں لیکن جتنی بھی آرہی تھیں۔ وہ بے حد نئی اور دلچسپ تھیں۔ میں دین اسلام کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا' لیکن اسکول میں مذاہب کے متعلق پڑھتے ہوئے میں نے نماز اور مسجد کے بارے میں پڑھا تھا۔ یہ باتیں اتنی ضروری نہیں تھیں۔ میرے لیے جو ضروری تھا وہ میری سمجھ میں آگیا تھا کہ کائنات کے تسلسل میں ہر انسان اہم ہوتا ہے۔ انسان کو سیدھے راستے کا انتخاب کرنا ہوتا ہے ورنہ غلط راستہ اسے بھٹکا دیتا ہے اور وہ اپنی سدھ بدھ کھو دیتا ہے۔ قدرت کو سدھ بدھ کھوئے انسانوں کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اس مقصد کے لیے اس نے جانور بنا رکھے ہیں۔ اس رات میں نے سیکھ لیا تھا کہ بحیثیت انسان مجھ پر یہ فرض تھا کہ میں خود کو جانور بننے سے روکے رکھوں اور یہ تب ہی ممکن تھا جب میں حرام اور حلال میں واضح طور پر تخصیص کرنے کے قابل ہوتا۔ میں نے سیکھ لیا تھا کہ ہماری خوراک کہیں نا کہیں ہماری فطرت کو بنانے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ انسان کو خوراک کے متعلق محتاط ہونا چاہیے۔

"شراب' موسیقی' زناکاری۔ خودکشی اور عشق۔" میں نے دل ہی دل میں دہرایا تھا۔

بن بانغ ـــــ میں ـــــ میری زندگی کا اکیسواں سال ـــــ

ہم گزشتہ کچھ سالوں سے ایک ساتھ تھے۔ بن بانغ میری زندگی میں آنے والے بہترین دوستوں کا بہترین تحفہ تھے۔ انہوں نے میری زندگی کو متوازن بنانے اور میری شخصیت میں نکھار پیدا کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ مجھے یہ دعوا نہیں تھا کہ میں انسانوں کو پرکھنے کے قابل ہوگیا ہوں' لیکن یہ ضرور تھا کہ میں اب اچھے برے میں تمیز کرسکتا تھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ زندگی میں سب کچھ سب کے لیے نہیں ہوتا لیکن جو بھی ہوتا ہے وہ ہی بہترین ہوتا ہے۔

مجھے زندگی گزارنے کا یہ فلسفہ جس شخص نے

سکھایا تھا ان کا نام بن یافع تھا۔ میرے دل میں ان کے لیے بے حد احترام تھا۔ بہت عزت تھی۔ مسز ایمرین کے بعد بن یافع وہ دوسرے شخص تھے جن سے کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود وہ مجھے رشتے دار محسوس ہوتے تھے میں پہلے کی نسبت ان سے زیادہ احترام سے زیادہ محبت سے پیش آتا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہر جگہ کہنے کو میرے ذاتی ملازم کے طور پر موجود ہوتے تھے لیکن میرے لیے وہ ملازم سے زیادہ میرے دوست بلکہ میرے استاد تھے۔

وہ سیاہ فام تھے مگر ان کے وجود سے سنہری روشنیاں پھوٹتی تھیں۔ وہ بولتے تھے تب بھی کوئی اچھی بات ہی سکھاتے تھے اور جب خاموش رہتے تھے تب بھی کچھ نہ کچھ سیکھنے کو مل جاتا تھا۔ میں آکسفورڈ یونیورسٹی لاء کالج میں پڑھ رہا تھا۔ میرے ارد گرد بہترین دماغوں کا ہجوم تھا۔ میرے کلاس فیلوز ذہانت میں بے مثال تھے اور استاد باکمال تھے لیکن دل کو جو خوشی بن یافع سے سیکھ کر ہوتی تھی، وہ ناقابل بیان تھی۔ وہ میرے ساتھ لندن میں ہی رہتے تھے۔ میں گروپ اسٹڈی کے لیے جب ہاسٹل میں شفٹ ہوا تب بھی ان سے تقریباً ہر روز ملاقات کی کوشش ضرور کرتا تھا۔

مسز ارک اور کوہو ابھی بھی ایک ساتھ تھے۔ مسز ارک اب کافی بیمار اور لاچار رہنے لگے تھے جس سے کوہو مزید خود مختار ہو گئی تھی۔ مسز ارک کی سوشل لائف ختم ہو کر رہ گئی تھی جبکہ کوہو راتیں ہی نہیں دن بھی کلبز میں گزارنے لگی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ بری روش اختیار کر چکی تھی۔ اسے اپنی صحت کی بھی پروا نہیں تھی۔ جہاں مجھے ایک دفعہ میں ہی الکحل کے برے اثرات نے عقل سکھا دی تھی، وہاں میری ماں کے لیے الکحل جدید زندگی کو گزارنے کا بہترین ہتھیار تھی۔ کوہو میری زندگی میں اب مزید درد سر نہیں رہی تھی کیونکہ میں اب اس سے مکمل لاتعلق ہو چکا تھا۔ میں نے یہ سیکھ لیا تھا کہ وہ اپنی مکمل حیثیت میں ایک الگ وجود ہے۔ مجھے یہ حق نہیں تھا کہ میں اس سے توقعات باندھتا اور ان کے پورے نہ ہونے پر اس سے بدگمان ہوتا۔ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ میری "ماں" تھی "بڑی ماں" نہیں تھی۔ اس نے مجھے جنم دیا تھا، پیدا نہیں کیا تھا، پیدا کرنے والی ذات کوئی "اور" تھی۔

بن یافع کی معرفت سے توسط سے میں سیکھ گیا تھا کہ پیدا کرنے والا ماں سے بے پروا ہو سکتا ہے مگر لاپروا نہیں ہو سکتا۔

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ

خدا مجھ سے لاپروا نہیں تھا۔

"آپ کیوں جانا چاہتے ہیں بن یافع۔۔۔ مجھے چھوڑ کر واپس۔۔۔"

میں نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔ مجھے لگ رہا تھا میں ایک بار پھر جذباتی ہو رہا ہوں۔ بن یافع نے مجھے مزید سروسز فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ یورپ چھوڑ کر واپس جا رہے تھے۔ میری بات سن کر بن یافع کی معتبر سی مسکراہٹ میرے ارد گرد پھیل گئی۔

"میں چالیس سال کا ہو رہا ہوں سر! مزید کتنے سال زندہ رہوں گا میں۔۔۔ میرے گھر والے چاہتے ہیں میں اب ان کے ساتھ رہوں۔۔۔ وہ چاہتے ہیں میں شادی کر لوں۔" میں ان کی بات سن کر مزید جھنجھلاہٹ کا شکار ہوا۔

"آپ کو مزید محنت کرنی چاہیے بن یافع۔۔۔ میں متاثر نہیں ہوا۔۔۔ یہ شادی والا بہانہ کچھ موزوں نہیں لگا مجھے۔۔۔" بن یافع کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

"مسکرائیے مت بن یافع۔۔۔ شادی آپ یہاں بھی کر سکتے ہیں۔۔۔ آپ کو اپنی ہی کمیونٹی کی کوئی بہت اچھی لڑکی یہاں بھی مل سکتی ہے۔"

میں نے چڑ کر کہا۔ مجھے دل ہی دل میں اب غصہ آنے لگا تھا۔ بن یافع پھر مسکرائے۔ قدرت کی ایک عطا تو تھی ان پر۔۔۔ ان کی مسکراہٹ کو دیکھ کر ہمیشہ سخت چٹانوں سے ابلتے میٹھے چشموں کا خیال آتا تھا۔

"شادی۔۔۔؟" انہوں نے استفہامیہ انداز میں دہرایا۔ پھر اپنا رخ مکمل میری جانب موڑ لیا۔ وہ ہمیشہ خود کو میرا ملازم سمجھتے تھے اور میں نے انہیں ہمیشہ اپنا استاد مانا تھا۔

"شادی اہم نہیں ہے سر۔۔۔ موت بھی کہیں میرا انتظار کررہی ہوگی۔ میرا ماننا ہے' شادی اور موت اپنے ملک میں اپنی مٹی میں ہونی چاہیے۔۔۔ مٹی کا بہت حق ہوتا ہے سر۔۔۔ انسان یہ حق کبھی ادا نہیں کرسکتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کوشش ترک کردینی چاہیے۔"

میں نے بن یافع کا چہرہ دیکھا۔ ان کی کوئی بھی وضاحت مجھے مطمئن نہیں کررہی تھی۔

"انسان جہاں شادی کرتا ہے اس کی اولاد وہیں پلتی ہے اور جس جگہ انسان پیدا ہوتا ہے' پلتا بڑھتا ہے وہاں سے اسے ہمیشہ ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ مٹی کی فطرت میں وفاداری ہے' کشش ہے۔ یہ ہمیشہ اس انسان کو اپنی جانب کھینچتی رہتی ہے جو اپنی ماں کی گود سے اتر کر اس کے سینے پر قدم قدم چلنا سیکھتا ہے۔ مجھے اس جگہ سے ہمیشہ صدا آتی ہے سر' میں جہاں پلا بڑھا تھا' جہاں پیدا ہوا تھا۔۔۔ میں چاہتا ہوں میرے بچے وہیں پیدا ہوں۔۔۔ وہاں کی فضاؤں میں اپنا پہلا سانس لیں۔۔۔"

انہوں نے توقف کیا تھا۔ مجھے اسی ایک لمحے کا انتظار تھا کہ وہ خاموش ہوں تو میں اپنی بات شروع کروں۔

"بن یافع میرے ساتھ یہ مت کریں۔۔۔ میری الجھن کو مت بڑھائیں۔۔۔ آپ جائیں' اپنے گھر والوں کی مرضی سے شادی کریں اور دوبارہ یہاں واپس آجائیں۔" میں نے مشورہ دینا ایک بار پھر ضروری سمجھا۔

"میں نے آپ سے کہا نا شادی ہی اہم نہیں ہے۔۔۔ میں اپنا باقی وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنی مٹی میں گزارنا چاہتا ہوں۔"

"باقی وقت۔۔۔؟ ایسی باتیں کیوں کررہے ہیں آپ۔۔۔ بہت سال جینے والے ہیں آپ۔"

"بہت سے سال یا چند سال۔۔۔ ایک بات طے ہے سر۔۔۔ یہاں سے میرا دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔۔۔ میں اب واقعی واپس چلے جانا چاہتا ہوں۔۔۔ میں نے کچھ رقم جمع کرلی ہے' میں واپس جاکر اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"توبہ ہے بن یافع۔۔۔" میں نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ "آپ پہلے ایک بات کا تعین کیجیے۔ آخر آپ واپس جانا کیوں چاہتے ہیں؟ شادی' موت یا سوشل ورک۔۔۔؟ ایک کے بعد ایک بہانہ کیوں تراش رہے ہیں آپ۔۔۔"

ان کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں سر۔۔۔ میری مٹی مجھے بلا رہی ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے' جب اس کی مٹی اسے بلانے لگتی ہے۔ مادی چیزوں میں اگر کوئی آپ سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے تو وہ مٹی ہی ہے۔ مٹی کے دل میں آپ کی طلب بڑھتی ہے تو آپ کے دل میں بے چینی بڑھنے لگتی ہے۔ میری مجبوری کو سمجھیں سر۔۔۔ میں بہت بے چین ہوں۔"

وہ درخواست کرنے لگے تھے۔ میری گھٹن میں اضافہ ہوا۔ میں نے گہری سانس بھری اور گویا ہتھیار ڈال دیے۔ شاید مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میری کوئی درخواست کوئی التجا بن یافع کو اپنے وطن واپس جانے سے نہیں روک سکتی۔ بہت ضبط کے باوجود میری آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔

"مجھے کسی کا نہیں پتا بن یافع۔۔۔ لیکن اگر اس دنیا میں کوئی آپ سے بہت محبت کرتا ہے تو وہ میں ہوں۔۔۔ میرے دل میں آپ کا جو مقام ہے تا وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ میری کوئی بھی دلیل بے اثر ہے۔۔۔ میں آپ کو نہیں روکوں گا۔۔۔ مجھے دکھ ہے کہ آپ کو اپنی مٹی سے زیادہ محبت ہے اور میرے لیے شاید آپ کے دل میں کچھ بھی نہیں۔" میں اپنے آپ کو ایک بار پھر چھوٹا جذباتی بچہ محسوس کررہا تھا۔

"میں کم عقل سا چرخ ایک ان پڑھ انسان ہوں۔۔۔ میرے پاس دلیلیں کہاں سر' میں تو ہمیشہ سے دل کی سنتا آیا ہوں۔۔۔ میں نے آپ سے کہا نا میرا دل بے چین ہے۔۔۔ مجھے خدشہ ہے یا ایسے کہہ لیجیے کہ مجھے وہم

لاحق ہو گیا کہ میرے لیے وقت کے پاس اب گنجائش کم رہ گئی ہے۔ میری خواہش ہے سر! کہ مجھے میری مٹی میں دفنایا جائے۔ مٹی انسانی بدن کا عنصر ہے سر! ہم مٹی سے بنے ہیں۔۔۔ مٹی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کا بڑا حق ہوتا ہے۔۔۔ میں بحیثیت انسان اپنی مٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے لیے کوشش ترک کر دوں۔" انھوں نے اپنے ہی الفاظ دہرائے تھے۔

"مٹی کا حق؟" میں نے دہرایا۔ بن یافع بہت کم ہی گفتگو کرتے تھے۔ لیکن جب بھی کرتے تھے ان کی گفتگو کہیں محفوظ کر لینے کو چاہتا تھا۔ بن یافع نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"کچھ لوگ کہتے ہیں اہمیت صرف روح کی ہوتی ہے جسم کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی' حالانکہ جسم کی بھی اتنی ہی اہمیت ہوتی ہے جتنی کہ روح کی ہے۔ یہ اہمیت تب اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے جب ہم مر جاتے ہیں' بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جسم کی اہمیت شروع ہی تب ہوتی ہے جب ہماری روح قبض کر لی جاتی ہے۔ روح ہمارے اعمال ہمارا سب کیا چٹھا لے کر عالم برزخ کی طرف چلی جاتی ہے۔ جسد خاکی یہاں ہی رہ جاتا ہے اور دنیا کے کام آتا ہے۔ ہم مسلمانوں میں جسد خاکی کو صاف ستھرا کر کے مٹی کے سینے میں دبایا جاتا ہے۔

دنیا سمجھتی ہے میت مٹی میں چلی گئی۔۔۔ کام ختم ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ انسانی بدن مرنے کے بعد مٹی میں مل جانے کے بعد' دنیا میں بسنے والے انسانوں کے زیادہ کام آتا ہے۔۔۔ سائنس ثابت کرتی ہے کہ کمپوزیشن بھی کوئی چیز ہے۔ ایک ایسا عمل جس میں توانائی خارج ہوتی ہے جو مٹی کی خاصیت' قابلیت اور قدرت کو بڑھاوتی ہے۔ سادہ سی بات ہے سر! مٹی یعنی انسانی جسم ڈی کمپوزیشن کے عمل میں تحلیل ہوا اور مٹی میں جذب ہو گیا۔ اچھی مٹی' اچھی توانائی۔۔۔ گندی مٹی گندی توانائی۔۔۔ روح صرف اعمال نامہ لے جاتی ہے۔۔۔ عمل اور عمل کرنے والا بدن یہاں ہی رہ جاتا ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے' زور دیتا ہے کہ نیک عمل کرو' نیک عمل کی تلقین کرو۔۔۔ میرے رب کی کسی ہر بات میں حکمت ہے سر! اس نے کچھ بھی بے کار نہیں بنایا حتیٰ کہ مردہ جسم بھی' جو دنیا والوں کے لیے ذرا بھی اہمیت کا حامل نہیں لگ رہا ہوتا۔ مٹی کا سینہ اتنا فراخ بنایا ہے بنانے والے نے کہ وہ بے کار مردہ بدن کو بھی اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے اور ڈی کمپوزیشن کے بعد اس بے کار مواد کو کھاد کے طور پر استعمال کر لیتی ہے۔ مٹی پردہ رکھنا جانتی ہے سر! اسی لیے تو اسے "ماں" کے برابر درجہ دیتا ہے انسان۔"

بن یافع خاموش ہوئے تھے۔ ان کی بات نے ایک بار پھر میرے دماغ کو گھما ڈالا تھا۔

"آپ کی اس تھیوری کا آپ کی واپسی سے کیا تعلق ہے بن یافع!" میں مزید الجھ گیا تھا۔

"میں اپنی تعریف نہیں کر رہا سر! لیکن میں نے آج تک دانستہ کسی کو دل نہیں دکھایا' میں نے ہمیشہ وہی کام کرنے کی کوشش کی جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ میں نے اپنے کانوں کو برا سننے سے' آنکھوں کو برا دیکھنے سے اور اپنے ہاتھوں کو برا کرنے سے ہمیشہ روکے رکھا ہے۔ میں نے خود کو ہمیشہ برائی کی مخالف سمت میں چلایا ہے۔ میں کتنا گناہ گار ہوں یا کتنا نیکوکار ہوں یہ تو میرا اللہ جانتا ہے جس کے ہاتھ میں جزا' سزا ہے' اس کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا۔ میں صرف وہ کر سکتا ہوں' جس کی میرے مالک نے مجھے قابلیت' اہلیت اور حکمت دی ہے۔ میں نے اپنے جسم کو ہر برائی سے بچا کر اس کی توانائی کو مثبت انداز میں محفوظ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں میری یہ توانائی میرے وطن کے کام آئے۔ میں اپنے وطن کی مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہوں سر!"

وہ ایک بار پھر چپ ہوئے اور میرا تجسس بڑھا۔

"کیا میں نے زیادہ بڑی خواہش کر لی ہے سر!" ابن یافع نے ایک اور وقفہ کیا تھا۔

"مجھے اپنے وطن سے محبت ہے سر! یہ میرا گناہ نہیں' میری فطرت ہے۔ مٹی سے بنا انسان مٹی سے محبت نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ فطرت سے غداری تو جانور بھی نہیں کرتے اور جو انسان ایسا کرتے

ہیں میری نظر میں وہ جانور سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔"

میں نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ کیا یہ ضروری تھا کہ فطرت اور وفاداری کا سبق مجھے پھر پڑھایا جاتا۔ میں چپ ہو گیا تھا۔

"آپ کے ہاتھ بہت باکمال ہیں۔ ان میں کوئی ایسا جادو ہے جو سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ ان سے کوئی اچھا کام کیجیے گا۔ قدرت آپ کی بہت مدد کرے گی۔ مگر ایک بات یاد رکھیے گا ہاتھوں کا عقیدہ بہت اہم ہونا چاہیے۔ ایمان دل سے پہلے ہاتھ سے شروع ہوتا ہے کیونکہ ماں کے پیٹ میں دل کہیں بہت بعد میں بنتا ہے۔ شہادت کی یہ انگلی سب سے پہلے وجود میں آجاتی ہے۔ اسی انگلی کو اٹھا کر ہم اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں اور وحدانیت پر ہمیشہ یقین رکھیں۔ میں آپ سے یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ اپنا عقیدہ بدل کر مسلمان ہو جائیں۔ اللہ سبحان تعالیٰ موجود ہے تھا اور رہے گا۔۔۔ بے شک۔۔۔ آپ اقرار یا نہ کریں مگر اپنے دل میں اپنا عقیدہ ضرور مضبوط رکھیں۔ آپ کسی بھی مذہب کے پیروکار ہوں اس پر دل سے ایمان لائیں کیونکہ اس سے ایک نہ ایک دن آپ اللہ کو پہچان جائیں گے۔"

بن یافع صومالیہ چلے گئے تھے۔ جانے سے پہلے یہ ان کی آخری نصیحت تھی۔ اسی سال میں نے اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر بالآخر اپنی سب درازوں کو کھنگال کر وہ ڈائریاں نکالیں جنہیں میں گڑھا کھودتا تھا جس میں میری زندگی دفن تھی۔ مجھے لفظوں کو اپنا ہنر بنانے کا ہنر آگیا تھا۔ میں نے کوئی کری ایٹو رائٹنگ کی کلاس نہیں لی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر بھروسا ہو گیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ میں لکھ سکتا تھا۔ میں اخبارات میں مراسلے بھیجتا رہتا تھا۔ میرے اساتذہ میری حوصلہ افزائی کرتے تھے اور اخبارات کے ایڈیٹرز کی جانب سے بھی اچھی آرا ملتی تھی۔ میں نے اس ساری توانائی کو مجتمع کرتے ہوئے اپنی زندگی کی کہانی لکھ ڈالی تھی۔

"مٹی اور موت" یہ میرے پہلے ناول کا نام تھا۔

یہ میری سوانح حیات تھی جسے میں نے ناول کی شکل دی تھی۔

اس ناول کا مرکزی کردار میں تھا۔ یہ کردار جب بوڑھا ہوا تو وہ بن یافع کے روپ میں ڈھالا کیونکہ میں انہی کے فلسفہ حیات کو اپنانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ بن یافع جو پڑھے لکھے بھی نہیں تھے میں بالکل ویسا بن جاؤں اس لیے میں نے اپنے ناول میں اپنی خواہشات اور تشنہ آرزوؤں کا حل کر لیا تھا۔

میں نے جب وہ ناول مکمل کیا اور اسے دوبارہ پڑھا تو مجھے حقیقی خوشی حاصل ہوئی۔ میری انگلیوں میں جو جادو تھا۔ وہ میری سمجھ میں آگیا تھا۔ مجھے الفاظ کو مہارت سے استعمال کرنے کا انداز آگیا تھا۔ اس ناول کو پبلشر کے پاس بھیجنے سے بھی پہلے میں خوابوں میں تعریفوں کے بے پناہ خطوط وصول کر چکا تھا۔

مگر تین مہینے بعد میرا ناول "مٹی اور موت" پبلشر کی جانب سے معذرت کے ساتھ مسترد کر دیا گیا۔

☼ ☼ ☼

"آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔۔۔ بلاشبہ۔۔۔ آپ یہ بات جانتے ہیں لیکن مجھے اس فلسفے پر اعتراض ہے جو آپ نے اس ناول میں بیان کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ہے یا کوئی مذہبی پیروکار۔۔۔ ہر بات پر ایک نصیحت ہے۔۔۔ کوئی رنگ نہیں ہے۔۔۔ کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔۔۔ کوئی تھرل نہیں ہے۔۔۔ یہ پڑھے گا کون ہے۔۔۔؟"

مسٹر میکنزی نے اپنے فربہی مائل وجود کو میز کے پیچھے سے سنبھالتے ہوئے ناک چڑھا کر کہا۔ میرا دل ان کے انکار کے باعث ٹوٹا ہوا تھا مگر ان پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مسٹر میکنزی وہ تیسرے پبلشر تھے جو مجھے انکار کر رہے تھے۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔۔۔ یہ سب باتیں آپ مجھے فون پر بتا چکے ہیں۔" میں نے اپنی اکتاہٹ چھپا کر کہا تھا۔

مسٹر میکنزی نے سر ہلایا۔ کرسی کو آگے دھکیلا اور خواہ مخواہ دوبارہ سے میز پر پڑے کاغذات کو ادھر ادھر کرنے لگے۔

"میں اسے بیچاپ سکتا ہوں... مگر...؟" یہ بھی احسان کرنے کا ایک حربہ تھا کہ بات کرتے کرتے رک گئے۔

"مگر...؟" میں نے دہرایا۔

"اسے تھوڑا تبدیل کرے... کوئی محبت ڈالو... گرل فرینڈ ڈالو... کوئی دل کی داستان ڈالو۔"

"گرل فرینڈ کا ذکر ہے مسٹر بکٹزی... ! آپ نے شاید غور سے نہیں پڑھا... وہ براؤن لڑکی جو ہیرو کو لندن میں ملی تھی اور بعد میں یہاں آئی وکے "میں بھی ان کے ساتھ تھی" مگر جس نے اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا تھا۔"

میں نے بے چین ہو کر وضاحت کی۔

"اسی محبت کے ذکر کو پھیلاؤ میری جان... آخری صفحے تک لے کر جاؤ کہ لڑکے کو کامیاب دیکھ کر لڑکی واپس آگئی، شرمندہ ہوئی، معافی مانگی... ایسے رو رو کر معافی مانگی کہ قاری پاگل ہو گیا... وغیرہ وغیرہ وغیرہ" وہ اب بیچ پوسٹ کو مزید سمجھانے لگے تھے۔

"یہ کیسے ممکن ہے...؟" میں نے اٹکا کر کہا پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ ناول میرے حالات زندگی پر مبنی ہے۔

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے... تم سوچو... تم لکھ سکتے ہو... بلکہ اچھا لکھا ہے تم نے، مگر اپنی سوچ کا زاویہ تبدیل کرو تو یہ جو میرے سامنے فقط ایک کاغذات کا پلندہ نما مسودہ ہے... یہ ایک "ایپک" ہو سکتا ہے۔" میں نے حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ مسکرائے۔

"میں سمجھاتا ہوں تمہیں..." انہوں نے سامنے پڑا مسودہ کھولا تھا پھر نہ جانے کون سا صفحہ کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"یہ دیکھو... یہاں..." وہ کچھ نکات بتانے لگے تھے۔ میں نا چاہتے ہوئے بھی ہمہ تن گوش تھا۔

مسٹر بکٹزی نے میرے ناول میں بہت سارے الفاظ واضح کیے۔ وہ چاہتے تھے میں اسے تھوڑا سا تبدیل کرکے اپنا زاویہ نظر پیش کروں۔ وہ میری زندگی کی کہانی کو ایک نئے رخ سے پیش کرنا چاہتے تھے۔

انہوں نے کچھ باتیں بہت اچھے طریقے سے مجھے سمجھائیں۔

"یہ ناول تمہارا ہے، تمہارا تھا، تمہارا رہے گا، مگر جب تک یہ تمہارے شیلف پر موجود رہے گا۔ جب تم ارادہ کرو گے کہ تم اسے پبلک کے لیے شائع کرنا چاہتے ہو تو ظاہر ہے اس پر اپنے احساس ملکیت کو ختم کرنا پڑے گا۔ تمہیں اس رخ پر سوچنا ہی پڑے گا جو پڑھنے والے کی آنکھ دیکھنا چاہتی ہے، تب تمہیں غیر جانبدار ہونا ہی پڑے گا۔ ایک ناولسٹ کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ اپنا زاویہ نظر۔ غیر جانبدار ہو کر پڑھنے والوں کے سامنے رکھے۔"

ان کی بات میں مجھے دم محسوس ہوا۔ میں لکھتے ہوئے اپنی پسند اور ناپسندیدگی کو جس طرح مرضی ظاہر کرتا، پڑھنے والے اسے اپنی مرضی کے معنی پہنانے کے معاملے میں آزاد تھے۔ غیر جانبدار ہونا یقیناً ایک لکھنے والے کے لیے ایک اچھی خصوصیت ہو سکتا تھا۔ میں ابھی اسی نہج پر سوچ رہا تھا کہ مسٹر بکٹزی نے ایک الگ موقف پیش کیا۔

"یہ تو ہو گئی وہ خوبی جو کسی بھی تحریر کو کامیاب بنا سکتی ہے مگر لکھنے والوں کو کامیاب کرتی ہے ایک اور خوبی... وہ ہے اس کی قلم کی مضبوط دلیل... اس کا پر اثر انداز... وہ جو بات لکھے اس انداز میں کہ پڑھنے والا اسے ہی درست، حقیقت اور حتمی سمجھے... پڑھنے والوں کو پتا بھی نہیں چلے کہ لکھنے والے نے کیسے اس کے دماغ کو گھما کر اس میں اپنا موقف انڈیل دیا ہے۔ یہ خوبی آفاقی ہوتی ہے اور استعمال صرف عقل مند لکھاری ہی جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر اس طرح پیش کر سکتا ہے کہ پڑھنے والے اس کی رائے سے سو فیصد متفق ہو جائیں۔ اس لیے اس میں سے منفی کرداروں کو ختم کرو۔"

وہ بہت مطمئن انداز میں اپنی بات کی وضاحت کر رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو بڑا مشکور محسوس کیا۔

"مجھے اچھا لگا... میں آپ کا شکر گزار ہوں...

نہیں آنٹی! لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھوں گا۔" میں نے ممنون ہوتے ہوئے کہا۔

"آنٹی! کیوں... ابھی کیوں نہیں؟" انہوں نے بھنویں اچکاتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ جو تبدیلیاں چاہتے ہیں وہ کروں گا... وہ کردار جو کسی نہ کسی منفی رنگ لیے ہوئے ہیں، میں اس منفی رنگ کو کم کرنے کی کوشش کروں گا... مگر میں اسے بالکل ختم نہیں کر سکتا... دنیا میں گناہ گار ابھی ختم نہیں ہوئے... وہ ہر دور میں موجود ہوتے ہیں کیونکہ گناہ ہر دور میں شکل بدل بدل کر سامنے آتا ہے۔"

میں نا چاہتے ہوئے بھی ان کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"میں تمہاری بات رد نہیں کروں گا۔ مجھے بھی اچھا لگا کہ تم میری بات مان کر اپنی تحریر میں تبدیلیاں کرنے پر راضی ہو... یہ آسان نہیں ہوتا کہ اپنے لکھے ہوئے الفاظ کسی کے کہنے پر ایک زاویہ نظر کی طرف لے جانا... میں لکھتا نہیں ہوں مگر روز میرا واسطہ بہت سے لکھنے والوں سے پڑتا ہے... میں اچھے لکھنے والے کی دل سے قدر کرتا ہوں اور اچھی تحریر کا میں دل سے قائل ہوں۔ تحریر ذہنوں پر اچھا اثر چھوڑتی ہے... یہ بڑا مقدس کام ہے... اس کی اہلیت ہر ایک میں نہیں ہوتی... تم میں ہے۔"

وہ تمہید باندھ کر تعریف کرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے مگر مجھے ان کی تعریف اچھی لگی۔ تعریف کسے بری لگتی ہے۔

"اور... یہ جو ایک کردار ہے۔" انہوں نے عینک کو ناک پہ سیٹ کرتے ہوئے کاغذ پہ انگلی رکھی جہاں تمام کرداروں کی لسٹ انہوں نے چن کر خود ہی مرتب کی ہوئی تھی۔

"ابن یافع..." انہوں نے اس نام پر انگلی رکھی۔ یہ وہ واحد نام تھا جو میں نے ناول میں تبدیل کیے بغیر لکھا تھا۔

"ابن یافع کے کردار کو ختم کر دو۔" وہ یک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ مجھے دھچکا لگا۔ "ابن یافع" اس ناول کا بہترین کردار تھا۔ میں نے ابن یافع کی تمام تر خصوصیات کو تحریر کے قالب میں ڈھالتے ہوئے اپنے ہنر کا بھرپور استعمال کیا تھا۔

"یہ سارے ناول کی جان ہے مسٹر میکنزی..." میں نے قطعیت سے کہا۔

"ایک سیاہ فام... جو کہ مسلم بھی ہے۔ اسے ہیرو بنا کر پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

میں نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔

"وہ ہیرو نہیں ہے..." میں ابھی یہی کہہ سکا تھا کہ انہوں نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں مجھے دیکھا۔

"ہیرو اس کے گرد پورے ناول میں بھنورے کی طرح چکر لگا رہا ہے۔ وہ مرکزی کردار سے زیادہ اہم نظر آتا ہے۔ ہیرو اسے پوری تحریر میں آئیڈیلائز کر رہا ہے... کیوں؟" وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

"کیوں نہیں؟" میں نے الٹا پوچھا۔

"ابھی تمہیں اس بات کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے کہ تمہیں فولونگ نہ بڑھنے سے کیا نقصان ہوتا ہے... تمہیں فولونگ تب بڑھے گی جب تمہارے لکھے ہوئے میں لوگوں کا اپنا رنگ ہوگا۔ اپنا عکس نظر آئے گا۔ ہمارا ناول کم از کم ایسا ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کے ذہنوں کو براہ راست ہٹ کرے۔ یہ ناول اگر تم اپنے لوگوں کے لیے لکھ رہے ہو تو وہ تمہارے جیسے ہی ہوں گے... وہ سیاہ فام ہوں گے نہ ہی مسلم... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ مجھے ان کی گفتگو میں "ریزم" کی جھلک محسوس ہوئی۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا پھر جیسے اکتا کر میں نے اس کے سامنے پڑے مسودے کو دیکھا۔

"مجھے ایسے مت دیکھو... میں تمہیں کامیابی کے گر سکھا رہا ہوں... اسے ہماری زبان میں تکنیک کہتے ہیں... تم نے لکھ لیا، لوگوں نے پڑھ لیا... کام

ختم ۔ یہ تکنیک نہیں ہے ۔ تکنیک یہ ہے کہ تم ایسے لکھو کہ لوگ اسے اپنی کہانی سمجھ کر پڑھیں اور صدیوں نہ بھول سکیں ۔ پھر تم نہ صرف شہرت بلکہ دولت بھی کما سکو گے ۔۔۔ میں تمہیں پبلسٹی ہی نہیں مارکیٹنگ بھی سکھاؤں گا۔" وہ اب بغور میرا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی انگلی کے نیچے بے لفظ کو دیکھا تھا۔

"مین بانع" میرا ناول ۔۔۔ سکا تھا مگر مسٹر میکنزی کی بات ماننے میں میرا ہی فائدہ تھا۔ میں اس ناول کے لیے اتنا جنونی ہو چکا تھا کہ اب ہر بات ماننے کے لیے تیار تھا۔ مجھے ہر حال میں اپنا آپ منوانا تھا اور اس کے لیے میں ہر حد تک جا سکتا تھا۔

اگلے چند مہینے میں ان تمام نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے ناول پہ کام کرتا رہا جو مسٹر میکنزی نے مجھے سمجھائے تھے۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ بہت ساری چیزیں ایسی تھیں جو میری منشاء اور حقیقت کے برخلاف تھیں اور جن پہ میرا دل راضی نہیں تھا مگر پھر بھی میں ان کو اپنے ناول میں شامل کرتا چلا جا رہا تھا۔ اب یہ ناول میری زندگی کی کہانی نہیں تھا۔ یہ بہت تبدیل ہو چکا تھا مگر میں بھی کیا کرتا ۔۔۔ میرے ناول کا مسترد کیا جانا میرے اعصاب پر بہت بھاری پڑ رہا تھا۔ مجھے ناکامی کا احساس تھکا نہیں رہا تھا بلکہ توڑ رہا تھا۔ میں نے تعلیم بھی ادھوری چھوڑ دی تھی اور میں ادیب کے طور پر بھی اپنی پہچان بنانے میں ناکام ہو رہا تھا۔ مجھے دولت کی ہوس نہیں تھی لیکن میں مشہور ہونا چاہتا تھا۔ میں اپنا آپ منوانا چاہتا تھا۔ میں دنیا کو اپنی اہمیت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ میرا احساس کمتری لاوا بن کر پکنے لگا تھا۔ میں بس ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ مجھے ادیب بن کر دکھانا تھا۔ میرا جنون مجھ پر حاوی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

یہ ان ہی دنوں کی بات تھی۔ میں ایک شام اوپن ایئر کیفے ٹیریا میں بیٹھا کافی کے گھونٹ لے رہا تھا جب مجھے احساس ہوا کہ جیسے میں کسی کی نگاہوں کی زد میں ہوں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی شناسا جانا پہچانا نظر نہیں آیا۔ میں دوبارہ کافی کے کپ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جب کسی نے انگلیوں سے میز کی سطح کو بجایا۔

"ہیلو ۔۔۔ کیا میں آپ کے ساتھ کافی شیئر کر سکتا ہوں؟"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ تیس پینتیس سال کا اچھا جوان توانا شخص تھا۔ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے نگاہ دوڑائی۔ بہت سے میز خالی تھے مگر پھر بھی وہ شخص نجانے کیوں میرا ساتھ چاہ رہا تھا۔ میں نے کندھے اچکائے۔

"او شکریہ ۔۔۔۔ آپ سے مل کر اچھا لگا ۔۔۔ میں نیو کمر ہوں۔"

میں نے گردن ہلائی۔ اس کے ہاتھ میں بھی اسٹار بکس کیپچینو کافی کا بڑا سا ڈسپوزیبل مگ تھا۔ اس نے میرے کپ سے اپنے کپ کو ذرا سا ٹکرایا۔ اب کی بار گردن ہلانے کے ساتھ مجھے مسکرانا بھی پڑا۔

"آج کا موسم کافی خوشگوار ہے ۔۔۔۔ مزاج پر اچھا اثر پڑ رہا ہے۔" وہ کافی بے تکلف طبیعت کا مالک لگتا تھا۔ میں نے گردن ہلا دی۔ مجھے جلدی جلدی لوگوں سے بے تکلف ہو جانے کی عادت نہیں تھی۔

"میں اگر غلطی پر نہیں ہوں تو آپ لکھاری ہیں ۔۔۔ ہیں نا؟" اس شخص کے نئے سوال نے مجھے چونکا دیا اور یہ سوال اس قدر بے ساختہ تھا کہ میں اپنی حیرانی کو چھپا نہیں پایا۔

"میں نے آپ کو مسٹر میکنزی کے آفس میں دو ایک بار دیکھا ہے ۔۔۔۔ آپ حیران مت ہوں۔"

وہ خود ہی مسکرایا۔

"آپ بھی لکھتے ہیں؟" مجھے بھی پوچھنے کے لیے ایک سوال مل گیا تھا۔

"ارے نہیں ۔۔۔" اس نے کافی کے کپ والا ہاتھ ہوا میں بلند کر کے انکار کیا۔

"میرا بس ایک شوق ہے ۔۔۔ اچھی کتاب پڑھنا اور پھر اسے دوستوں کو تحفتاً" دینا ۔۔۔ مسٹر میکنزی میرے ذاتی دوستوں میں سے ایک ہیں ۔۔۔ ان سے اکثر ملاقات رہتی ہے۔"

"سن کر اچھا لگا۔ کتاب پڑھنا بہت سے لوگوں کا مشغلہ ہوتا ہے۔ اچھی کتاب پڑھنے والے کم ہی ملتے ہیں۔"

میں نے رسمی سے انداز میں کہا۔ وہ مسکرایا۔

"میں نے سنا ہے، آپ کو بہت سی زبانیں آتی ہیں؟" اس نے پھر ایک چونکا دینے والا سوال کیا۔

"نہیں جناب! یہ تو کسی نے بے پرکی اڑا دی۔ تھوڑی بہت شُد بُد کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے بہت سی زبانیں آتی ہیں۔"

میں نے اپنی الجھن چھپا کر جواب دیا۔

"آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں شاید... میں جانتا ہوں۔ آپ ہندی، عربی اور فرانسیسی بول سکتے ہیں۔"

اس نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ میں دل ہی دل میں اس کی معلومات پر کافی حیران ہو رہا تھا۔ یہ سچ تھا، مجھے یہ تینوں زبانیں آتی تھیں۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ فرانسیسی کے علاوہ باقی دونوں زبانوں پر عبور حاصل نہیں تھا۔

"میں نے وہ مسودہ پڑھا ہے جس پر آپ آج کل از سرِ نو محنت کر رہے ہیں۔"

وہ میز کی سطح پر جھکا تھا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھا۔

"ناول لکھ لینا اتنا بڑا کام نہیں... بڑا کام اسے پبلک میں پروجیکشن دلوانا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"میں پہیلیاں بوجھنے میں بہت نکما ہوں... بچپن سے..." میں نے اکتا کر کہا۔ وہ شخص جو چاہتا تھا، اسے بتانے کے لیے اتنے معمے سلجھانا اتنا ضروری نہیں تھا۔

"میں آپ کو پروجیکشن دلوا سکتا ہوں... تمام مشہور بڑے اخبارات میں آپ کے ناول کے متعلق مقالے چھپوا سکتا ہوں... بڑے بڑے نقادوں کی آراء سے آپ کے ناول کے پچھلے صفحات کو بھر سکتا ہوں۔ ٹی وی پروگرامز میں آپ کی تعریف میں خبر چلوا سکتا ہوں۔ آپ راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جائیں گے۔"

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"مجھے کیا کرنا ہو گا؟" میں نے ناسمجھی کے عالم میں پوچھا۔ وہ میز کی سطح پر جھک آیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"لوگ دیکھ رہے ہیں اپنا منہ بند کرلیں۔"

☆ ☆ ☆

"میں اپنی زندگی سے اکتا چکی ہوں۔" اس نے سامنے کسی نادیدہ چیز کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ نیمو نے بھنے کے دانوں کو منہ میں گھماتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ وہ کیسی پھیکی پھیکی سی لگتی تھی۔ اس پر ماحول کا بھی کوئی مثبت اثر نہیں تھا۔ 2012ء کی مارچ کے نوخیز دن بھی اسے خوش نہیں کر پا رہے تھے حالانکہ ہر چیز کتنی مکمل تھی۔

سورج کی نرم کرنیں نئی دلہنوں کی طرح روپہلی چنریاں اوڑھے شرمائی شرمائی پھرتی تھیں۔ ان کی جولانی عروج پر نہیں تھی لیکن زوال کا سماں بھی نہیں تھا۔ موسم سردیوں سے گرمیوں کی جانب جاتے ہوئے بہار کے اڑن کھٹولے پر سوار خوشگوار ہواؤں کے لبادے میں مست ہوا پھرتا تھا۔ بہار کا سنہرا سنہرا رنگ آنکھوں کو خیرہ کیے دیتا تھا۔ گھاس کا سبز رنگ، درختوں کے سبز پتے اور اس کا اپنا سبز کرتا بہار کے اس سنہرے عکس سے جھلملائے جاتے تھے۔ رنگ برنگے پھول اپنا سارا مال و متاع فضاؤں کو خوشبودار بنانے میں قربان کیے دے رہے تھے۔ جو اس جیسے کہیں گم ہوئے جاتے تھے۔ دل کو پتا نہیں کس چیز سے بنایا گیا ہے کہ اچھے رنگوں سے، اچھی خوشبو سے، اچھے لفظوں سے، اچھی آوازوں سے مچلنے لگتا ہے لیکن یہی دل جس "چیز" کے لیے بنایا گیا ہے اگر اس کی جانب سے بادِ نسیم جیسی ٹھنڈی ہوا نہ آتی ہو تو پھر یہی دل اچھے رنگوں سے، اچھی خوشبو سے نہ اچھے لفظوں سے اور نہ ہی اچھی

آواز سے بہلایا جا سکتا ہے۔ اس کا دل بھی ضدی ناراض بچے کی طرح جا کر پہلو میں بائیں کروٹ پر منہ بسورے اکتایا ہوا پڑا تھا۔

اس کے چہرے پر جذبات کی اتنی بے رنگی تھی کہ ساتھ بیٹھے نیو سے یہ کہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی باتوں سے زیادہ اس کا چہرہ پیچیدہ لگ رہا تھا۔ نیو انگلیوں کی پوروں سے ویفرز و چیری والے الگ کرتا تھا پھر جب کسی لیں دس بارہ جمع ہو جاتے تو انہیں پھانک لیتا۔ اس نے زارا کی ہر بات کو تحمل سے سن لیا تھا۔

"مجھے زندگی میں کبھی ڈاکٹر نہیں بننا تھا۔ مجھے یہ پروفیشن پسند ہی نہیں ہے۔ میں فطرتاً "مسیحائی" کے قابل نہیں ہوں۔" بات جہاں سے شروع ہوئی تھی اور پھر درمیان سے ماں پر ہوا۔

"می مجھے آج تک سمجھ نہیں سکیں۔ ان کے لیے میں ہمیشہ احمق ہی رہوں گی۔ وہ مجھ سے خفا ہی رہتی ہیں۔" اور اختتام اس جملے پر ہوا تھا۔

"شہروز کو میری پروا نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے اس کے لیے میرے علاوہ سب اہم ہیں۔" ساری باتیں سن لینے کے بعد نیو نے حتی الامکان اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہر شخص مسیحا بن بھی نہیں سکتا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ یہ کوشش ترک کر دے۔ یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ مسیحائی نبیوں کا شیوہ ہے۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ جو نبیوں کا شیوہ رہا ہے وہ تمہارا پیشہ ہے۔" وہ منہ میں موجود دانے نگل کر درمیانے قصے پر آیا تھا۔

"مائیں کبھی اولاد سے خفا نہیں ہوتیں۔ ان کی کتابوں میں خفگی نام کے چیپٹر کی جگہ خالی ہوتی ہے ڈاکٹر۔" آخری بات کے لیے اسے مطمئن کرنا نیو کو کافی مشکل لگا تھا۔

"تمہیں اس بات کی پروا نہیں ہونی چاہیے کہ تم شہروز کے لیے اہم ہو یا نہیں۔ تمہیں بس اس بات کی پروا ہونی چاہیے کہ شہروز کے علاوہ باقی سب تمہارے لیے غیر اہم ہیں۔"

"میں اپنی زندگی سے اکتا چکی ہوں۔" زارا نے سب کچھ کہہ لینے کے بعد کہا تھا۔

"وقت ٹھہرے گی۔ تم ابھی بھی وہیں بھائی پھیرو کے بے رنگ و روغن ریلوے اسٹیشن پر کھڑی ہو۔۔۔ زندگی بھی کہاں خوش ہوگی تم سے۔"

اس نے ہاتھ میں بھرے بھنے کے دانے اس کے ہاتھ میں دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے جل کر کہا تھا۔ زارا نے بھی ہاتھ پھیلا کر وہ دانے لے لیے۔ نیو پھر سے بھنے کے دانے ادھیڑنے لگا تھا۔

زارا کا دل چاہا اپنا بیگ اٹھائے اور وہاں سے چلی جائے۔ وہ نوے منٹ کی ڈرائیو کر کے لاہور سے رائیونڈ ایسی باتیں سننے نہیں آئی تھی۔ ایسی باتیں سنانے والے لاہور میں بھی بہت تھے۔ نیو کے ساتھ اس کی علیک سلیک کافی پرانی تھی۔ سال ڈیڑھ سال قبل ان کی پہلی ملاقات سروسز اسپتال میں ہوئی تھی۔ نیو چند مریضوں کو ایمرجنسی وارڈ لایا تھا اور ڈاکٹرز تب پہلی دفعہ ہڑتال پہ بیٹھے تھے۔ ایمرجنسی وارڈز کھلے تھے لیکن جونیئر ڈاکٹرز باوجود تعاون کرنے پر تیار نہیں تھے۔

"جب مریض تم لوگوں کے پاس آتا ہے تو وہ علاج کروانے نہیں آتا وہ شفا پانے کے لیے آتا ہے جو تم لوگ نہیں دے سکتے۔ تم لوگ خود بھی جانتے ہو کہ ڈاکٹرز صرف علاج کر سکتا ہے شفاء اللہ کی ذات دیتی ہے۔۔۔ ذرا سوچو اگر اللہ کہہ دے کہ مجھ سے مت مانگو میں بھی ہڑتال پر ہوں۔۔۔ ڈر نہیں لگتا تم لوگوں کو ایسے وقت سے۔۔۔ اور نہ مسیحا کہتے ہو خود کو۔"

نیو نے وارڈ میں موجود تین ڈاکٹرز کو اچھی خاصی سنائی تھیں۔ وہ سب ڈاکٹر لڑکیاں تھیں "سو فوراً" ان کے دل پسیج گئے تھے۔ ان ڈاکٹرز میں ایک زارا بھی تھی۔ دوسری ملاقات مرید کے کے ایک فری کیمپ میں ہوئی تھی جہاں نیو والنٹیئر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ وہ زارا کو سادہ سا نیک انسان لگا۔ یہیں ان دونوں کے درمیان فون نمبرز کا تبادلہ ہوا تھا اور علیک سلیک دوستی تھی۔ نیو اکثر مریضوں کو اسپتال لاتا رہتا تھا۔ اسے ریفرنس کے لیے بھی اکثر زارا کو کال کرنا پڑتی

تھی۔ وہ بھی کبھی بلاوجہ بھی ایک دوسرے کو فون
کر لیتے تھے۔ زارا کو بھی وہ مخلص سادہ سا انسان اچھا
لگتا تھا۔ اس کی سب سے اچھی خصوصیت یہ تھی کہ
وہ ایک بہترین سامع تھا۔ اسے لوگوں کی باتیں سننے اور
انہیں برداشت کرنے کا ہنر آتا تھا۔ اس کی شخصیت
میں کوئی ایسی صلاحیت تھی کہ اس کے سامنے دل
کھول کے رکھ دینے کو دل چاہتا تھا۔ زارا کو اس سے
بات کر کے ہمیشہ اچھا لگتا تھا اور چونکہ وہ اس کے
سرکل کا نہیں تھا اس لیے اس سے پرسنل ڈسکس
کرتے ہوئے اسے کبھی یہ خدشہ لاحق نہیں ہوا تھا کہ
بات ممی تک پہنچے گی۔ وہ ایک بار پہلے اس کے گاؤں
فری کیمپ کے لیے بھی آئی تھی لیکن اس بار وہ صرف
اپنی خاطر آئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ ذہنی طور پر ماحول
بدلنا راس آ سکتا تھا۔ سو وہ اسی لیے یہاں آئی تھی اور
نیو ولنٹیئر یہ باتیں کر کے اس کا دل بہلا رہا تھا۔

"تمہارا مسئلہ پتا ہے کیا ہے۔ تم کھانا نہیں
کھاتیں۔ تمہارے اندر کمزوری ہے۔" نیو نے پھر
اس کے ہاتھ میں دانے دینے چاہے تھے۔ زارا نے
ایک دانہ بھی منہ میں نہ ڈالا تھا۔ اس نے پہلے سے
سو وہ دانے بھی نیو کے ہاتھ میں واپس رکھ دیے۔

"میرا مسئلہ دراصل یہ ہے کہ میں واقعی پاگل
ہوں۔ میں ان لوگوں میں ہمدردی ڈھونڈتی پھرتی ہوں
جنہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے کہ میں
چاہتی کیا ہوں۔" وہ غصے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"ارے۔۔۔ اچھا مجھے بتاؤ تم چاہتی کیا ہو ڈاکٹر؟"
اس کا ارادہ بھانپ کر نیو نے کہا تھا۔ وہ دونوں لہلہاتے
کھیت کے ایک طرف پگڈنڈی سے نیچے اتر کر ایک
چھوٹے سے بنچ پر بیٹھے تھے۔ زارا اپنی جگہ سے اٹھ
کھڑی ہوئی تھی۔ اسے مزید وقت ضائع کر کے کیا
حاصل ہو جانا تھا۔

"ایسے ناراض ہو کر مت جاؤ۔ مہمان ناراض ہو کر
چلا جائے تو سارے گاؤں والے تھو تھو کرتے ہیں۔
ناک کٹ جاتی ہے بندے کی۔" وہ بھی اس کے ساتھ
ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ زارا نے ایک نظر اسے دیکھا اور نرم پڑ
گئی۔ نیو کی یہ ایسی ہی عادت تھی۔

"میں بس اتنا چاہتی ہوں مجھ سے آپ جیسے لوگ ایسے
ٹریٹ کرنا چھوڑ دیں جیسے میں بے وقوف ہوں۔ وہ
میری عزت کریں۔ میرا احترام کیا جائے۔ میری
خوشنودی کا خیال رکھا جائے۔ میرے رونے کو سوپ
سیریل نہ سمجھا جائے۔ مجھ سے محبت کی جائے۔
میرے سینئرز میری تعریف کریں کہ میں سب سے
اچھی ڈاکٹر ہوں۔ وہ مجھے حقارت کی نظر سے نہ
دیکھیں۔ ممی مجھے بے وقوف سمجھنا چھوڑ دیں۔ شہروز
مجھے اہمیت دے، صرف مجھ سے محبت کرے، مجھے ہر
چیز پر ترجیح دے۔ اسے میں ہی میں نظر آؤں۔ اس کے
دل پر صرف میرا قبضہ ہو۔" وہ چلتے چلتے بول رہی تھی۔
نیو بھی ساتھ چلنے لگا۔ اس کی خواہشات کا ایک طویل
سلسلہ تھا۔ نیو کے چہرے کے تاثرات ہر خواہش پر
تبدیل ہو رہے تھے۔ آخری خواہش پر وہ چلتے چلتے
رک گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر آنکھیں
سکیڑ کر اسے دیکھا۔ کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا۔ پھر
سر ہلا کر چپ ہو گیا۔ وہ پہلے سے جانتا تھا زارا کو شہروز
نام کا عارضہ لاحق ہے۔

"میں تمہیں ایک کام کی بات بتاؤں۔۔۔ تمہیں
بہت ساری چیزیں چاہئیں اور زندگی میں اپنی من پسند
چیز حاصل کرنے کا ایک گر ہے۔ جس چیز کی طلب ہے
اسے بانٹ دو، اسے اپنے پاس چھپا کر نہ رکھو، دوسروں
کو دے دو۔ اس طرح وہ چیز پلٹ کر آپ کے پاس
واپس آ جائے گی۔ یعنی علم چاہیے تو جو علم اللہ نے
آپ کو دیا ہے۔ اسے اللہ کے بندوں میں بانٹ دو،
محبت چاہیے تو اللہ کے بندوں میں محبت بانٹ دو،
عزت چاہیے تو اللہ کے بندوں کو عزت دو، یعنی جو
چاہیے وہ اللہ کے بندوں کو دینا شروع کر دو۔ محبت،
دولت، عزت، علم، رزق، جو بھی چاہیے ہو اسے اپنے
پاس نہ رکھو۔ اسے محدود نہ کرو۔ اس کا راستہ نہ روکو۔
اسے راستہ دو، تاکہ وہ اسی راستے پر پلٹ کر دوگنا چوگنا
ہو کر آپ تک واپس آ جائے۔" زارا نے چلتے چلتے
اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ مسکرایا۔ وہ ایسا ہی تھا عام سا کم

پڑھا لکھا انسان' لیکن زارا کے کام ہمیشہ آجاتا تھا۔

"اب بتاؤ کیا چاہتی ہو ڈاکٹر۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"سکون۔۔۔ مل جائے گا کیا؟" زارا کو پتا تھا اسے کس چیز کی کمی ہے۔ میو نے اس کا چہرہ دیکھا۔ پھر یک دم اس کے سامنے آگیا۔ ایسے کہ اس کا رستہ رک گیا تھا۔

"بے شک۔۔۔ اللہ کے بندوں کو بے سکون کرنا چھوڑ دو۔" وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پراسرار سے انداز میں مسکرایا تھا۔

"ادھر میری طرف دیکھو۔" وہ بولا تھا۔ زارا پہلے ہی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

اس نے اس کے چہرے کی جانب اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں گھمانی شروع کی تھی۔ جیسے جادوگر فلموں میں گھمایا کرتے ہیں۔ جب کوئی منتر پڑھا جا رہا ہو۔ وہ سابقہ انداز میں مسکراتے ہوئے چند لمحے ایسے ہی کرتا رہا۔ زارا پہلے حیرانی سے اسے دیکھتی رہی' پھر خود بخود اس کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی تھی۔ اس کے لیے یہ ایک بچگانہ طرز عمل تھا۔ جس لمحہ زارا مسکرائی۔ اسی لمحے میو نے اپنی مٹھی بند کرلی تھی۔ جیسے کوئی تتلی دبوچ لی ہو۔ پھر اس نے بایاں ہاتھ بڑھا کر زارا کا ہاتھ پکڑا تھا اور اس میں وہ نادیدہ دبوچی ہوئی چیز رکھ کر اس کی ہتھیلی بند کردی تھی۔

"یہ لیں یہ تمہاری ساری بے سکونی میں نے تمہاری ہتھیلی میں بند کردی ہے۔ گھر جا کر دو رکعت نماز پڑھنا اور ساری بے سکونی اللہ کے سپرد کردینا اور کہنا یا اللہ مجھے معاف کردے میں تیرے بندوں کے لیے کبھی بے سکونی کا موجب نہیں بنوں گی۔ ان شاءاللہ تمہارا سکون تمہیں مل جائے گا۔ اور یاد رکھنا اللہ کا شکر ادا کرنا نہ بھولنا۔ شکر ادا کرنے کی اہلیت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ شکر گزاری ایک خصوصیت ہے۔ جس کے بطن سے سکون جنم لیتا ہے۔ اس لیے کثرت سے شکر ادا کرنا۔ کیونکہ اللہ بہت باتوں میں اپنے بندوں کی طرح ہوتا ہے۔ اسے بھی جو چیز پسند ہے۔ وہ اسے بانٹ دیتا ہے۔ تاکہ اس کی کثرت میں اضافہ ہو۔ وہ انسان کو شکر گزار ہونے کے بے تحاشا مواقع دیتا ہے۔ کیونکہ اسے کثرت سے ملنے والی شکر گزاری پسند آتی ہے۔" زارا نے اس عام سے انسان کا چہرہ دیکھا تھا' جہاں بہار کے سنہرے رنگ سے بھی زیادہ سنہرا رنگ تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلی کو مزید سختی سے بند کرلیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سفر ایک ہی سمت میں ہو' پرسکون ہو اور من پسند ساتھی کی ہمراہی میں ہو تو بہت آسانی اور روانی سے کٹ جاتا ہے۔ عمر اور امائمہ نے بھی آٹھ مہینے بخیر و خوبی ایک ساتھ گزار لیے تھے۔ نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔ اس لیے ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی محبت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

امائمہ ان آٹھ مہینوں میں ماحول اور آب و ہوا کی مکمل عادی ہوچکی تھی۔ اور عمر اس کا عادی ہوگیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی ہمراہی میں بہت خوش تھے۔ امائمہ کو اپنی زندگی پر بعض اوقات جنت کا گمان ہوتا تھا۔ وہ گھر پر رہتی تھی۔ ٹی وی دیکھتی تھی۔ میگزین پڑھتی تھی۔ ممی سے فون پر گپیں لڑاتی تھی۔ اپنے دوستوں سے انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ رکھتی تھی اور ان سب چیزوں کے بعد وہ صرف عمر کا انتظار کرتی تھی۔ وہ ایسی گھر ہستن کبھی بھی نہیں تھی۔ جیسی اب ہوگئی تھی۔ امائمہ کبھی کبھی اپنا لائف اسٹائل دیکھ کر خود حیران ہوجاتی تھی۔ وہ خود کو بہت پریکٹیکل سمجھا کرتی تھی۔ شادی کے بعد بھی کتابوں کے ساتھ ان ٹچ رہنے کا دعویٰ کرنے والی' کسی اچھے اخبار یا چینل پر جاب حاصل کرنے کی خواہش مند امائمہ کو اب اپنے شوہر کے لیے سجنے سنورنے اور اس کے لیے کیک پیزا بیک کرنے میں زیادہ لطف محسوس ہوتا تھا۔

وہ اپنے حال میں مست بہت مطمئن زندگی گزار رہی تھی اور شاید ایسے ہی گزارتی چلی جاتی جو اسے اس روز امی فون پر جھنجوڑ نہ ڈالتیں۔

"تم بہت بدل گئی ہو امائمہ۔۔۔" امی کے لہجے سے اتنا تاسف جھلک رہا تھا۔ کہ امائمہ فون کان سے لگائے

شرمندگی میں ڈوب گئی۔ تمر اسے پتا تھا کہ وہ امی کو منالے گی۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں تمہیں یہ جملہ کہوں گی۔ لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں' سب شوہروں کو پیاری ہو جاتی ہیں۔ مگر تمہارے جیسا حال نہ کسی کا دیکھا' نہ سنا۔ غضب خدا کا۔۔۔ ایسا تو فلموں میں بھی نہیں ہوتا۔"

امی اسے لتاڑ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے ساتھ مسکراہٹ بھی جھلکنے لگی تھی۔

"اس کا مطلب آپ نے فلمیں دیکھنا شروع کر دی ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔ اس کا مقصد ان کے مزاج کو خوش گوار کرنا تھا۔ امی نے سرد آہ بھری' اتنی سرد کہ میلوں کوسوں دور بیٹھی امائمہ کا دل منجمد ہو گیا۔

"میری اپنی زندگی فلم بن گئی ہے۔ مجھے کیا دلچسپی عام فلموں میں۔" وہ اپنے لہجے کا درد چھپا نہیں پائی تھیں۔ امائمہ کو دلی افسوس ہوا۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو کئی کوسنے دے ڈالے۔

"ہم نے دیکھی ہے کبھی ایسی فلم جو ایک بوڑھی عورت کے گرد گھومتی ہو' حالانکہ اس عورت کی زندگی میں فقط انتظار کے اور کچھ بھی نہ ہو۔ وہ انتظار سے اکتا چکی ہو' تھک چکی ہو' لیکن انتظار اس سے اکتایا ہو نہ ہی تھکا ہو۔"

وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہی تھیں اور ان کا ایک ایک لفظ امائمہ کے دل پر بجلی بن کر گر رہا تھا۔

"امی۔۔۔ ایسے تو مت کہیں' آپ تو بہت باہمت ہیں' بہت حوصلہ مند۔۔۔" وہ ان کو حوصلہ دینا چاہتی تھی۔ مگر دے نہیں پائی۔ اسے خود ہی اتنی شرمندگی ہو رہی تھی۔

"بے کار کی باتیں ہیں امائمہ۔۔۔ میرے دل کی جو حالت ہے نا۔۔۔ ایک باہمت اور حوصلہ مند عورت کا دل ایسا نہیں ہوتا۔ تم ماں نہیں ہو نا' اس لیے نہیں سمجھ پاؤ گی۔" وہ طنز کر رہی تھیں۔ مگر آواز میں سنجیدگی اور دکھ غالب تھا۔

"امی۔۔۔ پلیز۔۔۔ اتنا مت تھکائیں خود کو۔۔۔ آپ۔۔۔" اس کے پاس تو لفظ ہی ختم ہو گئے تھے جو وہ امی کو تسلی دینے کے لیے بول سکتی۔

"میں واقعی تھک گئی ہوں۔ بہت تھک گئی ہوں۔ امائمہ بہت سال ہو گئے ہیں بہت سال۔۔۔ اس کا کچھ پتا نہیں۔۔۔ کوئی ایک جھوٹی خبر ہی آجائے کہیں سے تو سکون آجائے۔۔۔ تم میری حالت کا اندازہ تو کرو۔ ایک ماں کے دل سے پوچھو تو سہی۔۔۔ کسی نے جلتے توے پر بٹھا رکھا ہے مجھے۔"

امی کی باتیں اسے کچوکے لگا رہی تھیں۔ انہوں نے اس کا حال نہیں پوچھا تھا۔ اس کی زندگی کے متعلق کوئی استفسار نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی مطلب کی بات کر رہی تھیں۔

"امی! مجھے اندازہ ہے۔۔۔ میں کوشش بھی کر رہی ہوں۔۔۔ مگر۔۔۔ امی۔۔۔ یہ بھی تو سوچیں کیا پتا۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ امی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کیا پتا۔۔۔ مت کہو امائمہ۔۔۔ یہ لفظ تو بولو ہی مت۔۔۔ اس کیا پتا کے بعد میرا سارا حوصلہ ختم ہو جاتا ہے۔۔۔ مرے ہوئے کو نہیں مارا کرتے میری بچی۔"

ان کے الفاظ نہیں تھے۔ سیاہ بادل تھے۔ کڑکتی بجلی تھے۔ امائمہ کی آنکھوں سے بارش برسنے لگی۔

"تم یہ سب مت کہو۔۔۔ یہ سب باتیں مجھے بہت بودی لگتی ہیں۔ تمہاری شادی نے مجھے ایک نئی امید دی تھی۔ میں پچھلے تین' چار سالوں سے اسی امید کو پال پوس کر زندہ ہوں۔ مجھ سے میری امید مت چھینو۔۔۔ اتنی خود غرض مت بنو۔"

امی کے دل پر اس کے آنسوؤں نے خاک اثر کرنا تھا۔ وہ تو خود رو رہی تھیں۔

"مجھے معاف کریں امی۔۔۔ پلیز مجھے معاف کردیں۔"

وہ ہچکیوں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ امی کے لیے یہ دہرا دکھ تھا۔ انہوں نے اپنی عزیز از جان بیٹی کو رلا دیا تھا۔ وہ انہیں اتنی عزیز تھی کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اور آج وہ ان کی وجہ سے

رو رہی تھی' مگر وہ بھی کیا کرتیں۔ وہ بہت مجبور ہو کر اپنی بیٹی کے سامنے ہی دل ہلکا کر سکتی تھیں اور یہ بات امائمہ سے بہتر کون سمجھتا تھا کہ امی کے پاس دکھ کہنے کے لیے صرف وہی تو تھی اور اس نے بھی عرصہ ہوا امی کے دکھ سننے چھوڑ دیے تھے۔ وہ رونے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

"معافی مت مانگو میری جان۔ بس اپنا وعدہ پورا کردو۔ میری خاطر۔ پلیز۔ یہ میری ریکویسٹ ہے تم سے۔ پلیز امائمہ۔ میرے بچے کو ڈھونڈ لاؤ۔"

امی کے لہجے کی التجا نے امائمہ کا دل چاہا کہ وہ پگھل کر زمین پر گر جائے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ امی اس سے اس طرح درخواست کریں گی۔ وہ اس کی ماں تھیں اور ان کا درمیانی تعلق ماں بیٹی کے تعلق سے بھی بڑھ کر تھا اور آج یہ دن آگیا تھا کہ امی کو اسے یاد کروانا پڑ رہا تھا۔

"میں اپنا وعدہ پورا کروں گی امی۔" اس نے بھیگی آواز کے ساتھ ان کو ایک بار پھر تسلی دی تھی۔

سلیپنگ بیوٹی آٹھ مہینے کی گہری نیند سے کسی بھی کس کے بغیر بیدار ہو گئی تھی۔

امائمہ کو وہ دن یاد تھا جب نور محمد کو برین ہیمبرج ہوا تھا۔ تب امائمہ اگرچہ اتنی سمجھدار یا باشعور نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی وہ دن اس کی یادداشت سے کبھی نہیں نکل سکا تھا۔ نور محمد تکلیف سے تڑپ تڑپ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ امی سمجھی تھیں کہ وہ مر گیا ہے۔ وہ بے تحاشا رونے لگی تھیں۔ وہ سب گزشتہ دو دن سے رو رہے تھے۔ لیکن نور محمد کی اس حالت نے جیسے خون ہی خشک کر ڈالے تھے۔ اسے اسپتال لے جایا گیا۔ وہ بظاہر بچ گیا تھا۔ لیکن اس کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی اور اصل آزمائش تب ہی شروع ہوئی تھی۔ اگلے دو سال وہ تقریباً "مرا ہی رہا تھا۔ اس کی حالت نہ زندہ جیسی تھی نہ ہی مردہ جیسی۔ برین ہیمبرج کے تخت زمین ملنے نے اسے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ مر سکا' اسے مردہ ثابت نہیں کر سکا تھا۔ اچھے علاج نے اسے بچا لیا تھا۔ مگر اس کے اندر زندہ رہنے کی خواہش بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کی حسیات بالکل ختم ہو کر رہ گئی ہوں۔ وہ بولتا تھا' نہ کمرے سے باہر جاتا تھا' بلکہ کمرے سے باہر نکلنا تو دور کی بات' وہ اپنے کمرے سے بھی باہر نہیں نکلتا تھا۔

امی اس کے سامنے کھانا رکھ کر انتظار کرتی رہتی تھیں کہ وہ کچھ کھائے گا۔ مگر وہ ایک لقمہ بھی نہیں لیتا تھا۔ اس کی بھوک نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ کئی کئی دن کپڑے نہیں بدلتا تھا۔ اس کے منہ سے لفظ امی سننے کے لیے امی کے کان ترس جایا کرتے تھے۔ مگر وہ گونگوں کی طرح بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے کمرے میں بھی بس خاموشی سے اپنے ہاتھوں کو تکنے میں مگن رہتا تھا۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق امائمہ اسے بار بار مخاطب کرتی' بلاوجہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی رہتی' لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ امی اسے بار بار بھائی کے پاس بیٹھنے اور باتیں کرنے کی نصیحت کرتی رہتی تھیں۔ لیکن امائمہ کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی' پھر وہ بھی تھک ہار کر اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتی' لیکن وہ نارمل ہو کر نہ دیا۔

امی اس کی کتابیں اٹھا کر اس کے آگے رکھ دیتیں تو وہ رونے والا ہو جاتا۔ کتابیں دیکھ کر اس کے پورے وجود پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ منہ سے تھوک اور آنکھوں سے اشک بہنے لگتے۔ یہ بہت کڑا وقت تھا۔ امی نے نور محمد کو اپنا قبلہ بنا لیا تھا۔ انہیں سب کچھ بھول گیا تھا۔ یاد رہا تو صرف یہ کہ ان کا ایک بیٹا تھا جو اپنے باپ کے رویے کی وجہ سے زندوں اور مردوں کے درمیان والی کیفیت میں آگیا تھا۔ ابو بھی اس کے کمرے میں نہیں آئے تھے۔ لیکن اس کی بیماری نے ان کو بری طرح توڑ کر رکھ دیا تھا۔

امائمہ کو کبھی کبھی ابو پر سب سے زیادہ ترس آتا۔ اسے لگتا' وہ خود احتسابی کی ایسی جنگ لڑتے رہتے ہیں کہ جس کا ذکر بھی کسی سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی اپنے منہ سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ لیکن یہ بات سب نے خود فرض کر لی تھی کہ نور محمد اس حال کو ان ہی کی وجہ

سے پہنچا تھا۔ امی ان کو بہت کم مخاطب کرتی تھیں۔ امائمہ ہی تھی جو سب کے درمیان پل بنی رہتی۔ اپنے بھائی کے جلدی ٹھیک ہو جانے کی دعا کرتی۔ وہ ابو کا بھی خیال رکھتی اور امی کا بھی۔ لیکن کبھی کبھی وہ بھی ہمت ہار جاتی۔ مگر یہ امی تھیں جو ہمہ وقت نور محمد کے گرد پروانے کی طرح منڈلاتی رہتی تھیں اور یہ ان کی محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ دو سال بعد نور محمد کسی قدر نارمل ہو گیا تھا۔

امی کی محنت اور دعائیں رنگ لائی تھیں۔ اس نے ضرورتاً" ہی سہی مگر امی کو مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ان کی باتوں پر مسکرانے لگا تھا۔ اس نے پیٹ بھر کر کھانا بھی کھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی کتابوں کو اب لاتعلقی سے نہیں تکتا رہتا تھا۔ بلکہ وہ ان میں تھوڑی بہت دلچسپی بھی لینے لگا تھا۔ وہ مختلف کتابوں میں تخصیص کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اسے بائیولوجی، فزکس کیمسٹری اور میتھس میں فرق کرنا آ گیا تھا۔ اسے مکمل طور پر ٹھیک ہونے میں مزید ڈیڑھ سال لگ گیا تھا۔

امی اس کی حالت میں بہتری پر بے انتہا خوش تھیں۔ امائمہ کو احساس تھا کہ فطری طور پر امی کو اپنی پہلوٹھی کی اولاد سے زیادہ محبت تھی۔ لیکن وہ امی کی توجہ کے لیے ترسنے کے باوجود نور محمد کو ان سب چیزوں کا قصوروار نہیں سمجھتی تھی۔ اسے اپنے بھائی پر ترس آتا تھا۔

ڈاکٹر کے مشورے پر امی نے نور محمد کو پڑھنے پر مجبور کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے ڈاکٹر اکرام سے آنے کے نقاط کی لسٹ پر لیکچر دیتی نظر آتی تھیں۔ انہوں نے گھر پر ہی اس کے لیے ایک ٹیوٹر کا انتظام کر دیا تھا۔ اگلے ایک سال میں وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ دوبارہ سے انٹری میڈیکل کا امتحان دے سکے۔ وہ پہلے کی طرح نہیں پڑھ پاتا تھا۔ لیکن وہ سب یہ دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ وہ اس قدر ذہین ہے کہ ایک خوفناک بیماری کو شکست دینے کے بعد بھی کم از کم اس قابل تھا کہ پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع کر سکے۔ انگزام کے بعد وہ دل و جان سے میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے انٹری ٹیسٹ کی تیاری میں جت گیا تھا۔

اس کا رزلٹ پہلے کی طرح شاندار تو نہیں تھا مگر اس نے 89 فیصد مارکس لے کر ثابت کر دیا تھا کہ جینئس ہر حال میں جینئس ہوتا ہے۔ ابو پہلے کی طرح اس کی پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ لیکن انہیں اطمینان تھا کہ وہ زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے۔ ان کا انداز ابھی بھی پہلے کی طرح نارمل رہتا تھا۔ وہ اسے کبھی شاباش نہیں دیتے تھے کبھی سراہتے بھی نہیں تھے۔ حتیٰ کہ وہ اس کے رزلٹس بھی چیک نہیں کرتے تھے، لیکن امائمہ جانتی تھی ابو اندر سے اس کی حالت دیکھ کر مطمئن تھے۔

مگر آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، بلکہ اصل آزمائش تو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس بات کا اندازہ ان سب گھر والوں کو تب ہوا جب تمام تر تیاری کے باوجود نور میڈیکل انٹری ٹیسٹ میں فیل ہو گیا۔ اس کے اردگرد رہنے والوں کے لیے یہ ایک بہت انہونی سی بات تھی۔ اس کے ابو کو چھوڑ کر باقی تمام زمانہ اس کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ فرق بس یہ تھا کہ باقی زمانہ اس کے حالات زندگی سے بے خبر تھا۔ بیماری نے اس کے اعصاب کو اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ یہ ناکامی اس کے لیے بہت مہلک ثابت ہوئی۔ وہ جو بہت پرسکون رہنے والا انسان تھا۔ اس دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ پتا چلتے ہی وہ اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ امی کے دلاسا دینے پر اسے غصہ آنا شروع ہو گیا تھا۔ پھر نجانے کیا ہوا۔ اس نے اپنی تمام کتابیں، نوٹس، ہینڈ بکس کمرے سے لا کر صحن میں پھینکنا شروع کر دیں۔

''مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب چیزیں جہنمی ہیں۔ میرے سکون کی سب سے بڑی دشمن۔ میں ان کو آگ لگا دوں گا۔ جلا کر راکھ کر دوں گا۔''

وہ کتابیں صحن کے بیچوں بیچ پھینک کر انہیں پاس سے ٹھلتے ہوئے بول رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک۔ اس

نے اپنی سارا بک ریک خالی کر دیا تھا۔ اس وقت ابو کے پاس ان کے کچھ اسٹوڈنٹس آئے ہوئے تھے۔ ابو سمیت وہ سب بھی یہ شور سن کر کمرے میں جمع ہو گئے۔

"چھوڑ دو مجھے... میں سب کو مار ڈالوں گا... میں نفرت کرتا ہوں سب سے... تم سب میرے دشمن ہو... اور تم میرے قاتل ہو... مجھے قتل کر کے اب تو سکون آگیا ہو گا تمہیں۔"

وہ کسی کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے سب سے پہلے بائیولوجی کے نوٹس کا پلندہ اٹھا کر اپنے ابو کے منہ پر مارا تھا اور اس کے بعد ایک کے بعد ایک کئی کتابیں ان کی جانب اچھالی تھیں۔

"اب خوش ہو تم... خوش ہو... خوش ہو۔"

اس کے منہ سے لفظ کم نکل رہے تھے اور تھوک زیادہ۔ ایک ہی بات کی تکرار کرتے وہ کتاب زمین سے اٹھاتا تھا اور دے مارتا تھا۔ اس کی ذہنی حالت اتنی مخدوش ہو چکی تھی کہ اسے یہ بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ جب وہ کتاب اٹھانے زمین پر جھکتا ہے تو اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ وہ کب سے اپنے باپ کی جانب خالی ہاتھ اچھال رہا تھا۔

"یہ تو پاگل ہو گیا ہے... پاگل ہے یہ... واقعی پاگل ہو گیا ہے۔" اس کے ابو کے پاس پڑھنے والے لڑکے ان کے گھر ضرور آتے تھے۔ لیکن وہ ان کے گھر کے فرد نہیں تھے۔ وہ باتیں کرنے اور اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرنے میں مگن تھے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق یہ خبر گھر سے باہر نکل گئی تھی۔

"پروفیسر آفتاب علی کا بیٹا پاگل ہو گیا ہے۔"

پروفیسر صاحب پہلے خفا ہوئے۔ پھر حیران' پھر پریشان اور سب سے آخر میں پشیمان ہوئے۔ انسان یہی کرتا ہے جو کام اسے پہلے کر لینا چاہیے۔ وہ سب سے آخر میں کرتا ہے۔

☆ ☆ ☆

"آپا! مجھے آپ لوگوں سے یہی امید تھی۔ جس طرح کا رویہ آپ نے بچے کے ساتھ اپنا رکھا تھا۔ اس کا یہی نتیجہ نکلنا تھا... توبہ توبہ اتنی بڑی نعمت کی ایسی ناقدری... کبھی دیکھی نہ سنی۔"

یہ لائبہ کے ماموں تھے جو تقریباً" پانچ سال بعد روچڈیل سے واپس آئے تھے۔ انگلینڈ کے اس چھوٹے سے قصبے میں وہ ان پڑھ ہونے کے باوجود اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ ماموں ابی کو اکثر نصیحت کرتے تھے کہ بچے کو پڑھائی کے لیے اتنا پریشرائز کرنا ٹھیک نہیں۔ ابو ماموں کی نصیحت کو ہمیشہ ایک ان پڑھ انسان کا احمقانہ مشورہ قرار دیتے تھے اور اب یہی ماموں امی کو ان کے پچھتاووں کا احساس دلا رہے تھے۔

"یہ آپ کا بیٹا میرے لیے کبھی بھانجا نہیں رہا بلکہ یہ میرے لیے ایک تعویذ تھا۔ جسے میں اپنی اولاد کو دکھا سنا کر حوصلہ لینے کی تلقین کرتا تھا۔ آگے بڑھنے کی طاقت دیتا تھا۔ یہ میرے لیے عام بچہ نہیں تھا۔ بلکہ گلوکوز کی بوتل تھا آپا! میرے بچے اس کی پیروی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس کا نام لینے سے ہمیں توانائی ملتی تھی۔ ہم ہر ایک کو فخر سے بتایا کرتے تھے کہ ہمارے خاندان میں ایک ایسا بچہ ہے جو بڑے ہو کر ڈاکٹر عبدالقدیر خان بنے گا... یہ آپ لوگوں نے کیا کر دیا آپا۔"

ماموں نور محمد کی جانب دیکھ کر رو ہی پڑے۔ اس کی امی کی آنکھیں تو پہلے ہی نم تھیں۔ جبکہ وہ کھلکھلا کر ہنسا اور پھر تالیاں بجانے لگا۔ اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ تالیاں بجاتا' ہنستے رہتا یا کبھی کبھی رونے لگ جاتا۔ ان ہی علامتوں کے باعث اب وہ پورے محلے میں پاگل مشہور ہو گیا تھا۔ خاندان کے سب گھر بھی اس بات سے آگاہ تھے۔ یہ لائبہ کے لیے بہت صبر آزما وقت تھا۔ نور محمد کی اس حالت نے ان کے گھر کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کے گھر میں اب کوئی ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کرتا تھا۔ امی ابو کے تعلقات تو بالکل بے گانوں جیسے تھے۔ امی نے جیسے نور محمد کو زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ انہیں لائبہ نام کی بیٹی کبھی نظر ہی نہیں آتی تھی۔

"میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان بنوں گا۔ میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان بنوں گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"بیٹے منت سے ملتے ہیں کیا آپا یا درختوں پر اگتے ہیں کہ جب دل چاہا خرید لیا یا توڑ لائے۔ نہیں ثریا! بیٹے اتنے آرام سے نہیں ملتے اور ایسے بیٹے تو بالکل نہیں۔ یہ آپ نے کیا کر دیا آپا! میرا دل بھی رو رہا ہے اس کی حالت پر۔ میں کیا کہوں۔"

ماموں سے تو اس کی حالت دیکھی ہی نہیں جا رہی تھی۔ ایسی لاچاری ایسی بے بسی انہوں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ایسی صورت حال میں ماموں کی ہمدردی امی کے لیے بڑی حوصلہ افزا تھی۔

"آپ لوگوں نے اب اس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ بالکل ہی پاگل سمجھ لیا ہے؟ اسے پاگل خانے میں پھینک دیں گے؟"

اپنی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے انہوں نے ایک نئے عزم سے سوال کیا تھا' امی ناخنوں سے کھیلنے لگیں۔

"اس کی حالت اب نہیں سنبھلے گی۔ ڈاکٹر بالکل مایوس ہو چکے ہیں۔ تم سمجھتے ہو' میں اس کے لیے پریشان نہیں ہوں۔ ایسا نہیں ہے میرے بھائی! بہت کچھ کر کے دیکھ لیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پانچ سال ہو چکے ہیں' مجھے اس کے ساتھ سر کھپاتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے یہ خود ٹھیک ہونا ہی نہیں چاہتا۔ اس کی جو حالت تم دیکھ رہے ہو۔ یہ مستقل ایسا نہیں ہے۔ کبھی کبھی یہ ٹھیک بھی ہو جاتا ہے۔ تب اس کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ نارمل نہیں ہے۔ مگر جب۔ جب دورہ پڑتا ہے تو کئی کئی دن یہ نارمل نہیں ہوتا۔ کمرے میں بند خود سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ میں کیا کروں اور اس کے لیے۔ میرے اللہ کی یہی رضا ہے۔"

امی پشیمانی سے گھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ماموں کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھری۔

"اللہ کی رضا نہیں بلکہ اللہ کی سزا ہے جب اس کی نعمتوں کی قدر نہیں کریں گے تو یہی ہوگا نا بہرحال آپ تو اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ کل بھی میرے لیے قابل فخر تھا اور آج بھی ہے۔ آپ اس کو بھول جائیں۔ یہ آج سے میرا بیٹا ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ یو کے لے جاؤں گا۔"

ماموں کا لہجہ حتمی تھا۔ یہ 2010ء کی بات تھی۔ نور محمد' ماموں کے ساتھ برطانیہ چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ کوئی کام وام نہیں کرتے؟"

وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ یہ ٹھیک نواں دن تھا اور وہ ایک بار پھر راستے ونڈ میں موجود تھی۔ اس بار وہ پہلے کی طرح بے چین ہو کر نہیں آئی تھی۔ بلکہ اس بار وہ بہت مطمئن اور پرسکون تھی۔

شہروز نے نا صرف اس کی کال ریسیو کی تھی' بلکہ کال کے بعد بھی وہ کافی دیر تک اسے ٹیکسٹ کرتا رہا تھا۔ سب سے آخر میں اس نے اسے ٹیکسٹ کیا تھا۔

"مرجانے۔۔۔ ونی مس یو۔" زارا کے بے چین دل کو قرار آگیا تھا۔ اب وہ کافی دن تک مسرور رہ سکتی تھی اور اسی لیے وہ نیو کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔

اس کا مشورہ تھا کہ لوگوں کو تنگ کرنا چھوڑ دو۔ گزشتہ پورے ہفتے اس نے شہروز کو طعنہ دیتا ہوا ایک بھی ٹیکسٹ نہیں کیا تھا۔ نہ اسے یہ کہا تھا کہ وہ اس کی پروا نہیں کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ اسی لیے شہروز نے اس کی کال "فوراً" لے لی تھی۔

اسی خوشی کو شیئر کرنے وہ یہاں آئی تھی۔ درحقیقت گزشتہ بار نیو نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ گاؤں میں کچھ مریض عورتوں کو دیکھ سکے تو اسے خوشی ہوگی۔ اس کا آف بھی تھا اور امی مصروف تھیں سو اسے ڈر نہیں تھا کہ وہ ڈھونڈیں گی۔

اسی لیے وہ موقع ملتے ہی آگئی تھی۔ فارماسیوٹیکل کمپنیاں سیمپلز کے طور پر لاتعداد ادویات ڈاکٹرز کو دیتی تھیں۔ زارا اپنے ساتھ ایسی ادویات لائی تھی جو بے ضرر تھیں۔ بینڈایجز' پائیوڈین' ٹشو پیپرز وغیرہ بھی تھے۔ اس نے نیو کی فرمائش پر کچھ مریضوں کو دیکھا بھی

لکھ کر دیے تھے۔ پھر وہ مزید جھک اب سے بے اینٹل آنے کا بھی کہا تھا۔ وبا جیسی کے سب بعضوں کو احتیاطی تدابیر بھی بتائی تھیں اور ان سب کاموں سے فراغت کے بعد وہ ایک بار پھر کھیتوں کی سیر کو نکل آیا۔ نیچو کے ہاتھ میں ایک درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ تھی جسے وہ ہوا میں لہراتا ہوا چل رہا تھا۔

"فکر کرتا ہوں نا۔" وہ اس کی جانب دیکھے بنا بولا تھا۔

"کیا؟" زارا نے اس کے عدم دلچسپی والے انداز کو محسوس کیا۔

"کیا بتاؤں... تمہاری طرح ڈاکٹر تو ہوں نہیں کہ فخر سے بتاؤں... چھوٹی موٹی نوکری ہے' اس کا کیا تذکرہ کرنا۔" وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔

"آپ کو اپنی نوکری پسند نہیں ہے۔" زارا نے حیرانی سے سوال کیا تھا۔ آج دھوپ ذرا کڑک تھی۔ پیدل چلنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"پسند ہے... لیکن میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔" اس کا انداز سادہ تھا۔ وہ اب کھیتوں کے درمیانی راستے سے نکل کر ذرا اونچی پگڈنڈی پر ہو گئے تھے۔ نیچو اس بات کا جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اسی لیے تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد بولا۔

"میں آج بہت خوش ہوں۔" اور اسی لمحے زارا نے بھی پرجوش ہو کر کہا تھا۔

"میں آج بہت خوش ہوں۔" وہ دونوں ہی ہنس دیے۔

"بزرگ کہتے ہیں کہ جب دو لوگ ایک ساتھ کوئی اچھا جملہ بولیں تو فوراً" کوئی خواہش ظاہر کرنی چاہیے... کیونکہ وہ قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔" نیچو نے کہا۔ زارا کے چہرے پر مسکراہٹ کا زاویہ پھیلا تھا۔ وہ دونوں چلتے چلتے رک گئے تھے۔

"واقعی... اچھا تو میری خواہش ہے کہ شہروز کے دل پر میرا قبضہ ہو جائے اسے دن رات بس میں ہی میں نظر آؤں۔" وہ پرجوش ہو کر بولی تھی۔ نیچو اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی بات سن کر وہ چلنا شروع ہو گیا اور اس سے چند قدم آگے جا کر اس کی جانب مڑ کر اسی چال چلتا ہوا بولا۔

"میری خواہش ہے کہ میرے پاس بہت ساری بکریاں آ جائیں اور میں ان کو چرانا پھروں... وہ میرے آگے آگے چلیں اور جیسے ہی کوئی بکری ریوڑ سے باہر نکلے تو میں عقب میں سے آواز دوں... اے چھوری... ہائے تجھے... شششش... شششش... اور بکری فوراً" واپس ریوڑ میں شامل ہو جائے۔"

وہ نا صرف الٹی چال چل رہا تھا' بلکہ راستے میں آنے والے درختوں کی لٹکتی شاخوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑی شاخ سے مارتا ہوا آگے کی سمت جا رہا تھا۔ زارا نے ناک چڑھائی۔

"یہ کیسی احمقانہ خواہش ہے؟" نیچو نے جواباً" اس سے زیادہ بری شکل بنائی۔

"کیوں جب تم یہ خواہش کرتی ہو کہ تمہارا شہروز کے دل پر قبضہ ہو جائے تو یہ احمقانہ نہیں لگتا۔"

"اس میں احمقانہ کیا ہے... میں اس سے محبت کرتی ہوں... یہ میرا حق ہے کہ وہ ہر وقت میرے بارے میں سوچے' اسے ہر طرف میں ہی میں نظر آؤں۔" وہ ودبدو بولی تھی۔

"یہ کیسی محبت ہے جس میں سارے عناصر نفرت والے ہیں... کسی معصوم کی زندگی کا بیڑا غرق کرنے کا مطلب محبت نہیں ہوتا۔ محبت میں 'خیر ہی خیر' ہو تو محبت ہے ورنہ اس کا نام بدل دینا چاہیے۔ محبت میں ایسی شرانگیزی اچھی نہیں لگتی۔ جس سے محبت کرتے ہیں' اس کا برا نہیں چاہتے... دل انسانی جسم کا سب سے پاکیزہ حصہ ہوتا ہے۔ یہ حق صرف اللہ کا ہے وہ وہاں قیام کرے۔ یہ اللہ کی جائے مسند ہے بی بی! انسانی دل پر حکمرانی کرنے کا حق صرف اللہ کو ہے' اس لیے جس سے محبت کرو' اس کے لیے دعا کرو کہ یا اللہ میں اس شخص سے محبت کرتی ہوں' میں اس کا بھلا چاہتی ہوں میں اس کے لیے خیر کی دعا کرتی ہوں۔ تو اس کے دل پر قابض ہو جا تو اس کے دل میں بسیرا کر لے' یہ ہے اصل محبت اور تم خواہش کرتی ہو کہ تم اس کے دل پر قابض ہو جاؤ۔ کیوں کسی کا خانہ خراب

کرنا چاہتی ہو؟ اکثر اوقات کوئی وقت قبولیت کا بھی ہوتا ہے۔"
وہ رکا پھر استفہامیہ انداز میں ہنکارا بھرا تھا۔
"اور تم بات کر رہی ہو محبت کی۔"
زارا ششدر رہ گئی تھی۔ نمیو ایسی باتیں کر کے اسے ہمیشہ لاجواب کر دیتا تھا۔
"مجھے بکریاں چرانا اس لیے پسند ہے کہ یہ ان کو بہت پسند ہے جن سے میں دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔" وہ اب سیدھا ہو کر چل رہا تھا جیسے اس سے پہلے اور درمیان میں کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ زارا اس کی پہلی بات کے اثر سے نکلی نہیں تھی' اس لیے پست سی آواز میں بولی۔
"کون ہیں وہ' جن سے آپ بہت محبت کرتے ہیں؟"
"وہ' وہ ہیں جو تم سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں" نمیو اب اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔
"کون شہروز؟" وہ ترنت پوچھ رہی تھی۔
"آآآآآف۔" نمیو چلا اٹھا پھر اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر بولا۔
"وہاں سے کوئی پتھر اٹھاؤ اور میرے سر پہ مار دو۔ یہ نہیں کر سکتیں تو کوئی پتھر اٹھاؤ اور اپنے سر میں مار لو۔ ویسے بھی اس فیوز بلب کا کوئی فائدہ تو ہے نہیں۔"
زارا مزید چڑ گئی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ نمیو نے ایسے کیوں کہا ہے۔
"ایک صرف شہروز نہیں ہے جو تم سے محبت کرتا ہے۔ کوئی اور بھی ہے۔" وہ اس کی جانب مڑا تھا' زارا نے حیرانی سے اس کا چہرہ تکا۔
"اور کون؟" وہ پوچھ رہی تھی۔
نمیو نے اس کا چہرہ دیکھا پھر گہری سانس بھر کر اس نے وہ نام زارا کو بتایا تھا۔ زارا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صوفیہ سرور حسنی

شکایت عرض ہے

میں ایک ہیرو ہوں کسی فلم یا ڈرامے کا نہیں بلکہ ناول اور کہانیوں کا ہیرو اور آج میں اپنی اور اپنے ساتھی ہیروز کی شکایات لے کر آیا ہوں اور مجھے امید ہے ان کا جلد از جلد ازالہ کیا جائے گا۔

پہلے نمبر پر یہ کہ ہمیں کبھی ہماری پسندیدہ جگہ پر پیدا نہیں کیا جاتا۔ کبھی کبھی ہم اتنے غریب گھر میں پیدا ہوتے ہیں کہ ہماری آدھی سے زیادہ زندگی غربت کی چکی میں پستے گزر جاتی ہے۔ اوپر سے اکثر ہماری آنکھیں کسی امیر حسینہ سے دوچار کرائی جاتی ہیں اور باقی زندگی ان کے نخرے اٹھاتے گزر جاتی ہے۔ کبھی ہم سے بھی تو پوچھا جائے کہ ہم کہاں پیدا ہونا چاہتے ہیں کسی اسٹیبلشمنٹ کے یا کسی سیاستدان کے گھر۔

دوسری شکایت آپ رائٹرز سے یہ ہے ہمیں کہ آپ ہماری برادری کے تمام لوگوں یعنی کہ ہیروز کو اکثر و بیشتر عجیب و غریب ناموں سے نوازتے ہیں۔ بے شک ہم آپ کے زور قلم سے وجود میں آتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ ہمیں ایسے ایسے نام دیں کہ ہم منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہیں یا یہ کہ پہچانے ہی نہ جائیں کبھی کبھی تو آدھی کہانی گزر جاتی ہے اور قارئین کو یہ پتا نہیں چلتا کہ آیا یہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ اس طرح ہم بیچ میں لٹکے رہتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ ہم سے ہرگز نہیں پوچھا جاتا کہ ہم کہاں ایڈمیشن لے کر پڑھنا چاہتے ہیں اور کونسی ڈگری لینا چاہتے ہیں۔ بعض اوقات ہمارا انٹرسٹ انجینئرنگ یا ڈاکٹری میں ہوتا ہے اور ہمیں زبردستی آرکیٹیکٹ بنادیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ہمیں عجیب و غریب ڈگری دلوادی جاتی ہے چاہے اسکوپ ہو یا نہ ہو۔ آگے ہمیں تنخواہ کم ملے یا زیادہ جاب میں دل لگے نہ لگے آپ نے تو ہمیں مروا دیا نا۔

پھر آپ ہمیں سنجیدہ اور غصیلا بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں اکثر اوقات ہمارا ہنسنے اور قہقہے لگانے کو دل کرتا ہے لیکن اس وجہ سے ایسا کرنے سے باز رہتے ہیں کہ آپ کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہیروئن کو آنکھیں دکھا کر تھر تھر کانپنے پر مجبور کیا جائے چاہے اب ہمیں اس نازک اندام پر جتنا بھی ترس آئے جتنا پیار آئے۔ اس وقت ہمارے دل سے آپ رائٹرز کے لیے ایک ہی صدا آتی ہے۔ ”تسی رج کو ماڑی خبر اے“

اور کبھی تو آپ حد ہی کردیتی ہیں ہمیں اس قدر نرم خو خوش اخلاق اور دھیمے مزاج کا بنا کر پیش کرتی ہیں کہ ہیروئن کی ہر تلخ بات ہر بدتمیزی فراخ دلی سے برداشت کرنی پڑتی ہے بلکہ الٹا مسکرانا پڑتا ہے ہم کوئی غالب ہیں کہ گالیاں کھا کر بھی بدمزہ نہ ہوں۔ اور ہم چاہ کر بھی ان کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دے سکتے ہوتا۔ کبھی ہم ہیروئن کے غریب ڈرائیور ہوتے ہیں یا ان کے باپوں کے احسانوں کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں۔

ہمیں زبردستی مہذب اور سوبر بنایا جاتا ہے کبھی بندے کا دل کرتا ہے جینز اور ریڈ شرٹ پہنے یا کبھی کلر پہنے کو مگر ہمیں بلیک اینڈ وائٹ ہی پہننا پڑتا ہے محض آپ کی ہیروئن کے سامنے خود کو ڈیسنٹ ثابت کرنے کے لیے ہم اپنی معمولی معمولی خواہش پوری نہیں کرسکتے۔

چند دن پہلے کی بات ہے میرے ایک ساتھی ہیرو کا بڑا دل چاہا سڑک پر ون ویلنگ کرنے اور دل کھول کر سیٹیاں مارنے کو لیکن شومئی قسمت ہیروئن قریب ہی بس اسٹاپ پر کھڑی تھی اور اسے بندے کی ہیرو کی

طرح گزرنا پڑا۔ یعنی اپنی کوئی زندگی نہیں۔
ایک اور شکوہ ہمیں آپ سے یہ ہے کہ برائے مہربانی ہم جو کھانا چاہتے ہیں ہمیں کھانے دیا جائے' ضروری نہیں ہم چائنیز اٹالین ہی پسند کریں اور صرف کڑوی کافی ہی پئیں ہمیں مٹن کڑاہی' تندوری چرغہ' روغنی نان اور دودھ پتی بھی اچھی لگتی ہے۔
بعض اوقات ہمیں کوئی فیشن ایبل پٹاخہ سی لڑکی پسند آتی ہے مگر صرف آپ کی وجہ سے ہمیں سادہ سے کپڑوں میں ملبوس دھلے دھلائے چہرے والی لڑکی سے شادی کرنا پڑتی ہے۔
غرضیکہ ہر طرح سے ہم پر ظلم کیے جا رہے ہیں روز ہماری مردانہ انا کو ٹھیس پہنچتی ہے اور ہم سب کچھ

برداشت کیے جا رہے ہیں۔ ہماری شکایات کا جلد از جلد ازالہ کیا جائے ورنہ ہم بغاوت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جو یقیناً" آپ کے لیے اور قارئین کے لیے مشکل کا باعث ہوگا ظاہر ہے ہم ہی نہیں ہوں گے کہانی میں تو کون پڑھے گا آپ کی کو ڈسیں۔

خیر اندیش
ہیرو سوسائٹی

☆ ☆ ☆

میں ایک ہیروئن ہوں میرا نام جو بھی ہو کردار بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے میرے بغیر کہانیاں ادھوری ہوتی ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔ جب مجھے اور میری ساتھی ہیروئنوں کو معلوم ہوا کہ تمام ہیرو مصنفین کے نام کھلا خط لکھ رہے ہیں تو ہم بھلا کیسے پیچھے رہ سکتی تھیں شکایات تو ہمیں بھی ہیں۔
سب سے پہلے تو ہمارا خیال کیا کریں کہ ہم کس قدر نازک اور حساس مخلوق ہیں اور آپ مصنفین ہم سے بہت زیادہ کام کرواتی ہیں۔ اکثر اوقات ہم نو سے پانچ والی آفس جاب کرنے کے بعد گھر آکر کھانا بناتی ہیں کپڑے دھوتی ہیں اور رات کو بیٹھ کر ایم اے

کے پیپرز کی تیاری کرتی ہیں۔ اف اتنا ظلم۔ برائے مہربانی آپ یا تو ہم سے پڑھائی کرالیں' جاب یا گھر کے کام

کیونکہ ہم بیچاری ناول کی ہیروئنز ہیں ڈاکیہ گرل نہیں۔

دوسری شکایت یہ کہ ہم سے آپ کے نخرے ہیروز کے نخرے نہیں اٹھائے جاتے کہ ہم کچن میں کھڑے ہو کر شدید گرمی میں مختلف ڈشز بنا کر معدے کے ذریعے دل میں اترنے کی تمنا رکھتے ہوئے اپنی جلد خراب کرلیں۔ ان کے بگاڑ ہونے پر ہم سے کبھی کوئی ولیہ سوپ کیا گیا نہیں بنوایا جاتا کبھی انہوں نے بناوٹ لیے جا۔ آخر کب تک یہ نا انصافی ہے؟

تیسری بات یہ کہ ہمیں اچھے نفیس مکو' نرم دل اور خوش اخلاق ہیروز کی بجائے کھبے "مسیحا" کی جانب دیا ہے کہ ایک ہی طرح کے سنجیدہ' فصیلے اور "کھڑوس" ہیروز سے ہمارا دل اکتا گیا ہے بھلا یہ جو کبھی مسکراتے ہوں چاہے ان کے سامنے پورا کا پورا لافٹر شو ہی کیوں نہ اسٹیج کردیا جائے ان کا منہ ایسے بنا ہوتا ہے جیسے شہد کی مکھیوں نے حملہ کیا ہو۔ ہمیں ایسے کھڑوس ہیروز کے سامنے "وائبریشن" پر لگنا یعنی تھر تھر کانپنا قطعی پسند نہیں۔

ایک اور گزارش کہ ہیروز کے سامنے ہم سے بونگیاں سرزد نہ کروایا کریں نہ کیا کہ ادھر سے ہیرو کی انٹری ادھر سے ہم ٹھوکر کھا کر جامن کے پیڑ سے گریں یا گیلے فرش پر پھسل جائیں۔ اس وقت ہیرو کے چہرے پر جو مسکراہٹ ابھرتی ہے اسے دیکھ کر جی چاہتا ہے ان کے بتیس دانت توڑ دیے جائیں مگر فقط آپ کی وجہ سے ہمیں کھسیانا پڑتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم اتنی ڈرپوک ہوں کہ بادل گرجنے سے ڈر جائیں یا چھپکلی کاکروچ کو دیکھ کر ادھر ادھر چھلانگیں مارتی پھریں۔

کبھی ہمیں کوئی بدمعاش ٹائپ لڑکا چھیڑتا ہے تو ہم اسے جوتیوں سے پیٹنے اور گالیوں سے نوازنے کی خواہش دل میں دبا لیتی ہیں صرف آپ کے ہیرو کی خاطر تاکہ وہ آکر ہمیں "بچائے" اور اپنی شیخی بگھار سکے۔

اور سب سے بڑی شکایت ہیروز کے سامنے ہماری صلاحیت و عقل کو بہت محدود دکھایا جاتا ہے اور ہم میں سے اکثر ان کے آگے پانی بھرتی نظر آتی ہیں' گانوں کا مقابلہ ہو یا لوڈو کا ہمیں ہمیشہ ہروا دیا جاتا ہے یہ سراسر زیادتی ہے ہم آپ سے مساوی حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں۔ آپ سے التماس ہے ہماری ان شکایات کا خاطر خواہ ازالہ کیا جائے۔ ورنہ جو دھمکی ہیروز نے دی ہے ہڑتال کی وہ ہماری طرف سے بھی قبول کی جائے۔ اب اجازت چاہتے ہیں۔!

آپ کی ہیروئنز
ولیہ' کملہ' غیرہ وغیرہ

☼

ملک قیصر دین اپنی چھڑی کو ٹک ٹک بجاتے اندر آئے تو روح کو جھنجوڑ دینے والی آواز نے ان کا استقبال کیا۔

"Put down lonely put down lonely"

انگریزی گانے کے ان بولوں سے جو غضب کی لہر اٹھی تو وہاں کر رہ گئے۔

"شیرف۔" اس غضب سے پکارتے وہ تقریباً دھاڑے تھے۔

آواز کا تعاقب کرتے اپنے ہونہار سپوت کے دروازے تک پہنچے۔ ایک دھماکے کے ساتھ دروازہ کھولا۔ اور اندر آئے جہاں شیرف بیڈ پر ایک ٹانگ رکھے قدرے جھکا کھڑا رہ گیا۔ اپنے فق ہوتے چہرے کے ساتھ۔۔۔ اس کی بانہوں میں بھی کچھ جھول رہا تھا۔ ملک قیصر دین کو بے ساختہ گزشتہ روز دیکھے اس ڈرامے کا سین یاد آگیا جو بالکل سامنے والے منظر جیسا تھا۔

رات کا وقت لڑکی کا بانہوں میں جھولنا اور لڑکے کا بے حد والہانہ انداز میں اسے دیکھنا ڈرامے میں چہرے کے تاثرات بے حد پرشوق تھے۔۔۔ مگر سامنے والے منظر میں شیرف کا چہرہ بالکل زرد تھا اور لڑکی۔۔۔

ان کی رگوں میں دوڑتا خون تیز ہوا۔ چھوٹی چھوٹی سی آنکھوں میں غصہ کا شرارہ بھرے وہ آگے بڑھے اور بھرپور غصے سے اپنی چھڑی شیرف کو دے ماری۔ بے حد درد ہوا تھا شیرف کو اس جان لیتے درد سے۔ لڑکی بانہوں سے گر پڑی۔

"ارے۔۔۔" بے حد حیرت سے نیچے گری لڑکی کو دیکھا۔ تھوڑا جھک کر مزید غور سے دیکھا۔

شیرف کی بانہوں سے نکل کر ان کے قدموں میں گری وہ کوئی لڑکی نہیں۔ ایک فل سائز گٹار تھا۔ بے اختیار گڑبڑا کر شیرف کو دیکھا جو آنکھیں بند کیے اوئی ماں اوئی ماں کر تا بے حد آہستہ آواز میں کراہ رہا تھا۔

ان کا رعب رہ گیا تھا۔ اچھا تھا کہ انہوں نے اپنی اس سوچ کا اظہار نہ کیا کہ۔۔۔ "اس قدر ذلیل حرکت اب لڑکی کے ساتھ گلچھرے اڑانے لگے۔"

"Put dwon lonely put dawn lonelu"

ناولٹ

"بند کرو اس بے ہودگی کو۔ غضب خدا کا، آج تک
دل کا اثر اب یہ رہ گیا۔" انہوں نے وہیں کھڑے
کھڑے چیختے ہوئے ٹی وی کا پلگ بند کیا۔
اچانک گڑبڑاہٹ سی ٹی وی کا پلگ دبا تو وہ شرف کی
طرف متوجہ ہونے لگے تھے کہ اسی وقت افتاں و خیزاں
"اوئی ماں" کرتے لاڈلے کی ماں جی چلی آئیں۔
"کیا ہوا گیا ہوا۔" ان کے سرخ و سفید چہرے پر
پریشانی تھی۔
"اس نامعقول سے پوچھو۔ مقدس دنوں نماز کے، روزے کے ان فرشتوں کو سن رہے ہیں صاحب زادے۔ اوپر سے ان در و دیوار کو بھی سنا رہے ہیں۔ حد ہو گئی ہے بے غیرتی کی۔"
"بچہ ہے، غلطی ہو گئی۔" وہی ماں کی ازلی ممتا۔ منمنائی: وہی تو وہ بس طرف داری کی۔
"بچہ..." انہوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے بچے کو غور سے دیکھا جو بوٹ کا پورا ڈبل بیڈ پہ چھایا ہوا تھا۔
"وہ تو بس آج ذرا جلدی آگیا ورنہ نہ جانے کیا کچھ جلتا رہتا ہو گا اس گھر میں میرے پیچھے۔ ایسی خرافات میں کبھی برداشت نہیں کروں گا، ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے کم بخت... لاڈ پیار کا۔ ایک منٹ میں چلتا کروں گا گھر سے بدتمیز انسان۔" اپنی بھڑاس نکال کر وہ یہ جا وہ جا۔
"لاڈ پیار..." باپ کے جانے کے بعد وہ کراہنا چھوڑ کر اٹھا۔
"اوئی ماں۔" مگر شانہ پکڑ کر واپس بیٹھنا پڑ گیا۔
"ہائے میرا بچہ! میں ابھی تیرے آیوڈیکس کی مالش کرتی ہوں، ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔" اسے پچکارتے وہ جلدی سے اس کے پاس آ بیٹھیں۔
"ہزار دفعہ کہا ہے کہ باپ کے غصے کو ہوا نہ دیا کر۔ منع بھی کیا تھا کہ اتنے زور سے گانے نہ لگایا کر، پڑ گئی نہ مار۔"
"اس... بس... بس..." آیوڈیکس کا پہلا ہاتھ لگتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔
"کہاں کا لاڈ پیار، جب دیکھو غصہ کرتے رہتے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر۔ یہ مقدس ہے، گانے سننا منع ہے اور اپنی اولاد پر تشدد کرنا ثواب کا کام ہے! کون سے ساتویں آسمان پہ پہنچے ہیں آپ لوگ اکلوتی اولاد پر ستم، تشدد، روک ٹوک سے۔ ذرا اچھا تھا جاوید بھائی اور ہوتے، آ کر مزاج ٹھکانے..." بابا دوووو کے بولنے پہ آیا تو رونا چلا گیا۔
"اچھا!" اس نے پوچھا۔
"ہاں تو ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔ کیا ضرورت تھی مجھے ایک اور کو بھی پیدا کرنے کی اور..."
"دھپ..."
"اوئی ماں۔"
سرخ و سفید، بے حد صحت مند ماں جی کی صحت مندانہ "دھپ" شرف قیصر کے کندھے پہ پڑی تھی تو... "اوئی ماں" کہنے پر بھی ماں جی کی ممتا نہیں جاگی، ورنہ اس سے پہلے وہ اسی پکار پر دوڑی چلی آئی تھیں۔
"اوئی اللہ..." ماں کے دل میں وہم ڈالنے کی ایک بار پھر کوشش کی مگر اثر نہ ہوا۔
"ایک تو والد محترم تشدد کر کے چلے گئے، اوپر سے آپ نے بھی کرارا ہاتھ مار ڈالا کر پہ۔"
"صحیح رو کہتے ہیں تیرے ابا جی۔" ان کی بات پر شرف قیصر نے کڑوا سا منہ بنایا۔
"اب جا رہی ہیں تو ایک کپ چائے ہی لا دیں۔ اکلوتا لاڈلا اور ہر چیز کے لیے منت۔"
"اچھا لا رہی ہوں۔" وہ سر ہلاتی چلی گئیں۔
اک گہری سانس لیتے اپنے عزیز روم کو دیکھنے لگا۔ جس کی ایک ایک ٹوٹی ہوئی چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ تاسف سے اسے دیکھتے وہ نیچے جھک کر اٹھانے لگا تھا کہ ٹانگ نے بے ساختہ اپنے ہونے کا احساس دلایا۔
"اوئی ماں..." وہ چیخ کر واپس بستر پہ گرا۔

☆ ☆ ☆

"نہ وہ باپ ہی میرا باپ ہے"

نہ وہاں ہی میری اماں سا ہے

یہ عجیب نشار زندگی ہے

جہاں کوئی میرا نہ ہے

نہ ہی باپ سی....."

"یہ کیا بک رہے ہو۔"

اسے وجد کی کیفیت سے اسی آواز نے نکالا جس سے اس کی جان جاتی تھی۔

"وہ... وہ میں تو... میں تو نظم پڑھ رہا تھا۔" وہ گڑبڑایا۔

"تم اردو ادب میں ماسٹرز کر رہے ہو یا کمپیوٹر سائنس میں۔" وہی ان کی آنکھوں کی خونخواری۔ نظر جھکا کر بیٹھا ہی رہا۔

"برخوردار! میں یہ پتا کرنے آیا ہوں کہ آپ پڑھنے جائیں گے یا پھر آپ کو کسی ورکشاپ میں لگا دوں؟" انہوں نے پرانی دھمکی دی۔

"ابا جان... وہ میرے پاؤں میں درد ہے' کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا...."

"یہ اوچھے ہتھکنڈے بند کرو اور تیاری کرو۔" ان کا غیض ابھرا۔ "الغضب خدا کا قد کا نہ دیکھو اور بہانے دیکھو' حد ہے نالائقی کی۔ مجھے یہ چھوٹے موٹے ناٹک متاثر نہیں کر سکتے' فوراً" اٹھو۔" انہوں نے آخری حربے کے طور پر اپنی چھڑی اٹھائی' وہ گھبرا گیا اور جلدی سے کھڑا ہوا۔

"جی ابا جان! میں... میں ابھی اٹھتا ہوں۔"

"اور ہاں! سحری میں نظر نہیں آئے تم" وہ جاتے جاتے رکے اور ایک نیا سوال داغا۔

"کمرے میں ہی سحری کرلی تھی ابا جان! وہ پاؤں...." اس نے ہاتھ سے اشارہ کرنا چاہا۔ مگر دوسری طرف بے نیازی قائم ہو چکی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اب ذرا ذرا سی بات پر روزے جیسے مبارک رکن تھوڑی چھوڑے جاتے۔" ہنکارا بھرتے وہ تو چلے گئے۔ پیچھے بلبلاتا رہ گیا شیرف قیصر۔

"ذرا ذرا سی بات' اتنی سی بات۔" ان کا آخری قدم باہر رکھتے ہی ہمیشہ کی طرح شیر جوان شیر ہوا۔ فوراً"

بن اٹھا کر بیٹھا۔

"اتنا درد ہے پاؤں میں' مجال ہے جو ذرا نرمی دکھا دیں...."

ناچار اسے اٹھنا ہی پڑا کمرے کے دروازے سے لے کر گیٹ تک ہجرت کرنے جو درد اسے سہنا پڑا وہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

گہری سانس بھرتے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ صبح کا وقت اور کچھ سحری کے بعد آرام کرنے کا سواد۔ ساری سڑک سنسان تھی اور ابھی وہ کسی ٹرانسپورٹ وغیرہ کا سوچ ہی رہا تھا کہ بائیک چلانے کے قابل رہا نہیں تھا پڑوسیوں کا گیٹ کھلا اور پھر دھڑام سے بند ہوا۔ وہ اپنی ایک ٹانگ پر اچھل کر رہ گیا۔

"حد ہوتی ہے بدتمیزی کی۔ اس طرح سے دروازہ بند کرتے ہیں۔" سیاہ جینز اور سرخ کرتے میں وہ جو کوئی بھی ذی النفس تھا۔ پلٹ کر اسے گھورنے لگا۔

اور شیرف قیصر جو خود بھی غصے میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اک عجیب سا احساس ہوا۔ سر پر الٹی کیپ کے نیچے گول چہرہ' موٹی موٹی شربتی آنکھیں اور نازک لب... اتنے تیکھے اور گداز نین نقش تو لڑکیوں کے ہوتے ہیں' تو پھر... دوبارہ اس کے پہناوے پر نظر ڈالی اور پھر چہرے پر۔

"کیا مصیبت ہے۔ کبھی لڑکی نہیں دیکھی اپنی زندگی میں' جو یوں گھورے جا رہے ہو۔" بے حد نازک سریلی آواز نے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"اب منہ بند کرتے ہو یا لگاؤں ابا جو تا تمہارے سر پر۔" شربتی آنکھیں جل اٹھیں۔

"وہ... ڈریسنگ آپ کی لڑکوں والی تو تھی مجھے لگا کہ آپ... مگر آپ تو لڑکی نکلیں... تو اس طرح تو کسی کو بھی غلط فہمی ہو سکتی ہے نا۔" وہ اپنی بات کی وضاحت ذرا سنجیدہ ہو کر بھی کہہ سکتا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں گڑبڑا گیا۔

"میری مرضی' میں جو چاہے پہنوں۔ تم کون ہوتے ہو کچھ کہنے والے۔" وہ اس پر چڑھ دوڑی۔ "دروازہ

بھی میرا ہے' گھر بھی میرا' جیسے چاہوں کھلواؤں' بند کروں' تمہیں کیا تکلیف ہے۔"

"تفتیش نہیں..."

"بند کرو اپنا منہ۔"

اور منہ فوراً "بند" ہوا۔

"خبردار! جو اب دوبارہ کچھ کہا تو ایک منٹ میں سیدھا کردوں گی تجھے! بڑے آئے۔" انگلی اٹھا کر وارن کرتی وہ آنٹا "ٹاٹا" چلی گئی اور وہ اس کے آنے اور جانے کو دیکھتا رہ گیا۔ چور نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے وہ اکلوتی ٹانگ کو سہارا دینا سوچنے لگا۔

"یہ شیرنی... باسر چنڈالی کے گھر کیا کر رہی ہے۔" اپنی ٹانگ' درد سب بھولے وہ اسی سوچ میں گم بس اسٹاپ تک بھی پہنچ گیا۔ بس منٹ کی واک نے اس کی کل سے بنی سستی کو دور کر دیا تھا۔ کل سے وہ اپنے بیڈ سے اٹھا ہی نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے درد ہوں لگا ہوا تھا۔ مگر اب چلنے سے درد میں واضح کمی محسوس ہو رہی تھی۔ پورے سفر میں وہ اسی کو سوچتا رہا کہ آخر وہ کون ہے۔

* * *

"ارے یار شیرف! اتنی دیر کر دی تو نے کب سے انتظار کر رہے ہیں تیرا۔" جھنجلایا ہوا' ہلکی داڑھی اور کرنٹ لگے بالوں کی طرح ہیر اسٹائل والا وہ اس کا یونی فیلو زیب تھا۔

"اب جلدی سے اتر جاؤ' کیا بس میں ہی چپک گئے ہو۔" اسے آہستہ آہستہ اترتے دیکھ کر زیب جھنجلایا۔

"ایک تو یہ انوکھا لاڈلا... نازک مزاج۔" داور کی بڑبڑاہٹ پر اس نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ یہ تو اس کی دکھتی رگ تھی۔

"کیا بکواس ہے' کیوں کر رہے ہو انتظار؟" جل کر پوچھا۔

"تجھ سے ایک کام تھا۔" زیب نے اسے بتایا۔

"کیسا کام؟" وہ ٹھٹکا۔

"تم چلو تو سہی۔" زیب نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"ارے کہاں چلوں' میری کلاس نکل جائے گی۔ چھوڑو مجھے۔" اس نے ہاتھ چھڑایا۔

"افوہ یار..." زیب نے دوبارہ ہاتھ پکڑا۔

"ہم پروفیسر ظفر آبادی کی کلاس ویسے ہی مس کر چکے ہو' گھڑی نہیں دیکھی' پورے دس منٹ لیٹ ہو۔" داور نے اپنی کلائی آگے کی۔

"اوہ... میری کلاس نکل گئی' اب مجھے سر ظفر آبادی نہیں چھوڑیں گے۔" اسے یقین بھرا صدمہ تھا۔

"پوری کلاس نہیں' پوری یونی کے سامنے انسلٹ۔" وہ اپنے آپ کو کٹہرے میں کھڑا سر ظفر کے سامنے محسوس کرنے لگا۔ نقارے کی طرح گونجتی آواز تھی سر ظفر کی اور اسائنمنٹ لیٹ سب مٹ کروانے کی سزا۔ اسے جھرجھری سی آگئی۔

"یہ سب اس "شیرنی" کی وجہ سے ہوا ہے۔" اسے صبح کی ملاقات یاد آگئی تو سارا غصہ بھی عود کر آیا۔ مگر یہ یاد نہ آیا کہ وہ خود کتنی فرصت سے تھا۔

"شیرنی۔" وہ دونوں اچھل ہی پڑے۔ "تم چڑیا گھر سے ہو کر آرہے ہو؟"

"نہیں... بابا نہیں۔" وہ گڑبڑا گیا اور ان دونوں نے بھی زیادہ ضد نہ کی۔

"ابھی ہی پڑی ہے تمہیں... اب ذرا جلدی چلو ہمارے ساتھ اور کوئی بکواس نہیں۔" ان دونوں نے اسے ساتھ گھسیٹا۔

"اوہ یار... میرے پاؤں میں درد ہے' آہستہ چلو۔" اسے کہنا ہی پڑا مگر اس کی بات سنی کس نے تھی' اسے کھینچ لے جا کر دم لیا۔

"بیڑا غرق ہو تم پر' ہائے میرا پاؤں۔" وہ سارے راستے چلاتا رہا۔

"یار تم لوگ کہاں' آخر کہاں جب دیکھو میرے پیچھے پڑے ہوتے ہو۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں' میرے اباجان کو دوستیاں پسند نہیں' مگر تم دونوں میری جان چھوڑتے ہی نہیں۔" وہ تقریباً" روتے ہوئے بولا۔ لیکن اس وقت وہ دونوں ادھر ادھر دیکھنے

نہ سکی جتنے اسے ٹھیک تھا کہ تب جڑ گئی۔

"اگر تم نے دو منٹ کے اندر اندر مجھے نہیں بتایا کہ مجھے یہاں کیوں لائے ہو تو میں ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

داور نے اسے گھورا۔

"اچھا چھوڑو۔ سنو۔" زیب کو ذرا جھاڑنے کے بعد کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ اسی لیے ذرا سا آرسی کو کھینچ نبیل کے قریب" اور منہ کر لیا۔ انداز سرگوشیانہ تھا۔ شیرف نے کوفت سے اس انداز کو دیکھا۔ مگر مجبوراً" چپ چاپ آگے کو ہو گیا۔

"تمہاری یونیورسٹی میں ایک پٹاخہ آئی ہے۔" پہلا جملہ ہی قابل اعتراض تھا۔ فوراً" ہی گھورا۔

"پوری بات سنو۔" اس نے نبیل پر ہاتھ مارا۔

"ہم دو دن سے پیچھے پر ہو' اسی لیے شروع سے بتا رہا ہوں' اس پٹاخہ لڑکی کا سلیم خان کے لوگوں سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے پوری یونیورسٹی کے سامنے سلیم خان کو اپنے جوکر زسے پٹوا ڈالا۔"

"کیا۔" وہ متحیر رہ گیا۔ پٹاخہ کا مطلب یقیناً" لڑکی تھا اور اس لڑکی کا سلیم خان جیسے لفنگے کو پٹوا ڈالنا واقعی انوکھا کام تھا۔

"اور یہی نہیں اس نے نیو امر گروپ کے سرداران کو بھی للکار لیا ہے کہ اگر ان میں سے کسی نے بھی کسی بھی معصوم لڑکی سے فلرٹ کرنے کی کوشش کی! ان کو تنگ کیا یا زبردستی دوستی کرنے کے لیے اصرار کیا تو ان چاروں کی خیر نہیں۔"

"کیا بات کرتے ہو یار!" شیرف کا انداز و آواز بلند ہوئی۔ اسے وہ چار بڑی بلند بار آکے دکھ خود سے تو یہی کہتے تھے کہ ہم چاروں بھائی سرداروں کے قبائلی خاندان سے ہیں۔ لیکن سوائے ان کے رعب کے ان کے اندر اک بھی سرداروں والی خصوصیت نہ تھی' شکل سے بھی چوتے ہوئے آم لگتے تھے اکھڑ باڑی کے اعتبار سے حیرت انگیز طور پر فٹ تھے۔

"لیکن مجھے ابھی بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ تم یہ ماجرا جاننے کے لیے اتنی شدت سے میرا انتظار کیوں کر رہے تھے۔"

"تم بے شک ہمیں اپنا دوست نہ سمجھو' مگر ہم نے تمہیں ہمیشہ اپنا دوست سمجھا ہے' مانا ہے۔" یہ سچ تھا واقعی وہ بے حد خشک رویہ رکھتا تھا سب سے کہ ابا جی کو اس کا دوستیاں کرنا پسند نہیں تھا۔ مگر نہ جانے یہ دونوں کون سی ہڈی کے تھے کہ باوجود اس کے روکھے رویے کے وہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹ رکھتے۔

"اور وہ بھی تمہاری صرف اس خصوصیت کی وجہ سے کہ تم دیکھنے اچھے خاصے ہو اور یہی ہماری دوستی کی وجہ ہے۔" سانولے سے داور کو اپنے اچھے خاصے تیکھے نقش کو چھوڑ کر رنگت کے معاملے میں خاصا کمپلیکس تھا۔ اسی لیے اس کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں میں گورے رنگ کے لوگ پائے جاتے تھے۔ جیسے کہ زیب اور شیرف۔ لیکن شیرف کی پرسنالٹی بہت زبردست تھی اور یہاں زیب اس سے مات کھا جاتا تھا۔

"اور تمہاری یہی خوبرو پرسنالٹی ہمیں اس پٹاخہ لڑکی کو امپریس کرنے میں ہماری مدد کرے گی اور یوں تمہارے توسط سے ہماری بھی اس مہ جبین سے دوستی ہو جائے گی۔" زیب جوش و خروش سے بولتے بولتے آخر میں مدہوش سا ہو گیا اور داور جو ان کی ہر بات پر سرہلا رہا تھا۔

"تم دیکھو گے تو تم بھی حیران رہ جاؤ گے شیرف! وہ بہت خوب صورت ہے' میدہ سی رنگت' نازک لب۔"

"آہا!" بے ساختہ آہ زیب کی نکلی۔

نازکی اس لب کی کیا کہیے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اور بس شیرف کا ضبط جواب دے گیا۔

"شٹ اپ! حد ہوتی ہے' تمہیں میری پرسنالٹی کیش کروانے والی لگتی ہے اور میں نے ابھی زندگی میں بھی کسی لڑکی کو پٹایا ہے' جو میں اب یہ بے ہودہ حرکت کروں گا۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ یہ یوں ہی بولے گا۔ بے حد

مغرور شخص ہے یہ۔" داور کی آنکھیں ماتھے پر آگئیں۔

"تمہیں صرف ہلو ہائے کرنی ہے' رومانس نہیں کرنا اس کے ساتھ 'جو یوں بدک رہے ہو۔" زیب منہ بنا۔

"بات وہ کرو جو سمجھ میں آئے۔" وہ پھر انکاری۔

"شیرف" زیب کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیفے کے باہر ایک دم شور و غل مچا تھا۔ وہ تینوں ذکیا سب ہی باہر کی طرف بڑھے۔

"تم سمجھتے کیا ہو خود کو۔ سورما ہو گے اپنے گھر کے' مجھ سے بات کرنی ہے تو ذرا ادب سے 'تمیز سے سمجھے۔" نسوانی آواز پورے یونی گارڈن میں گونج رہی تھی۔ شیرف کو وہ آواز کچھ مانوس لگی۔

"او تمیز کی شہزادی!" یہ مکروہ آواز ان سرداروں میں سے ایک کی تھی' جس کی پیٹھ ان تینوں کی طرف تھی اور ان کے بیچ میں کی وجہ سے تمیز کی شہزادی پوری چھپی ہوئی تھی۔ "سارے کس بل نکل جائیں گے تمہارے۔ ہم سے دور رہو۔ ہمیں چھیڑو گی تو نقصان ہی اٹھاؤ گی۔"

"تم کہیں ہیں میرے پاس' جو بتاتی ہیں کہ کون چھیڑے جانے کے قابل ہے اور تم تو بات کرنے کے بھی قابل نہیں ہو اور فائزہ سے کہتے ہو کہ وہ تم سے محبت کرے 'کیونکہ تم اسے چاہتے ہو۔"

"ہاں تو کیا برائی ہے اس میں۔"

"برائی۔ خود کو آئینے میں دیکھنا چھوڑ دیا ہے کیا۔ نہیں پیار سے دیکھنے کا مطلب ہے کرتے کو باجرہ ڈالنا۔ کہاں تم کہاں فائزہ مطلب بہاولے حور میں لنگور داور۔"

اور سردار صاحب کی مٹھیاں پوری طاقت سے بند ہونے لگیں۔

اس کی استہزائیہ آواز پر دبی دبی ہنسی کہیں کہیں سے ابھری اب تو پھر سردار کو خونخوار ہونے سے کون روک سکتا تھا۔

"او بے۔ تو۔" پوری طاقت سے بند مٹھی کو اس کی طرف پھینکا۔ لیکن زمین پر جا کر اتھا۔

وہ اس کا پھینکا گیا موبائل تھا جو پوری قوت سے واپس اس تک آیا تھا اور جو لگا بھی اسی طاقت سے تھا۔ مگر اس کے گرنے کی وجہ اس کا اس حملے سے بچنا تھا۔ گھبراہٹ میں وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر آ رہا۔

"او گاڈ۔۔۔"

"لڑکیوں والے تیور ہونا چاہیے نڈر' بے باک۔"

"بہت زبردست کیا اس نے۔"

ملی جلی آوازوں کا ملا جلا رد عمل۔

شیرف قیصر نے وقوع پذیر ہوتے واقعے سے نگاہ ہٹاتے سامنے دیکھا اور پتھر ہو گیا۔ الٹی کیپ' سرخ کرتا اور وائٹ جینز کے ساتھ کتابیں تھامے۔ مطمئن' پرسکون کھڑی تھی۔

"شیرنی۔۔۔" اس نے زیر لب کہا۔

"واٹ۔" زیب اور داور بھی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ مگر وہ انہیں کیا بتاتا۔ وہ تو اسے دیکھ کر غش کھانے لگا تھا۔

اس شیرنی سے دوستی۔۔۔؟

☼ ☼ ☼

کہنے کو تو یہ بھی عام گھرانوں جیسا گھر تھا' پرسکون۔ کم نفوس پر مشتمل خاندان' نہ شور شرابا نہ ہی کھانے پینے کا کوئی مسئلہ۔ ملک قیصر دین جانے مانے بیوپاری تھے۔ اچھا چلتا کاروبار تھا کپڑوں کا۔ روپے کی ریل پیل نہ سہی مگر کوئی کمی بھی نہیں تھی کسی چیز کی گھر میں۔ بس ان کی سخت مزاجی سے شیرف کی جان جاتی تھی اور اس کے دوست جو خود کو اس کا دل و شر کہتے تھے۔ اسے اس پٹاخہ لڑکی سے دوستی کرنے کو کہہ رہے تھے اس کے ابا جان کو پتا چل جاتا تو وہ حشر ہوتا کہ الامان الحفیظ۔

وہ انظار کے بعد بہت خاموشی سے اپنی کتابیں لیے تازہ ہوا کا مزا لینے چھت پر چلا گیا۔ گرمی زیادہ تھی۔ ذہن خوش گواری کی زد میں آیا تو لبوں سے نغمے

پھوٹنے لگے۔

دل عبادت کر رہا ہے دھڑکنیں میری سن
تجھ کو میں کر لوں حاصل لگی ہے بس یہی دھن

کتاب بغل میں دبائے وہ سرِ تے گنگناتے ہیں مگن تھا۔ ہلکی ہلکی بھنبھناہٹوں پر اسے بریک لگے۔

ادھر اودھر دیکھا مگر کوئی نہ تھا سو پھر سروں کی کٹ میل میں مصروف ہوا مگر اب بھنبھناہٹیں آوازوں کا روپ دھارنے لگیں۔ نسوانی آوازیں... وہ چونک گیا۔ آوازیں برابر والی چھت سے آرہی تھیں۔

"تمہارا دماغ خراب ہے زمرد! جب دیکھو لڑکوں کے سامنے کھڑی ہو جاؤ انہیں کچھ نہ کچھ کہہ رہی ہوتی ہو۔"

"اس میں دماغ خراب ہونے والی کون سی بات ہے اور لڑکے بھی کون سے ایسے بابو جان ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے کھڑے ہی نہیں ہوا جا سکتا۔ ارے لڑکیوں کی انسلٹ کرنے والے اور ان سے فلرٹ کرنے والے کسی بھی لڑکی کے سامنے کھڑے ہونے کے قابل ہوتے بھی نہیں۔ انہیں تو صبح شام چار چار جوتے لگانے چاہئیں۔" شیر دلیرانہ آواز کافی شناسا سی تھی۔ اسے تجسس ہوا تو وہ ذرا آگے آیا اور دیوار سے کان لگا دیے۔

"تم نے ٹھیکہ لیا ہے کیا سب لڑکوں کو درست کرنے کا اور خود لڑکیاں بھی تو ایسی ہی ہوتی ہیں خود کو کچش کروانے والی۔" دوسری آواز میں اکتاہٹ تھی۔

"تو دیکھو نا نمبر... جو فلرٹ کرنا چاہتی ہیں یا خود ہی کسی کے ہاتھوں فلرٹ ہونا چاہتی ہیں مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے کیا نہیں۔ ہاں مگر کچھ بے وقوف اور کم عقل لڑکیوں کو کوئی چھیڑے یا انہیں جھوٹی دوستی کے چکر میں شامل کرنا چاہے۔ اس کا حشر نشر میں ہی کروں گی۔" لہجہ مضبوط ارادہ لیے تھا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے الٹی کیپ، گول چہرہ، شربتی آنکھیں، سرخ فراک، سیاہ جینز سب گھوم گیا۔

"اور اگر کسی نے تمہیں بنانے کی کوشش کی تو..."

"ہونے کو تو ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر وہ جو بھی ہو گا اس کے بال بہت خوب صورت ہونے چاہئیں۔"

انگلیاں بکھر الجھنے۔ عجیب سی بات...

"کیوں...؟" ماہ نم بھی حیران ہوئی اور دیوار کے پار وہ بھی۔

"اس لیے کہ پھر اسے گنجا بھی میں ہی کروں گی اور وہ بھی ایسا کہ عمر بھر بالوں کو ترسے گا۔" چپا چپا کے چبائے لہجے میں حد درجہ خونخواری تھی۔

ماہ نم ہنس پڑی اور شرف نے لرزتے دل سے بے ساختہ اپنے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور جھرجھری لی۔ دس سال کی عمر تک گنجا ہونے کا عذاب جو اس نے سہا تھا، وہی جانتا تھا۔ اس کے بعد بالوں نے بھی ترس ترس کر اپنا آپ دکھایا اور وہ جو دس سال کی عمر میں بالوں والا ہوا تھا۔ سو گنجا ہونے کا رسک تو وہ بھی لے ہی نہیں سکتا تھا۔

"شرف..." ابا جان کی آواز پر وہ نیچے اترا اور سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور پہلے ہی قدم پر جھٹکا لگا۔ زیب اور داور تنقیدی نگاہوں سے اس کے کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

"تم لوگ یہاں؟" اس کی حیرت پر وہ دونوں ہی متوجہ ہوئے۔

"کیوں، کیا ہم یہاں نہیں آسکتے۔" زیب نے اطمینان سے گٹار کو ایک طرف رکھا۔

"لیکن ابا جان۔" اسے بے ساختہ گھبراہٹ ہونے لگی۔ آج تک اس کا کوئی دوست یا ملنے والا کبھی اس طرح گھر نہیں آیا۔ اور یہ تو اس کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی ابا جان کی موجودگی میں۔

"ارے تمہارے ابا جان ہی ہم کو یہاں بٹھا کر گئے ہیں۔" اس قدر حیران کن بات پر بھی وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ یہ بھی حیرت تھی اور اس سے پہلے کہ کچھ کہا جاتا۔ چھتری کی ٹک ٹک سنائی دی اور ان دونوں نے بجلی کی تیزی سے جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور ہاتھ سر پر رکھا۔ سفید جالی کی ٹوپی سر پر پہنچ چکی تھی۔

"ارے اتنے نفیس ہیں تمہارے ابا جان! تم نے کبھی ہم سے ملوایا نہیں شیرف! بہت غلط بات ہے۔"

"کیا مشفق طبیعت پائی ہے انہوں نے۔ میں تو دل و جان سے فدا ہوا۔"

"بہت خوش نصیب ہو تم شیرف!" داور کی تعریفوں پہ تعریفیں۔

شیرف ہکا بکا کھڑا تھا۔

"اور بچو! کچھ چاہیے تم لوگوں کو۔" بغیر کسی دھماکے کے پہلی مرتبہ ابا جان کی آمد اس کے کمرے میں ہوئی اور ایسا شیرینی بھرا لہجہ۔ اب تو اسے بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا۔ شیرف نے بے ساختہ سوچا۔

"او انکل جی آپ... کہیں نہیں۔ گنجائش نہیں کسی چیز کی افطاری کر کے ہی نکلے تھے ہم۔"

"پھر بھی..." ابا جان کا اصرار ہوا۔

"ٹھیک ہے اب اگر اتنا اصرار ہے آپ کا محبت بھرا تو ایک کپ چائے ہو جائے۔"

"ہاں... ہاں کیوں نہیں۔" وہ سر ہلاتے مڑے تو شیرف کی چھٹی حس کو اتنی حلاوت اور اخلاق پر ان دونوں کی شامت نظر آئی کہ جو دکھتا ہے وہ ہوتا نہیں لیکن انہیں کون سمجھاتا۔ وہ بے بسی سے ان کو دیکھنے لگا، جو ٹوپیاں واپس جیب میں رکھ چکے تھے۔

"دیکھو یہ ذرا سے بازیاں مت کرو اگر ابا جان کو پتا چلا تو تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی خیر نہیں۔"

"اب جانے بھی دو۔" داور نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔ "تم نے تو ہوا بنا رکھا ہے اپنے ابا جان کو... تمہیں ان بزرگ لوگوں کو ڈیل کرنا ہی نہیں آتا۔ اگر آتا ہوتا تو یہ ابا جان... ابا جان کی گردان نہ کر رہے ہوتے۔"

"بکواس نہیں کرو۔" طعنہ زور سے لگا تھا۔

"تم جانتے ہو ہم بھی "ابا جان" والے ہیں شیرف! مگر تمہاری طرح انہیں جان کا عذاب نہیں بنایا ہوا۔ جد ہے۔ لگتا ہے تمہیں "گر" دینے پڑیں گے۔" زیب کا انداز خاصا سوچتا ہوا تھا۔

"مگر؟" اس نے آنکھیں سکیڑیں۔

"ہاں جی۔ ابا جان کو پتا نا گزری کو پتا لگانے سے ذرا کم مشکل ہے۔ اس کا نمبر ون گر یہ ہے کہ ابا جان کے سامنے ہمیشہ خود کو قابل، محترم، معزز بنانے کے لیے ہر بات پر فرماں برداری کرو۔ نمبر دو، ایک عدد ٹوپی ہمیشہ ساتھ رکھنی چاہیے کہ بزرگ لوگ خاصے پرہیز گار دین کے پروفیسر ہوتے ہیں اور یہ ٹوپی سلطانی ٹوپی سے کم کراماتی نہیں ہوتی ہے ویسے بوقت ضرورت تسبیح بھی ہو جائے تو چار چاند۔ ابا جان کے ساتھ ساتھ محلے والوں کے نزدیک بھی مشہور ہو جاؤ گے۔" یہ داور تھا۔

شیرف کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔

"رہ گیا جوان دل ہمارا، تو وہ تو رہتا ہی آزاد ہے۔ بس ذرا ابا جان کو اس کی آوارہ خیالی کا پتا نہ چلے۔ موبائل پر ایس ایم ایس۔"

"ویڈیو دل پسند۔"

"راتوں کی آوارگی۔"

کمپیوٹر پہ نیٹ چیٹنگ۔

کبھی داور کہتا اور کبھی زیب۔ شیرف کا سر گھوم گیا۔

"پھر یہ ابا جان جیسی مخلوق چیز ہی کیا۔" داور کا منہ اڑتی ہوئی کسی چیز نے بند کیا۔ اب کے سر اس کا گھوما تھا۔

زیب ہڑبڑا کر..... اٹھا اور داور کو دیکھنے لگا جو کھڑے کھڑے اچانک گرا تھا۔ کیا ہولناک منظر تھا۔ شیرف کے قدموں میں گرا داور اور ابا جان کی پشاوری چپل۔

اڑتی چیز کا معمہ حل ہوتے ہی شیرف کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"خبیث اولاد... ناہنجار، نالائق تمہارا تو میں اب کرتا ہوں بندوبست۔" پشاوری چپل کا دوسرا پاؤں لیے عزت مآب ابا جان چنگھاڑتے اندر آئے۔

وہی ہوا جس کا شیرف کو ڈر تھا۔

"تمہارے باپ کی طرح اندھا اعتماد نہیں کرتا میں تم جیسی اولادوں کو تو ڈوب کے مر جانا چاہیے مگر ایسی آنکھوں کو دھول جھونکنے والی اولاد ہو۔" پشاوری چپل سیدھے کھڑے زیب کے کندھے پر تھی تو اس میں بھی

جان پڑی۔ زیب اور داور تو پھر فوراً "جان بچا کر بھاگ گئے۔ مگر بے چارہ مسکین سا شیرف ہزار منتوں کے بعد بھی۔۔۔

☆ ☆ ☆

نواں روزہ بھی اپنی پوری برکتوں کے ساتھ شروع ہونے والا تھا۔ فجر کی نماز ابا جان کے ساتھ مسجد میں ادا کرتا۔ ابا جان آگے آگے۔ شیرف قیصر پیچھے پیچھے۔ ابا جان کوشش کرتے کہ شیرف اب ان کے ساتھ ہی آئے جائے۔ حد تو یہ کہ یونی ورسٹی بھی لینے اور چھوڑنے جاتے۔ اور اکثر "ان ناہنجاروں کے ساتھ تو نہیں تھے۔" پوچھتے پھر گھر آکر وقتاً "فوقتاً" اس کے کمرے میں اچانک جھانکتا۔۔۔ وہ کچھ دیر کی پرائیویسی بھی ختم ہو گئی تھی۔ ابا جان اس کے ساتھ اس طرح سلوک کر رہے تھے جیسے وہ کوئی لڑکی تھا اور رنگے ہاتھوں کسی لڑکے کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔ ماں جی سے کچھ کہنا ویسے ہی بے کار تھا کہ وہ بھی اپنے شوہر نامدار کے آگے شیرف قیصر کی طرح بول نہ پاتی تھیں اور شاید یہی خوف اسے ماں جی کے بطن سے ملا تھا جو وہ اک لفظ بھی اپنی صفائی میں پیش کرتے ڈرتا تھا۔

"اور بھئی قیصر دین! کہاں ہو آج کل۔۔۔" یاسر چغتائی اپنی پوری آن بان کے ساتھ سامنے آگئے۔ دونوں کو "پکڑنا پڑا۔" کچھ خاص نہیں۔ بس مصروفیت ہے کچھ۔" اک نظر شیرف قیصر کے جھکے سر کو گھورا جو سر جھکائے کھڑا تھا۔

"او بھائی چھوڑو سب یوں کہو کہ دل نہیں کرتا ملنے کا۔"

خود ملک قیصر دین حیران ہوئے اس بے تکلفی پر۔

"نہیں اب ایسا بھی نہیں ہے۔ کاروباری آدمی ہوں۔ مصروفیت تو رہتی ہے۔"

"چلو تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔" یاسر چغتائی نے بے پروائی سے کہا۔

ملک قیصر دین اپنی چھوٹی آنکھیں مزید چھوٹی کرتے غور سے دیکھنے لگے کہ یہ وہی یاسر چغتائی ہیں جو ان کے گھر کی چھت اپنی چھت سے برابر ملنے پر اچھا خاصا جھگڑا کر چکے تھے۔ دوستی تو نہ رہی البتہ کبھی کبھار بات چیت یا سلام دعا ہو جایا کرتی تھی۔ مگر اب یہ ناز۔۔۔ یہ نخرے۔۔۔

"تم گھر جاؤ شیرف! میں ابھی آتا ہوں۔" وہ حیران سا چل پڑا۔

"سیدھے گھر ہی جانا۔" تنبیہہ کرنا نہ بھولے۔

"ہاں تو گھر ہی جاؤں گا۔ اب ڈیٹ پر تو جانے سے رہا۔" یہ دل جلانے والی بات دل میں ہی سوچی۔ کہنے کی جرأت نہ تھی۔

"بڑا ہی نیک طبیعت کا بچہ ہے ماشاء اللہ۔" یاسر چغتائی کے تعریفی کلمات پر ان کی گردن اکڑ گئی۔

"اب کہو بات کیا ہے؟" جانچتی تولتی نظروں سے وہ یاسر چغتائی کو دیکھنے لگے۔ یاسر چغتائی کچھ گڑبڑائے اور پھر اٹکتے اٹکتے رواں ہو گئے اور جیسے جیسے وہ کہتے گئے' ملک قیصر دین کی پیشانی پر بل آتے گئے۔

"ہوں۔۔۔ ہوں۔۔۔ اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ یہ بات۔۔۔" وقفے وقفے سے بات کے بیچ میں کہے ان فقروں پر یاسر چغتائی کو حوصلہ ملتا گیا۔ آخر کار بات ختم ہوئی۔

"ویسے تم اچھے خاصے ہو۔۔۔ قابو میں تو رکھ ہی سکتے تھے۔"

"بس کیا بتاؤں۔۔۔ ہمت ہی نہیں ہو پائی۔" چند لمحے سوچنے میں وقف کیے' کہیں کوئی چال تو نہیں' پھر ان کے مجرمانہ انداز پر نگاہ گئی اور سوچوں کو جھٹکا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔" اک روشنی صبح کی چاروں طرف پھیلی تھی اور اک روشنی جناب یاسر چغتائی کے چہرے پر اس جواب سے۔

"بس اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔"

"تو اب ایسا ہے کہ میں اس ہفتے خاصا مصروف ہوں۔ اگلے ہفتے نہیں بلکہ آخری عشرے کے پہلے روزے کو ہم تمہارے ہاں افطار کرتے ہیں۔ بولو بھئی۔" انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کیوں نہیں۔۔۔ کیوں نہیں۔" کنجوسی اپنی جگہ۔۔۔ مگر معاملہ بھی گمبھیر تھا۔ سو ہامی بھرنی پڑی۔ پھر چاہے

چہرہ بھیگا شلغم جتنا یا جوس نکالنے کے بعد بچا کچھا مالٹا کیا فرق پڑتا تھا۔

☆ ☆ ☆

کبھی کبھی تو دل چاہتا کہ گھر کو ہی چھوڑ کر چلا جائے مگر ماں جی کی صورت اسے جانے نہ دیتی۔ وہ سخت بے زار ہو گیا تھا اور یہ بے زاری تب سوا ہو گئی تھی جب زیب اور داور سامنے آ گئے۔

"تم اب چھپنا بند کر دو شیرف! تمہاری شرمندگی صحیح ہے۔ مگر ہم دوست بھی تو ہیں۔" داور کی بات پر ایک لمحے کو اس کا منہ کھلا رہ گیا۔

"میں شرمندگی کی وجہ سے نہیں اپنے ابا جان کے منع کرنے پر تم سے چھپ۔۔۔ مطلب مل نہیں رہا ہوں۔" گڑبڑا کر کہا۔

"اپنے ابا جان کی تو بات ہی مت کرو! انہیں تو تم نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔" داور کو شاید پشاوری چپل یاد آ گئی تھی۔ سو خوب جلا۔

"تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے اور ہٹو میرے راستے سے۔" اس کے خشک لہجے میں حد درجہ بے مروتی تھی۔ وہ انہیں کوئی ڈھیل نہیں دینا چاہتا تھا۔

"جو ہوا سو ہوا شیرف! اب یوں۔۔۔ مگر دوستی تو نہ ختم کرو۔"

"میری تم سے پہلے بھی دوستی نہیں تھی۔"

"نہیں بس۔ خیر اب بھی کچھ نہیں۔"

"اب بھی سب کچھ ایسا ہی ہے۔ تم دونوں میری جان چھوڑ دو۔ تمہاری وجہ سے اب تک عذاب جھیل رہا ہوں۔" شیرف نے حقیقتاً ہاتھ جوڑے اور ٹھنڈے مزاج زیب کو غصہ آ گیا۔

"یہ عذاب بھی تمہارا ہی لایا ہوا ہے۔ ورنہ چاہو تو کچھ بھی کر سکتے ہو۔ لیکن اپنے باپ کی نگاہوں میں خود کو اچھا ظاہر کرنے کے لیے سب ہی کچھ گزر کر دیتے ہو۔ پتا نہیں ایسا کیا کیا ہے کہ تمہارے ابا جان تمہاری طرف سے اتنے بے یقین رہتے ہیں۔" شیرف کی آنکھیں پھٹ گئیں اس کے شک بھرے لہجے پر۔

"ہزاروں گھر ہیں ایسے جس میں اکلوتے لڑکے ہوتے ہیں اور ان کے باپ حد درجہ غصے والے بھی مگر پھر بھی انہیں ان پر کسی حد تک اطمینان ہوتا ہے۔ اعتبار بھی اور آزادی بھی۔ لیکن تم نوجہاں کے جیسے اکلوتے ہی ہو۔ ہر چیز پر پابندی' ہر چیز پر روک ٹوک' لیکن اس حد تک بھی اپنے ابا جان کو تم ہی لائے ہو اور وجہ بھی تمہاری اپنی بزدلی ہے۔ فرماں برداری اچھی ہے۔ مگر تم تو جیسے کسی لڑکی کی طرح بے زبان گائے جیسے ہو۔ کسی بھی بات پر نہیں بولتے اور مجھے تو لگتا ہے ناجائز کیا تم جائز بات پر بھی نہیں بولتے ہو گے۔ اتنی اطاعت کرنا ہے ابا جان کی تو بے شک کرو۔ ہمیں کیا۔ ہمیں بھی تمہاری دوستی کی ضرورت نہیں۔ ہم تو تمہارے بھلے کے لیے ہی چاہ رہے تھے کہ اس لڑکی کو پٹالو' وارے نیارے ہو جائیں گے تمہارے۔ ارے جو حق کے لیے ہی لڑتی رہتی ہے۔ ہر کسی کے لیے ہم نے سوچا کہ تمہارے لیے بھی لڑے گی۔ مگر تم۔۔۔ تم جاؤ بھاڑ میں اپنی تمام تر بزدلی سمیت۔" زیب بولنے پر آیا تو نان اسٹاپ بولتا چلا گیا۔ اس لیکچر کے بیچ میں داور نہ جانے کتنی بار ٹوکنے کے لیے آیا۔ مگر ہر بار وہ اسے سامنے سے ہٹا رہا۔

"یہ کیا کہا تم نے؟" شیرف کو ساکت چھوڑتے کچھ دور جانے پر ہی داور نے سختی سے پوچھا تھا۔

"بھاؤ مت کھاؤ' تمہیں نہیں پتا' میں کیا کر آیا ہوں۔" زیب کا غصہ اب ختم تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔" داور حیران ہوا۔

"گرم لوہے پر چوٹ لگا آیا ہوں۔ اب دیکھنا ہمارا کام کیسے ہوتا ہے۔ شیرف بذات خود اب اس لڑکی کے چکر میں رہے گا' ہر خوف بھول کر۔" زیب کی بات پر داور کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"واقعی۔۔۔" وہ دونوں اب بہت آگے کی پلاننگ کرنے لگے اور شیرف وہیں کھڑا زیب کی باتوں کے حصار میں تھا۔

"میرے لیے یہ سب کہا اس نے۔۔۔ اور یہ کیا کہا

اس لیے کہ وہ میرے لیے لڑے گی۔ مگر کیسے۔۔۔ ابا جان کے سامنے تو کوئی بول ہی نہیں سکتا میں بھی نہیں پھر وہ لڑکی کیسے؟"

اسے کبھی کسی نے یہ سب نہیں کہا تھا۔ سب ہی اسے سراہتے تھے اپنی فرماں برداری پر، پہلی مرتبہ کسی نے اسے نئی راہ دکھانے کی کوشش کی تھی۔

"کہیں یہ بدلہ تو نہیں لینا چاہ رہی اس دن ابا جان کی ڈانٹ کا۔ یقیناً" یہ ان کی کوئی چال ہے۔" اسے بیڈ پر اوندھے لیٹے اسے پہلی مرتبہ یہ خیال آیا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے مگر کہا تو اس نے ٹھیک۔۔۔ ایک نیا ٹریک۔ وہ لڑکی واقعی ایک مردار قسم کی لڑکی ہے۔ اگر میں نے اسے پٹا لیا تو شاید میری زندگی بدل جائے۔" کافی خوش کن خیال تھا۔ وہ پھرتی سے اٹھا اور آئینے میں جا کھڑا ہوا۔ "کہیں تو کیا میں تو پورا ہی اچھا خاصا رکھتا ہوں اور پرسنالٹی۔۔۔ راور کے کہنے کے مطابق اچھی خاصی ہینڈسم۔۔۔ اور بال۔۔۔" آئینے میں خود کو ہزاروں زاویوں سے دیکھتا وہ ایک دم رکا۔

"بال۔۔۔"

"اس کے بال بہت خوب صورت ہونے چاہئیں۔ کیونکہ پھر اسے گنجا میرے ہی ہاتھوں ہونا ہے۔" اپنے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے یہ آواز سارے ارادوں کو جھاگ کی طرح بٹھا گئی۔ لیکن پھر ایک اور خیال۔۔۔

"محبت تو اچھے خاصے سورماؤں کے کس بل نکال دیتی ہے۔ پھر اس سورما۔۔۔" وہ اپنی ہی سوچ پر ایک پل ٹھٹکا۔

"محبت۔۔۔" چند لمحے سوچا اور پھر دل کو گداز ہونے سے روک کر منصوبہ بندی کرنے لگا۔

✡ ✡ ✡

شیرف کی بارہ روز کوشش کے بعد منظور نظر نگاہوں سے اوجھل تھا۔ چھت کی آدھی دیوار تک پہنچنا تقریباً" ناممکن تھا اور یونیورسٹی میں مخاطب کرنے کی ہمت جواب دینے لگی۔ کیونکہ وہ جواباً" کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اب رہ گئے زیب اور داور۔۔۔ تو اس دن اس کے

چودہ طبق روشن کر دینے کے بعد سے وہ مکمل لاتعلق ہو گئے تھے۔ وہ کہاں جاتا اب۔۔۔ دن رات گزر رہے تھے اور اب بے تابی تفکر سے ہوتی مایوسی میں ڈھلنے لگی تھی کہ بے حد عمدہ ترکیب اس کے دماغ میں آئی۔

رات کے ڈیڑھ بجے وہ اپنے میموری کارڈ میں ڈاؤن لوڈ گانوں کے ویڈیوز دیکھ رہا تھا جو ابا جان نے اپنی نگرانی میں بھروائے تھے۔ پرانے پاکستانی گانے۔ مطلب اپنی دانست میں یہ بھی ان کی دی ہوئی آزادی تھی کہ انہوں نے بچے کو اس حد تک بھی نہیں دبوچ رکھا۔ کچھ حد تک سانس لینے کی آزادی بھی تھی۔ اس کے کمرے میں ہر چیز تھی۔ مگر اس کو استعمال میں لانا ابا جان کی مرضی کا تابع تھا۔

لیکن بھلا ہو بلیو ٹوتھ کا کہ جس کے متعلق ابا جان کو خاص معلومات نہ تھیں۔ ورنہ۔۔۔

کبوتر جا جا جا۔۔۔

کبوتر جا جا جا۔۔۔

لڑکی نے ادھر کبوتر اڑایا اور ادھر شیرف کے دماغ میں آئیڈیا آیا۔ بس پھر کیا تھا۔ شیرف نے خط لکھنا شروع کیا۔ چھوٹی سی نوکری بھرلی گئی۔ خدا۔۔۔ خدا کر کے خط لکھا گیا تھا کہ "نتیجہ آپ کا اپنا شیرف پر ابا جان کی آواز نے اسے اچھال دیا۔

"برخوردار سحری کا وقت نکلتا جا رہا ہے۔ اب کیا فجر کی نماز ادا کر کے سحری کرو گے۔" چھڑی کی ٹک ٹک نے دروازہ بجایا۔ اس نے پھرتی سے نوکری بیڈ کے نیچے کی اور خط کو ٹراؤزر کی جیب میں ٹھونسا۔ وہ یہاں وہاں رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

"جی ابا جان۔۔۔ میں اٹھا ہوا۔۔۔ مم۔۔۔ میں اٹھ گیا ہوں۔" اس نے زور سے منہ پر ہاتھ رکھا۔ دل کی دھڑکن تیزی اختیار کر گئی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ابا جان کا "جلدی آؤ۔۔۔" سنائی دیا اور اس نے شکر کی سانس لی۔

جلدی جلدی فریش ہو کر کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتا وہ باہر نکل آیا۔

شیرف قیصر کے مزاج کا رنگ تو آج الگ ہی تھا۔

اسے آج کا یہ گرم دن بھی بڑا سہانا لگ رہا تھا۔ وہ گنگناتا ہنستا چہک رہا تھا۔ لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔

یونیورسٹی کے پوائنٹ میں بھی وہ کتابوں پر انگلیاں کافی ردھم میں بجاتا رہا۔

پوری یونیورسٹی میں جہاں جہاں وہ نظر آئی' مسکراہٹ لبوں پر... پھیلی۔ لیکن یہاں وہ اسے اپنا خط نہیں پکڑا سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ دن تمام ہوا اور واپسی کا سفر شروع ہوا اور جس بے چینی سے وہ بھاگ رہا تھا۔ پورا دن اسے ہی نوٹ کرتے زیب اور داور نے بھی دیکھا۔

"لگتا ہے ہمارا کام ہو گیا ہے۔ پنچھی ہمارے جال میں پھنس گیا ہے۔" داور نے معنی خیزی سے کہا۔

"کیا ہے یار... اس طرح کے فضول ڈائیلاگز مت بولا کرو۔" زیب جیسے انگلش بولنے کو برا لگا۔ داور ذرا کھسیا گیا۔

"اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" ان کے اندازوں کی نوکری ان کے ساتھ تھی۔

شیرف کی ڈگری شیرف کے ساتھ۔

وہ اسے تلاش کر رہا تھا۔ مگر یونیورسٹی کے گیٹ کے باہر وہ اسے کہیں نہ ملی۔ "میں نے تو سوچا تھا کہ باہر ہی اسے رش میں پکڑا دوں گا یا پھر جان بوجھ کر ٹکرا جاؤں گا اور اس طرح ٹکرانے سے جب اس کی بکس گر جائیں گی تو انہیں اٹھانے کے بہانے ان میں خط کو رکھ دوں گا... مگر وہ تو اب ہے ہی نہیں 'اب کیا کروں۔"

کافی دیر یوں ہی کشمکش میں رہا۔ پھر منہ لٹکا کر اپنے رستے پر ہو لیا۔ سارے دن کی خوشی پر جیسے پانی پھر گیا تھا۔

"چلو کل سہی۔" خود کو اطمینان دلایا تھا۔ مگر مطمئن نہ ہوا۔ "ہائے میری قسمت؟"

"کیا ہوا برخوردار... کہاں کھوئے ہوئے ہو؟" گلی میں داخل ہو رہا تھا کہ شناسا سی آواز پر چونکا۔ سامنے یاسر چغتائی اپنے پورے بتیس دانتوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

"کہیں نہیں انکل..." اس نے فوراً جواب دیا۔

"ہاں بھئی... یہ تو تم ہو۔ ملک قیصر دین کے سپوت... ورنہ اگر کوئی اور ہوتا تمہاری جگہ تو یہ کھویا کھویا انداز یقیناً" کسی لڑکی کے چکر کی وجہ سے ہوتا۔"

وہ بے ساختہ گڑبڑایا۔ دل کا چور چہرے پر تو نہیں آگیا۔ لیکن ان کی نگاہوں نے اس کی گھبراہٹ نہیں بھانپی تھی۔

وہ اپنی دھن میں کہہ کر چلتے بنے اور وہ سر جھٹکتا آگے بڑھا۔ مگر پھر ایک دم ٹھٹکا۔

اپنے گھر کے گیٹ کے بالکل سامنے وہ اکیلی کھڑی کچھ دیکھ رہی تھی۔ شیرف کے دل کی کلی کھلی۔

"ایسا کرتا ہوں کہ خط یہیں اس کو دے دیتا ہوں۔ نہیں... بلکہ اس کے قدموں کے سامنے پھینک دیتا ہوں اور چپکے سے دیوار کی اوٹ میں ہو جاؤں گا۔ کیا پتا جلنے لگا ہے... اور اسی طرح خط دوں گا محبت بھرے تب ہی تو پتھر دل پگھلے گا اس کا۔" وہ منصوبہ تیار کرتا اپنے اور یاسر چغتائی کے گیٹ کی درمیانی دیوار کو نظروں ہی نظروں میں ناپنے لگا۔ ساتھ ہی شرٹ کی اوپری جیب سے خط نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور ابھی اس کے پیچھے دبے پاؤں پہنچا ہی تھا کہ وہ جھٹکے سے پلٹی۔ وہ اس کی پھرتی پر حیران بھی نہیں ہو سکا تھا ٹھیک سے کہ وہ صرف ایک پل کو اسے دیکھ کر ٹھٹکی تھی بس۔

"تم... تمہاری یہ ہمت کہ تم مجھے اس طرح کی چیپ چیزیں دو گے۔" شربتی آنکھیں اس پر جمی تھیں اور وہ قطرہ قطرہ پگھلنے لگا تھا۔ نراہٹ سے نہیں خوف سے...

غصے بھری آنکھیں تو وہ ابا جان کی نہیں دیکھ سکتا تھا' جو کہ سائز میں بھی چھوٹی چھوٹی تھیں تو ان بڑی بڑی موٹی موٹی آنکھوں سے کانپنا تو بنتا ہے نا۔ وہ حسبِ سابقہ" سب بھول گیا۔ یہ بھی کہ اس نے تو ابھی خط دیا ہی نہیں تھا پھر یہ الزام کیسا؟

"تم جیسے گھٹیا لڑکوں نے ہی سارے لڑکوں کو بدنام کر رکھا ہے۔ عمر دیکھو اپنی اور یہ گھٹیا حرکتیں بھی..."

"دیکھیں میں... کوئی گھٹیا پن نہیں دکھانا چاہ رہا"

میں تو دراصل آپ سے م۔۔۔م۔۔۔ محبت کرتا۔۔۔"
ہکلایا۔۔۔ "اس کے بعد۔ خوب صورت ڈائیلاگ کو اس کی چیخ نے ادھورا چھوڑ دیا۔

"اتنی گری ہوئی گھٹیا چیزیں دے کر تم مجھ سے محبت ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

"میں نے کب کھ دیا۔ "آپ کے وہ قدرے ٹھٹکا۔

اس کے مکر جانے پر زمرد کو تاؤ آگیا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی چیزیں تقریباً" اس پر پھینکیں جو شیرف کے چوڑے سینے سے ٹکرا کر گریں۔ وہ جو اپنی ہی جرات اور دست پر حیران کھڑا تھا جھک کر نیچے پڑی چیزوں کو دیکھا۔

انڈین موویز کے فوٹو تھے اور ایسے تھے کہ شیرف کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔

"یہ۔۔۔ یہ میں نے نہیں دیے۔" وہ بے ساختہ چیخا۔ لیکن زمرد جھک چکی تھی اپنی سینڈل کا اسٹریپ کھولنے۔

"اسے تو میں ہی گنجا کروں گی۔" شیرف کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ تیر کی تیزی سے پلٹا اور کھلے گیٹ سے اندر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ دروازے پر سینڈل پڑنے کی آواز اس نے صاف سنی۔

ادھر زمرد غصے سے کھولتے ہوئے ذہن کے ساتھ گیٹ کی طرف پلٹی تو اس کے پاؤں کے نیچے بے حد نرم سا کاغذ آیا۔

چند لمحے یوں ہی گھورتے اس نے اسے اٹھایا اور تیزی سے کھولا۔ بے حد خوب صورت گلابی لیٹر پیڈ کے اس صفحے پر صاف ستھری رائٹنگ میں لکھا تھا۔

"بے حد معزز و محترم مس زمرد!"

اور پھر حیرانی و تجسس سے اس کی نگاہ۔۔۔ کاغذ پر پھیلتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

خواہش حسرت اپنی جگہ۔۔۔ مگر یہ پیار محبت نری حماقت۔۔۔ بھلا کوئی ابا جان سے فکر لے سکتا ہے۔ ناممکن سی بات۔۔۔ لیکن اس کے بدلے یہ ساری زندگی کی غلامی نہیں لے سکتا تھا۔

"جو ہوا ٹھیک ہوا محبت تو ہے بڑی بلا اور ایک اور بلا۔۔۔ کون جانے گا۔ وہ بھی خود اپنے ہاتھوں اور میں نے کب اسے وہ سب دیا مگر یقیناً" کسی نے اسے میرے خلاف ورغلانے کی کوشش کی ہوگی۔ مگر ایسا کرے گا کون؟" اس سوالیہ نشان کو وہ ارد گرد اپنے قریب و جوار میں ڈھونڈنے لگا۔

اس نے سر جھٹکا۔ کمرے سے باہر نکلا۔

"ہاں تو بھئی شیرف! رکو ذرا۔" وہ بغیر پلکیں جھپکے انہیں دیکھنے لگا۔ ایسی بے یقینی اس لیے تھی کہ ابا جان کے انداز ونگ نہیں تھے۔

"ایک بات کرلوں تم سے۔ اگر وقت ہو تو؟"

"جی۔۔۔ جی ابا جان۔" وہ پریشان سا بیٹھ گیا۔

"فائنل ایگزام کب تک ہیں تمہارے۔"

"جی وہ تو عید کے بعد ہی ہوں گے۔"

"عید کے بعد۔۔۔ ہوں!" داڑھی کے بالوں کو بائیں ہاتھ سے سیدھا کیا۔ سوچتا انداز۔۔۔

"تو بھی تم کوئی بات نہیں ہو۔۔۔" اب خود کلامی۔

"اور کاروبار کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جب تک جاب یا کیریر کو سیٹ کرو گے تب تک تو میں ہوں۔ تو پھر۔۔۔ چلو یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں۔" خود ہی جوڑ توڑ کرتے نگاہ اس پر جمائی۔

وہ جل تو جلال تو کا ورد کرنے لگا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے ماں کو دیکھنا چاہا۔ لیکن یہ کیا۔ ان کا سست مندمل چہرہ سرخ سا ہو رہا تھا۔ پر جوش سا ہو رہا تھا۔ اب تو اس کے دونوں اطراف گھنٹی بجنے لگی۔ وہ بھی خطرے کی۔

"ہم نے تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس کر دی ہے۔ عید کے اگلے دن تمہاری بارات ہے۔" بم پھٹ گیا۔ وہ مل بھی نہ سکا اور ماں جی تو جیسے بس خبر کے نشر ہو جانے کے انتظار میں تھیں۔۔۔ اس کا چہرہ خوشی سے چومتی بالوں پر ہاتھ پھیرتی وہ دعائیں دیے جا رہی تھیں اور شیرف کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ زندگی کی یہ انہونی بہت اچانک تھی لو دل تو۔۔۔ وہ تو ابھی تک سنبھلا بھی

نہیں تھا مگر شیرف قیصر کا دل واقعی شیرف قیصر کا ہی تھا۔ وہ سب بھول گیا کہ کیا کیا تھا زمرد نے۔ یاد رہا تو بس اتنا کہ اس کی شادی اب کسی سے بھی ہو سکتی ہے "واسطے زمرد کے۔ بے رخی' بے اعتنائی اور انکار' خوف اور رجان چھوٹ جانے کا غم... سب دھواں بن کر غائب ہو گیا تھا۔ یہ دل کو ہوا کیا تھا۔ اس نے غور کیا تو... گلابی آنکھیں' ہمرول چہرہ' ہر جگہ تھا۔ دل زمرد کے نام کے راگ الاپے جا رہا تھا۔ ابا جان ہمیشہ کی طرح اس کی طرف کڑی نگرانی تھا۔ نظروں سے رکھتے چل رہے تھے نماز کے لیے۔ اب اماں جی کہہ رہی تھیں۔

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے ملک قیصر دین کے دل میں یہ خیال ڈالا۔ سوچتی تھی کب میرا بیٹا دولہا بنے گا' گھوڑی چڑھے گا مگر میرے مولا تیرا لاکھ لاکھ شکر کہ تو نے مرنے سے پہلے ہی یہ دن دیکھنا مجھے نصیب کر دیا۔" ماں جی اپنے پورے وجود سمیت اس پر واری صدقے جا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

آنا" فانا" سب کچھ طے ہو گیا تھا' وہ بس گم تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ اس کی زندگی میں آج کل کیا ہو رہا تھا۔

دل خاموش تھا' زبان چپ تھی۔ ایسا لگتا تھا اداسی ہی اداسی ہے چاروں طرف۔ حالانکہ شادی کے گھر جیسا ہی ماحول بنا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اکلوتے بیٹے کے لاڈ صرف ماں جی ہی نہیں ابا جان بھی اٹھانے لگے تھے۔ وہ حیران ضرور ہوتا۔ مگر فی الحال دل کی حیرانی ہی بہت تھی۔

بادام' پستے اور کاجو سے بھرا دودھ کا گلاس خود لائے تھے اس کے لیے۔

"ارے بھئی' کچھ آرام کر لو' جاؤ اپنے کمرے میں۔ شاباش۔" یہ ابا جان تھے۔

اس کے تو دل کا عالم ہی جدا تھا۔ ہر چیز اداس تھی۔ اس کے کمرے میں رکھا گلدان اداس تھا۔

اسے اپنی ہونے والی دلہن میں بھی کوئی دلچسپی نہ ہو سکی۔ اماں نے ایک بار اس کا موڈ خراب دیکھ کر اسے دلہن کی تصویر دکھانے کی کوشش بھی کی مگر وہ جھنجلا گیا۔ گلابی آنکھیں' ہمرول چہرہ خیالوں پر چھا گیا۔ رمضان گزرنے لگے۔ کارڈز تقسیم ہونے شروع ہو گئے تھے۔

کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ جا کر ابا جان سے کہے۔ "نہیں کرنی مجھے یہ شادی۔" مگر اتنی مجال نہ تھی۔ ابال اٹھتا اور جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔

مٹھائیاں' تحفے اور اب شہنائیاں بھی بجنے ہی والی تھیں کچھ دنوں بعد۔ اب اداسی کے ساتھ ساتھ وہ غم اور بے بسی کی واقعتاً" عملی تصویر بن گیا تھا۔ اسے اپنی دکان تو باہر جانا بالکل بند ہو گیا اور وہ چوبارے پر سیڑھیوں کے گھر کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ لیتا۔ چاند نظر آ گیا تھا۔

"ارے میرے بیٹے... دیکھ تو چاند نکل آیا ہے۔ عید ہو گی کل اور پھر میرے بچے کے سر پر سہرا بندھے گا۔"

پہلی خوش خبری تک ٹھیک تھا۔ دل کو سنبھالتا وہ مسجد جا بیٹھا تھا۔ مگر دوسری خوش خبری اسے جلا کر راکھ کر گئی۔

☼ ☼ ☼

عید کے دن کی رونقوں کو سمیٹے سورج صاحب جلوہ افروز تھے۔ وہ باہر نکل آیا۔

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔" وہ خود کو بہلاتا عید کی سویاں کھانے لگا تھا کہ لاؤنج میں اسے "وہ" آتے دکھائی دیے۔ زیب اور واسطہ اور لانے والے مجرم ابا جان۔

"بس آپ نے معاف کر دیا۔ عید کے دن اس سے بڑھ کر خوشی اور عیدی کوئی نہیں۔" یہ راؤ تھا جس نے شاید ہی اپنی غلطی مانی ہو۔

"تم نے اپنی غلطی مان لی' یہی بہت ہے بیٹا۔" اسے آج وہ ٹھیک ٹھاک غش کھا جاتے ہیں۔

"تو وہ دربار سنوار او دوست۔ جاؤ بھئی دل اداس ہے بھئی

عید۔" اباجان کی نظر اس پہ پڑی تھی۔

"عید مبارک یار اور اب شادی بھی۔" دونوں ہی "فورا" فورا" اس سے گلے ملے تھے۔ لیکن وہ بھس کھڑا رہا تھا۔

"جاؤ انہیں اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ سجاوٹ وغیرہ کریں گے اور تم لوگ اچھی طرح دیکھ لو۔ جو بھی سامان وغیرہ منگوانا ہو بتا دینا میں پیسے دے دوں گا۔ بھئی ایسے موقع پر دوست ہی دیکھتے ہیں سب۔" فیاضی کا اظہار۔۔۔ وہ جو ابھی عید کی سویاں کھا کر بیٹھا تھا۔ منہ کڑوا ہونے لگا۔

"اباجان کہیں بھول تو نہیں گئے۔ یہ دونوں وہی ہیں نابنجار' نالائق اور بھی بہت سی تہذیب وار گالیوں والے۔" اب کے شیرف نے "فورا" فورا" دونوں کو دیکھا ۔۔۔ وہ واقعی وہی تھے۔ زیب اور داور۔۔۔ وہ سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھا کہ کہیں گر نہ جائے۔

"تم سے تو اتنا نہ ہوا کہ اطلاع کر دیتے۔ وہ تو ہمیں جیسے ہی پتا لگا "فورا" آ کر آ گئے۔ اب تمہاری طرح کی بے مروتی تو نہیں ہم میں۔" زیب کی خفگی بھری آواز آئی۔

"لیکن ایک بات ہے۔ واقعی خوش قسمت ہے تو۔۔۔ تیرے ابا کو بہت برا ہے۔ شادی کروا رہے ہیں تیری۔۔۔ ورنہ یہاں تو کہا جاتا ہے کہ کیریئر بناؤ' سیٹ ہو جاؤ' پھر شادی وادی کا خیال دل میں لانا۔ وہ بھی فقط خیال ۔" ۔۔۔ مرجھکتا شادی کے لفظ پر زور دیتا اور ہمیشہ کی طرح اس کی خوش قسمتی پر رشک کر رہا تھا۔

"تمہیں تو کوئی پرابلم ہی نہیں ہوئی اور لائف سیٹ ہو جائے گی تمہاری۔ زبردست یار!" شیرف نے کھا جانے والی نظروں سے دونوں کو دیکھا۔ یہ وہی تو تھے اسے ورغلانے والے۔ اب آ گئے تھے۔ جلتی پر تیل چھڑکنے۔

"میری زندگی کو عذاب بنا کر چھپا چھوڑ دیں تمہیں بیٹے نہیں جتنا تم سے دور بھاگتا ہوں' اتنا ہی میری جان کو آ رہے ہو تم دونوں۔۔۔ اللہ کا واسطہ ہے مجھے اپنی زندگی جینے دو۔" آخر میں باقاعدہ ہاتھ ہی جوڑ ڈالے تھے اس نے۔ لیکن اتنی بات کے جواب میں وہ دونوں بالکل ہی خاموش کھڑے تھے۔ ان کے انداز پر اس نے چند سیکنڈز بعد غور کیا تو اچنبھے سے دونوں کو دیکھا۔ زیب لاپروائی سے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا اور داور تنقیدی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔

"چلو شکر ہے چپ تو ہوئے تم۔" داور نے کلمہ شکر پڑھا۔ "کیا لڑکیوں کی طرح ری ایکٹ کر رہے تھے۔ تم پر یہ سوٹ نہیں کرتا۔" ہمیشہ کی طرح اس کی برسنالٹی پر فدا داور نے کہا تھا۔

"لڑکیوں کی طرح۔" شیرف طیش میں آ گیا۔

"یار! اب بس کر غصہ تھوک دے ہم جانتے ہیں کہ تیرے ساتھ بہت برا ہو رہا ہے۔ مگر ایک پریکٹیکل لائف بھی تو صحیح نام شروع ہو جائے گی تیری۔ یہ بھی تو دیکھ!" زیب نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"برا ہو رہا ہے میرے ساتھ کیا مطلب؟" وہ پوری طرح حیران اور دل میں پریشان زیب کو دیکھنے لگا۔

"صرف محبت میں ہی نہیں دوستی میں بھی دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ مگر تجھے تیری محبت نہیں ملی۔ اس میں کہیں نہ کہیں جانے انجانے میں ہم نے تیرے ساتھ برا کر دیا ہے۔"

شیرف کی آنکھیں بے تحاشا کھل گئیں۔

"نہ ہم تجھے اس لڑکی کی طرف مائل کرتے اور نہ ہی تجھے اس لڑکی سے محبت ہوتی۔" اب کے داور کے انکشاف الفاظ نے اس کے سر پر دھماکا کر دیا۔ وہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔

"مہربانی اس بات کی بھی تجھ سے بہت معذرت یار۔۔۔ ہم واقعی بہت شرمندہ ہیں۔ مگر تیری نئی زندگی کی خوشی کو اس طرح تیرے لیے اداس نہیں بنائیں گے۔ تو خوشی خوشی زندگی شروع کر۔۔۔ سب ان شاء اللہ اچھا ہی ہو گا۔"

داور کے وہ تاب کلمات قیامت کی نشانی سے زیادہ قیامت ہو جانے کا باعث رہے تھے۔ وہ حق دق کھڑا تھا۔ اتنی راز کی بات کر دی۔ محبت میں مبتلا ہو گیا۔ جب یہ

تو وہ خود سے بھی چھپانا چاہ رہا تھا۔ حالانکہ وہ ان سے اس دن کے بعد سے ایک بار بھی نہیں ملا تھا۔ حیرت بھی اپنی جگہ اور زخم کے تازہ ہو جانے کا غم بھی اپنی جگہ۔

"چل یار! اب چلتے ہیں اس کا کمرہ سجاتے ہیں۔" زیب نے داور کو اپنے ساتھ لیا اور اس کے کمرے کی جانب چل پڑا اور وہ کسی بت کی طرح وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"آہا۔ ہاہا۔" دل کی تمام آرزوئیں پوری ہوئی تھیں۔ کیوں نہ ہوتیں۔ آخر دولہا کے ابا جان تھے۔ اک تفاخر' اک خوشی' اک مان۔ ان سب نے انہیں خوش کر دیا تھا۔

"بیٹے کے سر پہ سہرا سجے گا' بیٹا ہمارا دولہا بنے گا۔" آئینے کے سامنے گنگناتے وہ کوئی اور نہیں۔ ملک قیصروین تھے۔

مگر ذرا کیسے ذرا رکیے' تھوڑا سا ماضی میں چلتے ہیں۔ جب یاسر چغتائی صاحب ٹکرائے تھے اور اپنا مسئلہ ان کے حضور پیش کیا تھا۔ مسئلہ تو سارا دکان کا تھا۔ وہ بڑے کاروباری سوچ کے آدمی تھے۔ اپنی اک پہچان لیے وہ کاروبار میں بہت کھرے تھے۔ یہی بات یاسر چغتائی کو ان تک کھینچ لائی تھی۔ یاسر چغتائی کی کپڑوں کی بہت بڑی دکان تھی۔ وہ بھی ملک قیصروین کی طرح ہی کاروباری شخصیت رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ خاصے ہوشیار ہیں اور ان کی دکان اچھی خاصی چلتی ہے۔ لیکن ان کی اس سمجھ کو دھچکا تب لگا جب ان کی دکان کے بالکل سامنے ایک نئی دکان کھل گئی ان ہی کے جیسے مال کو کم داموں فروخت کرنے سے ان کی دکان کے گاہک پلٹ گئے تھے۔ بہت زبردست نقصان پہنچا۔ دکان کی ساکھ کو۔ کوئی بھی حل نہ نکل سکا تو وہ ملک قیصروین کے پاس آگئے اپنا مسئلہ لے کر۔ ملک قیصروین خود بھی خاصے حیران ہوئے اس بات پر کہ وہ یاسر چغتائی کی مدد کرنے پر راضی ہوگئے۔ انہوں نے

اسے یاسر چغتائی کی خوش نصیبی قرار دیا۔

لیکن اس سارے عمل کے دوران بھی اپنے اکلوتے سپوت اور بقول خود کو نانجار شریف قیصر نگاہ رکھی اور تب انہیں محسوس ہوا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے اور اس کا اندازہ انہیں اس وقت ہوا جب ۔۔۔ وہ تو بالکل ٹھیک نائم سحری پر پہنچا تھا لیٹ ہوا پہلا شک جب انہوں نے اس کے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر طنزیہ اس کے لیٹ ہونے کا جتلایا تو اس کے "اٹھا ہوا" کہنے پر۔ دوسرا شک۔ کہ وہ تو اس کے سونے جاگنے تائم تک بنا چکے تھے۔ پھر اس وقت اٹھا ہوا ہونے کا مطلب۔

تیسرے شک کی گنجائش باقی تو نہیں بچتی تھی۔ مگر انہوں نے نکال لی۔ اور اس کے کمرے کا تفصیلی پوسٹ مارٹم کیا اور بیڈ کے نیچے اوندھی پڑی وہ ٹوکری جس کے اندر موجود گولے گولے نما کاغذ فٹ بال کی طرح بکھرے پڑے تھے انہیں اٹھایا' دیکھا اور۔۔۔ وہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھٹی کی پھٹی ہی رہ گئیں۔

وہ از حد حیران و پریشان ہوئے۔ اب تک انہوں نے پوری طرح سے شریف کو ہر طرح کی برائیوں اور خرافاتوں سے دور رکھا تھا۔ مگر اس عمر میں آکر وہ اس طرح کی کوئی حرکت کر بیٹھے گا انہیں گمان تک بھی نہ گزرا تھا۔ وہ کچھ کچھ تو جان گئے تھے کہ بیٹے کے تیور اور رنگ کچھ کم صم انداز۔۔۔ چہرے پر کبھی جوش تو کبھی بے بسی۔۔۔ لیکن۔۔۔

وہ خشمگیں نگاہوں سے "معزز و محترم مس زمرد" کو دیکھ رہے اور سوچ رہے تھے کہ جب لکھنے کی جرات کر ہی لی تو پھر یقینا" اسے بھیج بھی رہا ہوگا۔ تب ہی ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

انہوں نے بے حد بے یقینی سے دوبارہ پڑھا۔

"معزز و محترم مس زمرد!"

"زمرد۔" وہ اس منفرد نام کو کیسے بھول سکتے تھے کہ نام کے ساتھ شخصیت بھی قطعا" مختلف تھی۔۔۔

انہوں نے ذہن پر زور ڈالا تو یاد آیا کہ وہ جب یاسر چغتائی کے گھر گئے تھے تو اس سرسری سی ملاقات میں

بلکہ سرسری سا تعارف بھی ان کی فیملی سے ہوا تھا۔ کسی حد تک تو وہ واقف ہی تھے کہ بیٹی ہے ایک اور بیوی کا انتقال تو اس محلے میں آنے کے بعد ہوا تھا۔ ایک اور شخصیت آج کل ان کے گھر میں اور گھر سے باہر بھی گھوم رہی تھی۔ کافی سے زیادہ نڈر، بے باک اور ولیر۔

زرد کرتے اور سیاہ جینز میں الٹی کیپ کے ساتھ بے حد جلدی میں یاسر چغتائی کو چند کتابیں تھمائی گھر کی سیڑھیاں چڑھ گئی اور یاسر چغتائی "زمرو ذرا بات تو سنو۔" ہی کہتے رہ گئے۔

"وہ اس عجیب سی قدرے بے چین فطرت لڑکی کو دیکھے گئے" ایسے پہناوے اور یاسر چغتائی کے روکنے کے باوجود ان سنی کر کے چلے جانے کو ان کی زیرک نگاہوں نے کافی باریکی سے دیکھا تھا۔

اور ستم ظریفی۔ ان کے ناہنجار 'نالائق بیٹے کی پسند ان کے بے حد درست خیالات کے مطابق وہی لڑکی تھی۔

"پسند بھی کیا تو کسے۔ تمہیں تو وہیں لے جا کر ماروں' جہاں پانی بھی نہ ملے شیرف برخوردار۔" اسے تصور کر کے نیچے دانتوں تلے دبایا۔ بچت تھی شیرف قیصر کی کہ یہ سب اس کے روبرو نہ ہو رہا تھا۔

"اب کیا ہو گا' اب کیا کروں۔" وہ بے قراری سے اٹھے اور ٹہلنے لگے۔ سوچوں کے گھوڑے دوڑائے۔ کئی ایک کی لگام میں پکڑیں' مگر نتیجہ صفر۔ اور حیرت انگیز طور پر ان کے پھوٹے دماغ میں زرخیز آئیڈیا آگیا۔

زمرو کے نام خط۔ شیرف قیصر کی طرف سے۔

ایک لفافے کے اندر چند تصاویر ہوشربا سی۔ آنکھیں بند کر کے ڈالیں۔ لیکن اس کے بعد ایک عجیب سی نئی فکر نے ان کو گھیرا۔ زمرو کے بعد زمرو نہ سہی کوئی اور سہی۔ اب زمرو کی طرح ہر کوئی تو ان کے بیٹے سے منہ پھیرنے سے رہا۔ پرسنالٹی' تعلیم' حیثیت' ہر بات میں پرفیکٹ تھا وہ۔ پھر کیا کیا جائے۔ یہ بھی مسئلہ بڑا۔ اور اس گمبھیر مسئلے کا حل اس دن پورا ہوا جب وہ یاسر چغتائی کے گھر باعزت طریقے سے لاؤنج میں براجمان تھے۔

"بات اب یوں ہے یاسر' تمہارا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔" افطار کے بعد' بعد نماز مغرب وہ چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے تو یاسر چغتائی کھل کھل گئے۔

"جلدی بتائیے!" لہجہ بے صبرا پن تھا۔

"بتا رہا ہوں۔ تم ذرا وہ کباب تو منگوالو جو میں نماز قضا ہونے کے ڈر سے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بھئی بڑے لذیذ تھے وہ۔" اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ یاسر چغتائی نے حکم کی تعمیل تو کرنی تھی۔ سو کباب ہوئے حاضر اور ساتھ ہی مس زمرو بھی۔

ملک قیصروین کی چمکتی آنکھیں کبابوں کی ٹرے سے ہوتی لانے والی پر بھی پڑیں تو چونک گئے۔ پاؤں تک چھوتے خوب صورت کھلتے نیلے رنگ کے فراک پر نماز کے اسٹائل میں باندھا گیا دوپٹا۔ وہ تو پلک جھپکنا ہی بھول گئے تھے۔

"کیا بات ہے۔ آج تو خالصتاً" پاکستانی ڈریس پہن رکھا ہے۔" منہ پہ نہ سہی دل ہی دل میں تو کہہ ہی گئے اور ان کے سامنے ٹرے رکھتی وہ پل بھر رکی۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا انکل!" زمرو نے بے حد سنجیدگی سے ان سے پوچھا تو وہ حیران رہ گئے۔

"نہیں تو۔"

"اچھا مجھے ایسا لگا۔" وہ بڑبڑائی۔

اور وہ نہ جانے کیوں اسے دیکھتے چلے گئے۔ جو چائے کپوں میں نکالتی ان کی غور کرتی نگاہوں کے سامنے تھی۔

"یہ میری بھانجی ہے زمرو۔ یورپ میں پلی بڑھی ہے۔ پاکستان آنے کا شوق تھا اسے جبھی پھر یہاں آئی تو باقاعدہ رہنے کا ہی فیصلہ کر لیا۔ ماں باپ بھی اس کے اب اسلام آباد سیٹل ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کی کئی ذمہ داری مجھ پر ہی چھوڑ رکھی ہے۔ یہاں تک کہ شادی کی بھی۔" یاسر چغتائی نے زمرو کا مکمل تعارف کرواتے آخر میں خوامخواہ گردن اکڑائی۔

"آج کل لڑکے' تو کیا لڑکیاں تک اپنی پسند سے

شادی کرتی ہیں۔۔۔ماں باپ والا رواج تو ختم ہی ہونے لگا ہے۔"

انہوں نے تھوڑا سا طنز مارا اور کچھ گردن کا کلف بھی ختم کرنا چاہا تھا یاسر چغتائی کا۔

"بالکل نہیں انکل۔" غیر متوقع طور پر زمرو نے ان سے کہا۔ وہ چونکے۔

"یورپ میں پیدا ہوئی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر فیصلے ــ کا حق بھی مجھے ہی ہے۔ میں نے تو سبجیکٹ تک اپنی اما' بابا کی پسند سے لیے ہیں۔ اب اگر شادی کی ذمہ داری ماسوں جان کو دی ہے تو یہ فیصلہ پھر انہی کو ہی کرنا ہے۔" مطمئن انداز میں کہتی وہ ان کا اطمینان غرق کر گئی۔

"کچھ فیصلوں کا حق خالصتاً" ماں باپ کا ہی ہوتا ہے ہمیں ماں لینے میں کوئی حرج نہیں۔ بہرحال آپ یہ چائے اور کباب لیجئے۔ کچھ اور لیں گے آپ۔" مکمل سنجیدگی اور بڑے احترام طریقے سے انہیں دیکھتی وہ پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔" میکانکی انداز میں کسی روبوٹ کی طرح ان کا سر نفی میں ہلا تھا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتی چلی گئی۔

"ہاں بھئی اب بتاؤ کیا حل نکالا رکن کا۔" چائے کا کپ اٹھاتے یاسر چغتائی نے انہیں پکارا۔ "دکان کا مسئلہ تو بہت ہی سادہ اور آسان ہے۔ وہ اگر کم داموں سامان فروخت کر رہا ہے تو تم بے شک اپنا مال اسی داموں فروخت کرو لیکن ان کے ساتھ ساتھ ایسی چیزیں جو معیار میں زیادہ اور قیمت میں کم مگر کارآمد ہوں انہیں مفت ساتھ دو سامان کے۔۔۔۔" ہمہ تن گوش بنتے یاسر چغتائی کے ماتھے پر سوچ کا جال سا تھا۔

یقیناً" وہ ایسی ممکنہ چیزوں پر غور کر رہے تھے جن کے مفت ساتھ دے دینے سے ان کے جمع ہوتے مال میں فرق نہیں پڑتا۔ اور پھر ہر طرح کے جوڑ توڑ کے بعد جب دو اور دو چار کے بجائے پانچ بننے لگے تو ان کا منہ ہی کھل گیا۔

"واہ۔۔۔ واہ بھئی واہ شاندار۔۔۔" چند ہی لمحوں بعد وہ تقریباً" چیخ اٹھے "جواب نہیں اتنا بہت ہی اعلا۔۔۔" وہ خوش تھے بے حد ہی خوش۔۔۔

"میرا تو دل کر رہا ہے ملک قیصر دین! کہ جس قدر شاندار حل تم نے پیش کر کے میرے دل کی مراد پوری کردی ہے اس کے بعد تمہارے دل کی بھی کوئی مراد ہو تو ابھی کے ابھی۔۔۔ جو کہ میرے بس میں ہو تو پوری کردوں۔" انہوں نے جوش و خروش سے دونوں ہاتھ لہرائے۔

"کہنے کی بات ہے بس۔" یہ اطمینان اور اوپر سے شکوہ۔۔۔

"کیا کہہ رہے ہو تم کہو اور میں تمہیں نامراد لوٹاؤں تو پھر تف ہے دوستی پر۔" جذباتیت کا حملہ کامیاب رہا۔ وہ جوش سے بھڑک اٹھے۔

"اچھا تو سنو پھر میرے دل کی مراد۔" انہوں نے اپنے دل کی مراد یاسر چغتائی کو بتا دی۔

پھر جو ان کا منہ کھلا تو پھر مٹھائی سے ہی بند ہوا۔

جی ہاں! ملک قیصر دین نے محترم یاسر چغتائی سے زمرو کا ہاتھ مانگ لیا اپنے ناہنجار بیٹے شیرف قیصر کے لیے۔

شیرف قیصر کی شرافت اور پرسنالٹی میں کوئی خامی نہ دکھتی تھی اور انہیں شروع سے ہی وہ فرماں بردار لڑکا بے حد پسند تھا۔ سو انہوں نے ازحد خوشی محسوس کرتے ہوئے سوچنے کی بھی مہلت نہ مانگی اور قبول کرلیا یہ رشتہ۔

یہ تھا فلیش بیک۔

اب ــ ایک کام باقی تھا جس کا ہونا ازحد ضروری تھا اور جو کچھ ہی گھنٹوں بعد وقوع پذیر ہونے والا تھا۔۔۔!

☼ ☼ ☼

وہ جو اللہ کی رضا میں راضی ہوا تو پھر ہر دھڑکا دور ہوتا گیا۔ باوجود ایک خلش کے جو محبت کی صورت دل کی ہر دھڑکن کی نوک پر برقرار تھی۔ مگر اس کا کیا حل تھا اور اوپر سے واور اور زیب۔۔۔ سرخ گلابوں سے کمرا سجایا تھی کہ گنہگار کو بھی اس خوبصورتی سے سیٹ کیا۔

وہ ننھی ننھی بتیوں اور قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔

بارات سنار تھی اور ملکے کافی کلر کی کڑھائی اور ڈارک کافی شیروانی زیب تن کر کے میرون کلاہ میں اس کی شخصیت رات کی اندھیرے میں ابر مووی کیمروں کی روشنی میں جگمگا گئی تھی۔ ماں جی کی بلائیں... ہمیشہ کی طرح کروفر سے کھڑے اکڑتے ہوئے ملک قیصر دین

—

ملک قیصر دین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ذرا سا چونکا۔ خوشی تو کھلی پڑی تھی ان کے چہرے پہ۔

"اور میری خوشی۔" اک ذرا بھر سوچ اور اس پر ذرا بھر حسرت و دکھ... کچھ تھا جو جھلملانے لگا تھا آنکھوں میں۔

"کیا ہوا بھئی۔" یہ نرم لہجہ اس کے باپ کا تھا۔

"میرے بیٹے! آج تک کبھی تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا تو اب بھی نہیں کروں گا۔ چلو اب سب منتظر ہیں تمہارے۔"

اک ٹرانس کی کیفیت میں وہ ان کے ساتھ چلا۔ جگمگاتی رنگ برنگے قمقموں سے سجی 'بے حد خوب صورت سفید گھوڑوں سے سجی بگھی اس کی منتظر تھی۔ اس کے قدم اٹھے تو ساتھ اک ڈھارس بھی تھی جو باپ کی جانب سے اسے ملی تھی۔ دل کی تقویت کا خانہ کچھ بھر اٹھا تھا۔

"چلو آج میں نہ سہی مگر میری وجہ سے میرے ماں اور باپ تو خوش ہیں۔ باپ بھی جو شاید ہی کبھی مسکرایا ہو۔ آج ان کی خوشی کا عالم ہی جدا ہے... چلو پھر میرے رب کی مرضی یوں ہے تو یوں ہی سہی...." نگاہ چمکتے چہروں پر ڈال کر پھیر لی۔ پٹاخوں کی مختلف آوازیں اپنے پورے شور کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ تھیں بگھی رکی تو وہ بھی اترا۔

زبردست گونج کے ساتھ میوزک شروع ہوا پھر بینڈ باجے کے ساتھ ہی بھنگڑے 'ڈانس شروع ہو گئے۔ سب... آگے دولہا کے دوست... زیب اور داور... [illegible] کی طرح آگے آگے... جلتی پر تیل چھڑکنے اس کے یہ دوست اپنے دوست کی خوشی بھرپور انداز میں منا رہے تھے۔ انہیں ناچتے دیکھ کر صحیح معنوں میں جلا تھا۔ نیر [illegible]

"خبیث۔" زیر لب بڑبڑایا پھر اپنی پوزیشن کا خیال کرتے منہ کے بگڑے زاویے بہتر کیے۔ پھر اس کی نگاہوں نے ایک منظر خاص دیکھا۔ یاسر چغتائی اور والد محترم باقاعدہ بغل گیر ہو رہے تھے خوشی دونوں کے چہروں پر پھوٹ رہی تھی۔

"یہ کیسا معجزہ ہے۔" آنکھیں اٹھائیں مگر منظر وہی رہا۔

"آؤ بیٹے آؤ۔" یاسر چغتائی آگے بڑھے۔

وہ ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھ رہا تھا۔ تب ہی اک خیال اس کے دل میں آیا۔

"تو کیا میری شادی باذغم سے ہو رہی ہے۔" دل کو ڈالو نا یہ خیال۔

"اے اللہ! یہ میرے ساتھ کیا کیا۔" اس کے دل سے فریاد نکلی۔

"یار تیری شکل پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں۔ ٹھیک کر شکل۔" یہ داور تھا جو اسے ذہنا سرگوشی کر رہا تھا۔

"چلو بھئی مولوی صاحب آگئے ہیں ذرا جگہ دو انہیں۔" چغتائی صاحب کے آنے پر وہ خاموش رہ گیا۔ زیب نے جگہ خالی کی۔ نکاح شروع ہوا۔

"مجھے کیا پتا کہ زمرد کا یاسر چغتائی صاحب سے کیا رشتہ ہے۔ میں نے تو اسے بس ان کے گھر سے نکلتے اور جاتے اور کھڑے ہی دیکھا ہے۔ یہ لوگ کہیں انوالو تو نہیں یہاں... ہاں شاید ایسا ہی ہو مگر زمرد..." رفتہ رفتہ سلگتا اس کا دل جڑ سے مچل اٹھا۔

"یہ نام... میرے ذہن و دل سے نکل کیوں نہیں جاتا۔" فقط نام آنے سے اس کا تصور اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے ذہن کے پردے پر روشن ہو جاتا۔ جسے دیکھ کر بے قراری حد سے بڑھنے لگی "یا تو میرے رب! اس کا تصور ذہن سے کھرچ دے یا پھر اسے میرا نصیب کر دے۔" انجانے میں ہی کیا مانگ لیا تھا اس کے کرلاتے دل نے سو خود بھی نہیں جانتا تھا۔

مگر یہ حد سے بڑھی بے قراری تھی جس نے بے

خودی کی لے برا سے اپنے رب سے مانگ لیا تھا۔

"یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ وہ مجھے کہاں سے مل سکتی ہے۔ وہ بھی ایسے وقت پر جب کسی اور کا نام میرے نام کے ساتھ جڑنے والا ہے اف۔" بے ساختہ ہی اس نے سر پکڑ لیا تھا۔

"ارے۔ قبول ہے قبول ہے کہنے کو کہا ہے سر پکڑنے کو نہیں۔" داور کی چہکتی آواز اسے اپنے حواسوں میں لے آئی۔

"ویسے تو ایسے وقت پر سر کو پکڑنا اور قبول کرنا ایک ہی بات ہے لیکن پھر بھی قبول ہے بول دو ورنہ نکاح نہیں ہو گا۔" زیب بھی چہکا۔

"شیرف۔!"

"قبول ہے قبول ہے قبول ہے۔" ابا جان کی پرجلال آواز پر وہ رٹے طوطے کی طرح بول پڑا۔

کہیں سے ہنسی کی آواز آئی۔

کوئی منہ دبا کے ہنسا۔

کسی کو گلے ملنا یاد آیا کسی کو مبارک باد کا سلسلہ شروع کرنے کا خیال آیا مگر وہ..... کوئی اس کا ہو گیا تھا لمحے بھر میں۔ وہ کسی کا ہو گیا تھا بس ایک پل میں۔ اب کسی کا خیال..... کسی کا ذکر اب سب ممنوع ہو گیا تھا۔

ملک قیصر دین ہر سو نعرے پر شیرف کے شانہ بشانہ کھڑے تھے جیسے خود اپنی شادی کی یاد کو تازہ کر رہے تھے۔

لیکن ہر طرح سے محظوظ ہوتے ہوئے بھی ان کی نگاہ اپنے اکلوتے چشم و چراغ کے چہرے کے تاثرات پر بھی اور مزے کی بات تو یہ تھی کہ وہ اس کے چہرے کے بنتے بگڑتے ہر زاویے اور پس منظر کو جانتے بھی تھے لیکن انہوں نے آگے بڑھ کر تسلی تو کیا اک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جس سے شیرف کے دل میں کوئی خوشی ہنسی ہی جنم لیتی۔ وہ بس محظوظ ہو رہے تھے ہاں مگر اس کے نکاح کے وقت سر پکڑنے پر ان کا دل لرز اٹھا تھا۔

ان کے ہاں دولہا اور دلہن کو ایک ساتھ بٹھانے کا رواج نہیں تھا سو کسی نے کہا کہ اب رخصتی ہو جانی چاہیے۔ اور پھر ہر آواز رخصتی کے شور و غل میں دب گئی۔

☼ ☼ ☼

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا۔

ادب سے متعلق بے ادب شیرف قیصر کو کمرے میں قدم رکھتے خاصا معقول شعر یاد آیا تھا۔ اس کے احساسات پر پورا اترتا۔ یعنی اب میں اس کے ہجر میں شاعر بن بیٹھوں گا۔ خاصی بے جا تشویش بھی۔

دھیمے قدموں سے آگے بڑھتے اس نے کلاہ اتارا ساتھ گلے میں پہنا ہار بھی اور صوفے پر رکھ دیا پھر صوفے پر بیٹھ کر گھٹنوں سے پاؤں کو نجات دلائی اور اوپر دیکھتے ہوئے ٹھٹکا۔ اس کے ٹھٹکنے کی وجہ سامنے بیٹھا وجود تھا۔

اس کے بالکل سامنے "وہ" تھی۔

وہ جس کا تصور ہر لمحے اس کے ساتھ ساتھ ہی رہا تھا۔ سر جھٹکنے پر بھی دل کے ہنسنے اور رونے پر بھی۔

کیا واقعی یہ وہی ہستی تھی۔

وہ سیدھا ہوا جھٹکے سے غور کیا۔ یہ جھلمل ہلکی پھر کے لگا یہ غلط فہمی ہے یا خوش فہمی کی انتہا۔ خود سے پوچھا مگر جواب ندارد۔

یقیناً "صدمے و دکھ سے دماغ چل چکا ہے میرا۔ سر جھٹکتے نگاہ پھیرنی چاہی مگر کیسے پھیرتا۔ روشنی کمرے کی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ اس کا سجا سنورا وجود سامنے تھا۔

"کیا ہوا۔؟" سریلی آواز کمرے میں گونجی۔

وہ سب کچھ بھول بھال کر جھٹکے سے کھڑا ہوا۔

"تم۔ تم یہاں....."

"تو۔ شادی تم سے ہوئی ہے تو تمہارے ہی پاس ہوں گی ناں۔" تمہارے انداز میں کچھ نرمی تھی۔

"شادی..... مجھ سے..... میرے پاس..... تم۔" وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ مگر ایسا پاگل بھی نہیں تھا جو اس خوبصورت و رومانوی ماحول میں خود ہی غائب ہو جاتا لیکن یقین کیسے آتا۔

"اسے چھو کر دیکھو..... وہ مجسم تمہارے سامنے ہے

صرف تمہاری۔" ژودل کی مانند اس کی طرف بڑھا اور جیسے ہی اس کے ہاتھوں نے اس کے شانے چھوئے۔ شہرزف کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

"زمرد... تم... تم مجھے مل گئیں او گاڈ..." والہانہ پن... شدت... وارفتگی... سب کچھ تھا اس کے لہجے میں۔ زمرد بس دیکھے گئی اور وہ اپنی دھن میں پاگل ہونے کو تھا۔

"یہ کیسے ہو گیا..." وہ پھر بے یقین ہوا۔

"زمرد! تم میری آخری لمحوں میں مانگی گئی دعا کا ثمر ہو۔ تم مجھے مل گئی ہو۔ تم تو مجھے آب حیات بن کر ملی ہو زمرد!" خوشی بے قابو ہوئی۔ لفظ بھولنے لگے تو آنکھوں میں نمی محبت بن کر چمکنے لگی۔

اور اس محبت بھری پذیرائی پر زمرد کھونے لگی۔ وہ واقعی کہیں کھو سی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یار! واقعی حیران کن ہو تم کہاں تو کہتی تھیں کہ ذرا کسی نے فلرٹ کرنے کی کوشش کی محبت کے اظہار کا ارادہ کیا اسے گنجا کر دوں گی اور... اور ہوا کیا۔ ایک ہی خط پڑھ کر چاروں شانے چت۔"

نکاح سے کچھ دیر پہلے دلہن بنی زمرد کا لہنگا سیٹ کرتی ماہ نم نے اسے چڑایا تو وہ بجائے چڑنے کے فقط مسکرانے لگی۔

"محبت... مائی ڈیئر! فقط محبت۔" اس نے جیسے ہر سوال کا جواب دیا تھا پوری ترنگ کے ساتھ۔

"لیکن فقط ایک ہی لو لیٹر پر یوں گر جاؤ گی میں نے سوچا نہیں تھا ویسے۔" ماہ نم ابھی بھی شوخ ہو رہی تھی۔

"لو لیٹر... ایسا لو لیٹر جس میں سب کچھ تھا۔ احترام، خیال، مہذب الفاظ مگر صاف لفظوں، معنوں میں کہیں نہیں تھا۔" ماہ نم بے ساختہ ہنسی تھی۔ خط اس نے بھی پڑھا تھا۔

"... وہ ... سے بھی لو لیٹر نہیں تھا۔

... محبت کہاں سے آئی اور باقی ... سے مل

میں..." بہت مرتبہ کا دہرایا یہ جملہ جسے ہمیشہ اس نے مسکراہٹ سے ہوا میں اڑا دیا تھا مگر اس وقت اسے کہنا تھا۔

"یار محبت واقعی لمحوں کا کھیل ہے... کبھی یہ بغیر سوچے سمجھے بغیر آہٹ کے دل میں تو کبھی وقتی صورت اثر کر اثر کرتی ہے... دونوں ہی باتوں میں محبت اک لمحے میں وارد ہو جاتی ہے۔ کبھی دل اس پل جکڑ جاتا ہے، کبھی رفتہ رفتہ محبت اثر انگیز ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پہلے میں اس سے متنفر ہوئی تھی کہ ان فوٹو گرافس نے دماغ ہی الٹا کر رکھ دیا تھا لیکن جب میں نے اسے حد درجہ سنائیں غصے سے اور میرے بھرپور غصے پر بھی وہ مجھے کہنا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے پر مجھے یقین نہ ہوا۔ لیکن جب اس کا خط مجھے ملا وہیں پڑا ہوا۔ پڑھ کر مجھے سخت تعجب ہوا بلکہ کسی حد تک بدمزہ بھی ہوئی تھی... "بے حد معزز و محترم مس زمرد" سے شروع ہوتا وہ خط پورا کا پورا احترام بھرے لفظوں سے بھرا تھا۔ آئی لو یو تو کوئی بھی کہہ دیتا ہے۔ بار بار اعتراف محبت تو کوئی بھی کر جاتا ہے۔ یقین دلانے کے لیے تو جان بھی دینے کو تیار ہو جاتا ہے لیکن عزت کے ساتھ اعتراف محبت کا احساس مجھے پہلی مرتبہ ہوا اور مجھے لگا کہ میں ہار گئی۔ اس خط کے صاف ستھرے لفظوں میں موجود شدت کے احساس نے میری نیندیں اڑا دیں۔ جیسے لکھتے وقت اس کے اندر جذبوں کی شدت پر چھائیں بن کر لفظوں میں سمٹ آئی ہو۔" وہ خواب ناک لہجے میں کہتی چلی گئی۔

"اور آج میں اپنی محبت کو پالوں گی۔" یہ جملہ اس نے ماہ نم سے کہا تھا۔

"اور آج میں نے اپنی محبت کو پا لیا۔" فقط تھوڑی ردوبدل کے ساتھ یہ جملہ کھوئی کھوئی سی زمرد نے سنا تو وہ چونک گئی۔

خوشگوار سانسیں محبت کی خوشبو بن کر اس کے چہرے پر بکھریں تو وہ ہوش میں آئی۔ خوب صورت پھولوں سے بھرا کمرا اور اس کے بے حد پاس کھڑا شخص... خوشبو بھری محبت سے مہکتی سانسیں۔

شیرف قیصر نے خوشی سے بوجھل ہوتی آنکھوں کو بے چینی سے کھولا تو اس کی ٹھوڑی پہ زمرد کا گداز ہونٹ چبھ رہا تھا۔

مگر کوئی اور نہیں بھی تھی۔ اس نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا تو کمرے کے دروازے کے پاس اسے کوئی کھڑا محسوس ہوا۔ اسے جھٹکا سا لگا۔

"کیا ہوا شیرف؟" زمرد نے بھی اسے حیرانی سے خود سے دور ہٹتے دیکھا تو بازو سے پکڑ کر روکا۔ خاصی بے اختیاری تھی زمرد کے انداز میں۔ اور اس لمس پر وہ جان ہی قربان کر دیتا۔

شربتی آنکھوں میں حیا کے ساتھ ساتھ حیرت بھی اور شاید اسے یوں چھوڑ کر جانے پر شکوہ بھی۔ وہ تو چاروں شانے چت ہی ہو جاتا۔ اگر دروازے پر دستک نہ ہو جاتی۔

"اوے اس وقت کون ہے۔ یہ طریقہ ہے ڈسٹرب کرنے کا۔" زمرد کے اندر اب تک کی چھپی وہ مردمار قسم کی لڑکی مشرقی ولبادے سے نکل کر ظاہر ہوئی تو شیرف جیسے خواب سے چونکا۔ بغور اسے دیکھا۔

"تمہارے ساتھ ہوئی ناانصافی پر لڑے گی وہ اگر تمہارے بس میں آ گئی تو..." زیب کا تیر سا جملہ اس کے ذہن کے کونے کو چیر گیا۔

واقعی اب کس بات کا ڈر... میرا ساتھ دینے... میرے لیے لڑنے والی آ گئی ہے تاں۔ بس پھر اب ابا جان کی چھٹی یہی کرے گی، واقعی بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے ڈسٹرب کرنے کا... "شیرف کا دل چاہا کہ وہ نعرہ لگائے اور زور زور سے ہنسے۔

دستک زوردار ہوئی۔ دروازہ اس سے بھی زوردار آواز کے ساتھ کھولا گیا۔

چشم تصور میں اس نے انہیں زمرد کے مدمقابل گڑبڑاتے، وضاحت کرتے دیکھا تو ناقابل بیان تسلی ہوئی دل کو... وہ وہیں بے حد خوش خوش اور خاموشی سے صوفے پر مطمئن بیٹھ گیا تھا کسی فاتح عالم کی طرح... سامنے لائیو ٹرانسمیشن تھی۔ ابا جان، زمرد... مدمقابل...

"اوے ابا جان آپ..." زمرد کی حیران آواز پر اس نے محظوظ ہوتی مسکراہٹ دبائی۔

"ہاں اصل میں بیٹا وہ میں..." ابا جان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

"ابا جان..." زمرد نے انہیں بیچ میں روکا۔

شیرف کو ناقابل بیان کمینی سی خوشی ہوئی تھی۔ ابا جان کو نوٹس کیا تھا، روکا گیا تھا، بات ادھوری رہ گئی تھی ان کی... جو آج تک نہ ہوا تھا اب ہونے لگا تھا... شیرف سے اپنی خوشی کو سنبھالنا مشکل ہونے لگا تھا۔

"آپ اس طرح دروازے پر کھڑے ہو کر بات کریں گے، مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ پلیز اندر آئیں..." شیرف کے لبوں کی محظوظ مسکراہٹ اور

دل میں ناچتی کودتی خوشی تھی۔

"ہاں اب کہیں۔" زمرد کی سنجیدگی ان کے بیٹھنے تک برقرار رہی۔ شیرف کو اس کی سنجیدگی نے بھا دی رکی۔

"بھئی کہنا یہ ہے کہ ہمارے ہاں کا رواج ہے جسے پورا کرنے میں یہاں آیا ہوں۔" چھڑی کو پکڑے صوفے پر بیٹھتے ان کا انداز خاصا باوقار تھا۔

"کہیے!"

"سسر اپنی بہو کو اس کے کمرے سے لے کر آتا ہے اور کچھ رسمیں کرواتا ہے اور اس کے بعد حجرے تک پہلے دلہن کو وہ خود کمرے میں چھوڑ آتا ہے۔ اس لیے میں تمہیں لینے آیا تھا۔ لیکن تمام رسمیں صرف تمہارے ساتھ ہی ہوں گی۔"

شیرف کا دل رکا۔ یہ کیسی رسم تھی جس میں دولہا کو ہی شامل نہ کیا جائے۔ حد درجہ قابل اعتراض تھی۔

زمرد کا ابا جان کے ساتھ... چلے جانا مطلب... لمحوں کا رک جانا... اور ابھی تو بہت کچھ کہنا تھا بہت کچھ سننا تھا۔

محبت کے کتنے ہی الوہی روپ تھے جو محسوس کرنے تھے... اظہار کرنے تھے... ایسے میں سب ایک پل میں ختم؟

شیرف کے دل کو کچھ ہونے لگا مگر اس نے زمرد کو کھڑے ہوتے دیکھا تھا۔ وہ مطمئن ہوا۔ تب ہی زمرد کے نازک لب ہلے۔

"آپ کی ہر بات کا احترام لازم ہے مجھ پر ابا جان... آپ کو خود آنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ مجھے آواز دے لیتے۔ میں خود آجاتی۔"

یہ اتنا ہو گیا تھا۔ ابا جان کا قد لمحے بھر میں بلند ہوا تھا اور شیرف قیصر لمحے بھر میں زمین پر پہنچا گیا تھا۔ ابا جان کو کچھ کہہ نہ دے۔ آخری لمحوں میں اس ایک بات نے اسے بے چین کیا تھا مگر وہ ان کی بات یوں لمحے بھر میں دکھ دے گی۔ ناقابل یقین...

اسے لگا کوئی خواب ہے... وہ آج کی فیشن ایبل لڑکی... وہ جدید کا نمونہ... پرانی رسموں پہ محبت کے ان لمحوں کو قربان کر دے گی۔ حیرت انگیز تھا۔ وہ ابا جان کا ہاتھ پکڑے بصد احترام و محبت ان کے ساتھ نکال ہی دی تھی۔ جب ابا جان نے اپنی اکڑی ہوئی گردن گھما کر مسکرا کر اسے دیکھا۔ زمرد اس کی دلہن... ابا جان کی پسندیدہ... مردار لڑکی... نئے زمانے کے فیشن کرتی... بے باک حد سے زیادہ گستاخ لڑکی... ابا جان نے اس کے لیے پسند کی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ جان گئے تھے وہ 'جو' وہ جان رہا تھا۔

کہ اس کی یہ ساری "خوبیاں" صرف باہر کے لوگوں تک ہی محدود تھیں ورنہ وہ اندر سے خالصتاً "مشرقی روایتوں اور رسموں کا لحاظ" رکھتی رشتوں کی پاسداری کرتی بالکل عام سی ہی لڑکی تھی جس کا ثبوت وہ ابا جان کے ساتھ جا کر دے رہی تھی۔ شیرف بالکل غیر ارادی طور پر زمرد تک پہنچا اور اس کے نزدیک جاتے ہی ایک عجیب بے قراری سی ہوئی۔

"لیکن زمرد..."

زمرد نے مڑ کر دیکھا اور ہاتھ ابا جان نے بھی۔ لیکن پہلی دفعہ وہ ابا جان کو نظر انداز کرتا آگے بڑھا کہ اب کہہ نہیں سکا تو پھر کبھی نہیں کہہ سکے گا۔

"تم... تم اس وقت کہاں جا سکتی ہو اور ویسے بھی یہ رسم و رواج حد درجہ بے وقوفی کے ہیں۔ فضول وقت کو برباد کر دینے والے اور تم یوں ان کے لیے بے قراری چلی جاؤ گی ہونہہ یہاں چھوڑ کر..."

شیرف نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اس کی نظروں نے زمرد کی نظروں کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ اس کی گمبھیر آواز و لہجے میں سحر انگیز فسوں تھا۔ لیکن...

اسے جھٹکا لگا اور سارا فسوں دھواں بن کر اڑا۔

زمرد نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔ شربتی آنکھیں گلابی ہو گئی تھیں لگتی... شیرنی اپنے جلال سمیت اور دہاڑنے لگی ہے۔

"تم... میں نے تو سوچا تھا کہ تم پرانی رسموں کو اور

رشتوں کو احترام دیتے ہو، اس لیے دل میں تمہارے لیے گنجائش رکھی۔ شائستگی کا رچاؤ تمہاری باتوں اور لفظوں میں دیکھا تو تم سے محبت کر بیٹھی، لیکن تم ــــ تم اس قدر ماڈرن ہو گے ذہنی طور پر، یہ نہیں سوچا تھا میں نے ــــ پرانی رسموں اور رواجوں کو فضول مت کہو۔ یہ رسمیں گھٹیا نہیں ہیں۔ بزرگوں کا ارمان ہیں۔ خوشی ہیں۔ وہاں ہال میں سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے، میں اتنے سارے لوگوں کا مان توڑ سکتی، اتنی ہمت نہیں ہے مجھ میں اور نہ ہی یہ ہمت کہ اپنے کسی بڑے بزرگ کو کسی بھی بات کے لیے منع کر سکوں اور نہ تم آئندہ مجھے اس طرح روکنا، سمجھے تم۔"

وہ شعلہ جوالہ ــــ آگ بگولہ ہو کر اپنے لفظوں سے اسے مار رہی تھی اور اس کے لفظوں سے گھائل ہوتے اس کے نیم مردہ وجود پر اس آخری شیرنی والی دھاڑ نے بے اختیار ہی اسے دو قدم پیچھے کیا۔

یہ تھی لائیو ٹرانسمشن ــــ مگر ابا جان کے لیے بڑا ہی دل پذیر اور دل و جان کو سرفراز و سرشار کرتا منظر تھا۔

اور اس منظر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر کر دینے کے لیے ہی تو انہوں نے زمرد کو چنا تھا۔ مقصد پورا ہو اٹھا۔

"چلیں ابا جان ــــ" بے حد خفگی اور درشت نظروں سے بیٹھتی وہ آگے بڑھ گئی اور وہ پیچھے رہ گیا۔

پھولوں بھرے اس کمرے میں رنگ بکھرنے چاہیے تھے۔ قوس قزح کے ساتوں رنگوں کے ہزاروں پھول ــــ

خوشبو آتی کہ محبت بھرے دلوں کے جام بہ بہ جاتے اور اس محبت پر کھڑکی سے جھانکتا چاند شرما جاتا۔

ہوائیں اور معطر ہو جاتیں ــــ

ہر طرف وہ اور بس وہ ہی ہوتی۔ اس کی محبت ــــ اس کی زندگی ــــ اس کی زمرد مگر ــــ وہ جا چکی تھی اس کے ابا جان کے ساتھ۔ بے حد حسرت سے وہ گلاب کے پھولوں سے بھرے بیڈ پر جا گرا۔

وہ جاتے جاتے اسے دیکھ کر مسکرائے تھے۔ اس کی بند آنکھیں پٹ سے کھلیں۔

وہ بے ساختہ اٹھ کر بیٹھا، لیکن پھر دوبارہ بیڈ پر گر گیا۔ اس کے ابا جان کی جاتے جاتے اس کی طرف اچھالی جانے والی روشن اور جتاتی سی مسکراہٹ سارا معمہ حل کر گئی تھی۔

اسے زمرد کو اس کی طرف سے تحفے کے طور پر بھیجی جانے والی تصویریں یاد آئیں۔

ان کے ڈالا ڈیار آئے۔

وہ نرم لہجہ یاد آیا۔

"میرے بیٹے آج تک بھی تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا، تو اب بھی نہیں کروں گا۔"

واقعی ابا حضور ــــ کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی آنکھ ــــ میرے لیے بے شک ہر چیز خود منتخب کی یہاں تک کہ لائف پارٹنر بھی مگر کہیں غلط نہیں کیا۔ نہ ہونے دیا کہ مجھے کچھ نقصان ہوتا سارے نوالے سونے کے کھلائے ــــ مگر دکھا دی آپ نے شیر کی آنکھ ساتھ ہی بلکہ شیرنی کی دھاڑ ــــ شیرنی جو ہمیشہ شیرنی ہی رہے گی تا زندگی ــــ

"ہائے ــــ یہ میری قسمت ــــ" وہ جلبلا کر (کراہ کر) اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اب ساری رات یہ اس کی قسمت تھی کہ وہ پھول زاروں کی اس دنیا میں تنہا ہی رہتا۔

عید کا دن بھی یادگار طلوع ہوا اور اختتام بھی یادگار ہی رہا ہر طرح سے۔

ملن ــــ طلوع آفتاب تا اختتام ــــ
جدائی ــــ اختتام آفتاب تا طلوع آفتاب ــــ
"اف ــــ"

پشمینہ پوش (صوفی) نے پگڈنڈی پر چلتے یکدم اپنی رفتار تیز کی اور اپنا رخ دائیں طرف کی تنگ پگڈنڈی کو کیا۔ یہ اشارہ بھی تھا' ساتھ ہی لیکن کبھی دو قدم پیچھے رہ جانے والے صومعہ نشین (تارک الدنیا) کے لیے کہ جلدی سے اپنا رخ اس بائیں طرف کی پگڈنڈی سے پھیر لو۔ پشمینہ پوش نے یہ کوشش بھی کی کہ صومعہ نشین کی نظر اس گاؤں کی طرف نہ اٹھے۔ جسے عام "چنڈ باساں" کے نام سے جانا تھا۔ اور ان کی جماعتوں میں وہ کسی اور ہی نام سے جانے جاتا تھا۔

مشیت ایزدی سے بچکار دیا گیا۔ آخر کار بچکار دیا گیا۔ "چنڈ باساں"

"یہ راستہ نہیں لمبا پڑے گا۔ ذرا دور نظر آتے اس گاؤں کی قریبی مسجد میں قیام کر لینا چاہیے۔ رات بھی ہو چکی ہے۔"

"ہاں! رستہ لمبا پڑے گا۔ رات ہو چکی ہے۔ ذرا دور نظر آنے اس گاؤں میں قیام ممکن نہیں..... ہمیں آگے چلنا چاہیے۔"

"دور دور تک کوئی گاؤں نظر نہیں آتا سوائے اس بائیں ہاتھ والے گاؤں کے۔"

"اگر وہ قریبی ہوتا تو بائیں رخ ہوتا..... جلدی چلو کہ یہاں سے دور ہو جائیں۔"

"کیا ہم اس گاؤں میں قیام نہیں کر سکتے.....؟"

"ایک ساعت کے لیے بھی نہیں۔ یہ حضرت انسانوں کی گرہستی ہے' یہاں قیام تو دور کی بات گزرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔"

صومعہ نشین کو یہ سن کر بے چینی سی ہوئی۔ اسے

چراغوں کی روشنی لیے 'چراغاں چراغاں ہوئے گاؤں کی قسمت پر افسوس ہوا۔ اس سے پہلے انہوں نے چھوٹے بڑے ہر گاؤں' چک میں قیام کیا تھا۔ انہوں نے ایک ایک نماز ان قیاموں میں ادا کی تھی اور گاؤں والوں کو دعائیں دیتے رخصت ہوئے تھے۔ تو کیا باساں کو آباد رکھنے والوں کے لیے پشمینہ پوش کوئی دعا نہ رکھتا تھا۔ ایسا بھی کیا ہوا کہ اس بزرگ محترم ہستی نے اس کا رخ کرنے کے بجائے اسے اپنی پشت دکھائی۔

"دنیا دنیا داروں کا دانہ ہے اور دنیا دار ہی اسے چگتے ہیں۔ دنیا اسے جال کر بچھا الگ جاتے ہیں۔ وہ اس دانے تلے بچھے جال میں نہیں آتے۔"

☼ ☼ ☼

یہ حضرت انسانوں کی گرہستی ہے..... چنڈ باساں

.....

اس گاؤں میں صرف ایک ہی گھر ایسا ہے جسے لکڑی کا بڑا پھاٹک بند کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس گھر میں کوئی بھی آ جا سکتا ہے۔ دن کے کسی پہر۔ رات کے کسی پہر..... وقت تہجد۔ وقت سحر۔ دن چڑھے..... دن ڈھلے۔

یہ ایک آستانہ گھر ہے۔ کسی بھی وقت آؤ۔ ضرورت پوری کر جاؤ۔ پھر آؤ۔ پھر اپنے برتن بھر جاؤ۔

"ابھی بھی سیری نہیں ہوئی۔ پھر آؤ۔ پھر آؤ۔ آتے جاؤ۔ جب تک سیری نہ ہو جائے۔ سیری ہو جائے تب بھی آتے جاؤ۔

سرمئی شلوار پر اپنے مرحوم باپ کا میلا سفید شلوکا
پہنے اور سر پہ باپ کے ہی چار خانوں کے رنگ کی پگڑی
جمائے صدری اپنے کتے کے ساتھ گلی گلی گھومتا ہے
۔۔۔ اس کے ہاتھ میں غلیل ہوتی ہے اور وہ جہان بھر کی

چڑیوں، کوّوں کے نشانے لیتا پھرتا ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔!
انہیں مارتا نہیں ہے۔۔۔ وہ اتنا زبردست نشانچی بن چکا
ہے کہ اس کی غلیل سے نکلا باریک سا پتھر کسی چڑیا کے
پر کو چھو کر بھی نہیں گزرتا۔۔۔ اسے اچھا لگتا ہے جب

پتھر کے قریب سے انتہائی قریب سے گزرنے پر پرندے پتھر سے اڑ جاتے ہیں۔

بس یہی اس کا مشغلہ ہے انہیں پھر پھر اڑانا ___ وہ ضارب (ضرب لگانے والا) والا نہیں تھا ___ قطعاً" نہیں ___ ایسا سوچنا بھی گناہ تھا..... گاؤں کے لوگ اس کے باپ کو ولی کہہ دیا کرتے تھے اور اگر تھوڑی دیر کو محکم الدین کو ولی مان ہی لیا جائے تو صدری کو ضارب کیونکر مانا جائے ___

ایک بار اسے گمان ہوا کہ اس کی غلیل سے نکلے باریک پتھر نے ننھی منی چوں چوں کرتی چڑیا کے سر کو چھوا ___ اسے یہ گمان یوں ہوا کہ پھر اڑنے سے پہلے چوں ___ ہوں میں بدلی ___ "ہوں ___ آہ بس۔"

اس نے غلیل کو شلوکے میں ٹھونسا اور ایک ایک چڑیا کے پیچھے بھاگا ___ وہ ایک درخت کے نیچے جا جا سانس روک کھڑا ہوا ___ دم سادھے چڑیوں کی چوں چوں سنتا رہا کہ کس چڑیا کی چوں میں ہوں نکلی ہے ....؟

دن ڈھلا ___ رات آئی ___ سحر چھائی ..... صدری درختوں کے نیچے اس ہوں کے انتظار میں رہا ___ گاؤں کے چند لوگ اسے گھر چلنے کا کہنے کے لیے آئے لیکن اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا کہہ کر چلتا کیا ___

پھر صبح سویرے جب چڑیاں دن کی آمد پر رات کے اختتام پر خوشی سے پھر پھر جھومنے کی تیاری کرنے لگتی ہیں اور آکاش کے گلے مل مل جانا چاہتی ہیں۔ اس وقت صدری نے ایک ایک درخت کے نیچے جا جا جہاں چڑیوں کے جھنڈ بیٹھے تھے غلیل میں پتھر رکھ رکھ اپنے پیروں پر مارے ___ کہ لو اے پیاری چڑیا جسے میں نے تکلیف دی میں ہرجانہ دیتا ہوں ___ تم مجھے معاف کر دو۔

پیاری چڑیا نے اسے معاف کر دیا ___ وہ سب صدری کے سر کے اوپر پھر پھرانے لگیں۔ اسی لیے سب اسے عقل سے پیدل کہتے تھے ___ کیسا پیارا عقل سے پیدل تھا وہ..... کتنے عقل والوں کی عقل سے من موہنا تھا وہ ___ گاؤں کی گلیاں پیدل گھومنے والا ___ کبھی اس منڈیر ___ کبھی اس منڈیر جا بیٹھا رہنے والا ___ گاؤں کے چھپر میں بیر ڈھو کر اونچی آواز میں محکم الدین سے سیکھا کلام فرید پڑھنے والا۔

وہ گاؤں کے پرندوں سے ہم کلام ہوتا ہے اور سر اٹھا کر انہیں تکا کرتا ہے ___ اس کے علاوہ اسے ایک اور چیز سے مطلب ہے کہ اس کا کتا دم ہلاتا رہے اور اس کے تلوے چاٹتا رہے ___ وہ کتا جو ایک دن اچانک ہی اس کے ساتھ ہو لیا تھا' جانے وہ کہاں سے آیا تھا' چند دن صدری کے ساتھ رہ کر وہ "صدری کا کتا" کی شناخت سے پہچانا جانے لگا ___ ساتھ کے گاؤں کا چوہدری اس کتے پر فدا تھا۔ اس نسلی جھبرے کتے کو صدری کے ساتھ دیکھ لیا تھا اور اب اسے وہ کتا چاہیے تھا۔

اس کا کارندہ آیا۔ کتے کے گلے میں پٹا ڈال کر لے جانے' صدری سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صدری سوال جواب کے دائرے سے باہر کی مخلوق تھا۔ اس کے کتے کے گلے میں پٹا ڈالا جا رہا تھا اور وہ سر اٹھائے پرندوں کو دیکھ رہا تھا' کتے نے بھونک بھونک کر گاؤں اکٹھا کر لیا ___ کارندے اسے اپنے ساتھ لے گئے اور ایک ہی رات میں چوہدری کا اس سے دل بھر گیا ___ اور کتا صبح دم صدری کے ساتھ تھا پھر سے ___ سنا تھا کہ چوہدری کے باڑے میں وہ تباہی مچی تھی کہ باڑے کے تین ملازم شہر ہسپتال لے جانے پڑے تھے چوہدری نے اپنے اہل خانہ کے ساتھ گھر کے گودام میں چھپ کر جان بچائی تھی۔

صدری نے کبھی کتے کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا کہ "یہ میرا ہے۔" جو شلوار شلوکا پگڑی اس کے تن پر تھی' وہ اس کے باپ کی تھی' جو غلیل اس کے ہاتھ میں تھی وہ مجید ترکھان کی تھی جو آج سے کئی سال پیشتر اسے مجید ترکھان نے بنا کر دی تھی۔ اس کے پاس کچھ نہ تھا' اسے سب دیا گیا تھا۔

سارا دن کھیتوں' کھلیانوں' میدانوں' ٹیلوں ٹکیوں میں پھرتا پھراتا رہتا' بھوک پیاس لگتی تو گاؤں کے کسی بھی گھر کا دروازہ بجا کر کھڑا ہو جاتا اور اسے روٹی دے دی جاتی ۔۔۔ بلکہ یہ نوبت کم ہی آتی ۔ اسے روک کر روٹی کھلا دی جاتی۔۔۔

گاؤں والے بہت اچھے ہیں ۔۔۔ وہ بھی بہت اچھا ہے اور اس اچھے کی اچھی شیابا گائے کو دن بھر کوئی نہ کوئی چراتا پھرتا ۔ اسے خبر نہیں ہوتی تھی کون ۔ بس گائے کا پیٹ بھرا ہوتا ۔۔۔ اسے چھپر میں نہلایا ہوتا ۔۔۔ شام کو اس کے کھلے پھاٹک کے گھر میں اسے کھونٹے سے باندھا ہوتا ۔۔۔ اس کا دودھ دوہا ہوتا۔

ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا تھا ۔۔۔ محکم الدین کی زندگی میں بھی ۔۔۔ اس کی موت کے بعد بھی شیابا گائے محکم الدین کے گھر بھی لیکن وہ گاؤں والوں کی تھی ۔ ان ہی کا پیٹ بھرتی تھی۔

اس گائے کے بارے مشہور تھا کہ اس نے محکم الدین کی بزرگی پر مہر ثبت کی تھی ۔۔۔ محکم الدین ایک سائیں ملوک بندہ تھا ۔ صدری کے بعد بیوی مر گئی تو اللہ سے لو لگالی' کہتے ہیں اس نے مردہ جورو کے سرہانے زندہ وجود کو پڑے دیکھا تو دیوانہ سا ہو گیا ۔ بند آنکھوں کے پہلو میں زندہ آنکھیں اور زندہ کے پہلو میں مردہ ہو چکی آنکھوں کو دیکھ کر اس کی جون بدل گئی ۔ اس نے اپنے گھر کا سامان تقسیم کر ڈالا ۔۔۔ اور شہر جا کر مزدوری کرنے کے بجائے بان بٹنا شروع کر دیا ۔۔۔ وہ صرف اتنا ہی کام کرتا جس سے وہ لوگ دو وقت کی روٹی کھا سکیں ۔

ان کے گھر میں گاؤں والوں کا آنا جانا بہت کم تھا ۔ ایک تو ان کے گھر میں کوئی عورت نہیں تھی دوسرا محکم الدین سننے میں فیاض تھا لیکن بولنے میں نہیں ۔۔۔ بان بٹوانے جو لوگ آتے کھڑے کھڑے اپنا مدعا بیان کرتے اور چلے جاتے ۔ ایسے شخص کے پاس آخر کوئی کیوں بیٹھے جو دنیا داری کی کوئی بات نہیں کرتا اور بات کرو بھی تو جواب نہیں دیتا ۔۔۔ وہ اسے بان پر بان دیتے جاتے اور اجرت دینا بھول جاتے ۔۔۔ آخر ایسے سائیں ملوک بندے کو اجرت کی ضرورت ہی کیا تھی جس کے گھر میں کھانے کے چند برتن تھے اور جو پیوند لگے کپڑے پہنتا تھا ۔ ایک رات ان کے ادھ کھلے پھاٹک سے ایک گائے اندر آئی اور احاطے میں ڈکارنے لگی ۔ وہ ڈھور ڈنگروں کے شوقینوں کے دل کی حسرت اور ان کی آنکھوں کا تارا شیابا گائے تھی ۔

”شیابا اور اس جیسے سائیں ملوک کے گھر میں جو مٹی کے پیالے میں پانی پیتا ہے اور ایک وقت کی روٹی پیاز یا مرچ سے کھاتا ہے ۔۔۔“

صبح ہوتے ہوتے مانو جیسے سارا گاؤں محکم الدین کے احاطے میں میلہ لگا کر اکٹھا ہو گیا کہ جیسے کہتا ہو۔۔۔

”ایسی چالاکی بابے دین ۔۔۔ فقیری چولا اوڑھنا اور بادشاہی عیاشی کرنا ۔۔۔ ایسی چالاکی ۔۔۔ چھپے رستم ۔۔۔“

بابے دین نے جیسے ہاتھ جوڑ جوڑ سب کو بتایا کہ ”جانے کس کی ہے ۔ رات ہی رات کو اندر آ کر ڈکارنے لگی ۔۔۔ جس کی ہوگی آ کر لے جائے گا ۔“

ایسے کیسے آ گئی ۔۔۔ ہاں بابے دین کا پھاٹک جو کھلا رہتا تھا ۔۔۔ وہ پھاٹک بند ہی کیوں رکھے ۔۔۔ جو گھر کے اندر تھا اسے بھی گھر سے باہر کرنے میں اسے تامل نہ تھا ۔

گاؤں والوں نے جیسے اپنے سینے مسلے ۔۔۔ ہائے ان کے گھروں کے پھاٹک کیوں نہ کھلے رہے ۔۔۔ کوئی الہام ہی ہو جاتا' کوئی خواب ہی آ جاتا' کوئی پیر فقیر انہیں اشارہ دے جاتا ۔۔۔ اب اگر اس کا مالک نہ لینے آیا تو ۔۔۔ تو ۔۔۔ تو یہ بابے دین کی ہی ہوئی نا ۔۔۔ کاش رات کوئی چور ہی آ جاتا کہ گھر کا کواڑ تو کھل جاتا ۔

گاؤں والوں کی آنکھیں' منہ پانی سے تر بتر تھے ۔ لڑکے بالے' سیانے بیانے سبھی شیابا گائے کے گرد گھوم گھوم اسے نظر لگا رہے تھے اس کی نظر اتار رہے تھے ۔۔۔ کیا قد کاٹھ تھا ۔۔۔ کیا ڈیل ڈول تھا ۔۔۔ ایسے کہ گایوں کی ملکہ' مہارانی کھڑی ہو ۔۔۔ اور ایسی کہ ابھی ناچ بوٹی کروا کر آئی ہو ۔۔۔ بابے دین کے مزے ۔۔۔ بیٹھے بٹھائے مہارانی صاحبہ مل گئیں ۔۔۔ تف اور سو گواہ

بند کر کے۔ گاؤں بھر میں جیسے انگارے بجھ گئے۔ گاؤں والوں کا چین قرار گیا۔ آخر اس کا مالک آ کیوں نہیں جاتا۔۔۔ اور ایسی گائے کا مالک کیا ایسا ہی لاپروا تھا کہ گائے کھونٹا کھول کر بابے دین کے کھونٹے سے آ لگی۔۔۔

اب سب کی آنکھیں راہ راہ ہو گئیں کہ دیکھیں کب آس پاس کے گاؤں چکوں سے گائے کے مالکان آتے ہیں۔ لیکن وہ تو آتے ہی نظر نہ آئے۔

جب تک گائے بابے دین کے احاطے میں تھی اور اس کا مالک نہیں آ جاتا تھا عورتوں نے اپنے اپنے برتن دودھ سے بھر لیے اور جب انگلی ڈبو ڈبو کر دودھ کو زبان سے لگائیں تو جیسے اپنی چیخ دبائیں۔

"بتاؤ ذرا اس دودھ میں کیا گھلا ہے۔۔۔ غضب خدا کا کیا یہ زعفران کھاتی رہی ہے۔۔۔ یا مشک تو اس کے منہ میں انڈیلی جاتی رہی ہے۔۔۔ اور کیا یہی مثل شراب طہورہ ہے جسے بہشت میں نوش فرمانا نصیب ہوگا۔۔۔ دودھ ہے کہ دودھ کے نام پر کچھ اور۔۔۔؟"

گاؤں کی قابل تکریم اور سیانی عورت سارا دودھ ڈولتی اور بھر حصے سے تقسیم کر دیتی کہ کوئی لڑائی نہ ہو۔ دو گلاس دودھ بابے دین اور صدری کے لیے رکھ چھوڑے پر جب بابے نے اپنا گلاس بلیوں کو پلا ڈالا تو سیانی نے ایک گلاس دودھ شام کو رکھا جس کی بوند بوند پر گاؤں والے مرتے تھے۔ سیانا اسے بلیوں کو پلا رہا تھا عورتوں نے اس دودھ کو گھونٹ گھونٹ بڑی عقیدت سے پیا جیسے وہ آب زمزم ہو۔۔۔ ایک گھر میں لڑکی کی شادی ہوئی تھی جمعے کو تو اس کی ماں نے سارا دودھ اس کے لیے رکھ چھوڑا۔

ایک نے ساتھ کے گاؤں اپنے میکے بھی بھجوایا یہ پیغام دے کر کہ گھونٹ گھونٹ سب پی کر مجھے بتانا کہ کیا کبھی ایسا دودھ پیا ہے۔۔۔؟

پیغام کا جواب آیا کہ نہیں۔۔۔ اور سوال آیا کہ "اور ملے گا۔۔۔؟"

اگلے دن کی رات بھی آن پہنچی تو جیسے سب نے شکر کا سجدہ ادا کیا کہ گائے کا مالک نہیں آیا۔۔۔ البتہ خواتین رات کو اٹھ اٹھ کر لالٹین لے کر گھروں کی چھتوں پر کھڑی ہو کر گاؤں کی اور آنے والی پگڈنڈیوں کو گھورتی رہیں کہ کہیں کم بخت مارے مالکان آدھی رات کو ہی نہ آ دھمکیں اور وہ ایسی دلاری گائے کو جاتا ہوا نہ دیکھ سکیں "گائے یہیں رہ جائے" یہ دعائیں کی گئیں۔ گائے کے مالکان مر مرا جائیں یہ بددعائیں کی گئیں۔

فی الحال گائے وہیں رہ گئی۔۔۔ فی الحال گائے کے مالکان مر مرا گئے ہوئے ہی لگتے۔۔۔

گھر گھر میں شیاما زیر موضوع تھی۔

اور گاؤں والے۔۔۔ سب ہی عورتیں بچے مرد بوڑھے سیانے انجانے مستانے اتنے محتاط تھے کہ

انہوں نے گاؤں کا ذکر گاؤں سے باہر جانے ہی نہیں دیا کہ مبادا اڑتی اڑتی خبر گائے کے مالک تک جا پہنچے۔

کسی کے گھر کوئی مہمان آتا تو اس سے بھی ذکر نہ کرتا کوئی مہمان بن کر جاتا تو بھی نہیں اور تو اور گاؤں میں بیاہی آئی بہوؤں نے اپنے میکے والوں کو بھنک بھی نہ پڑنے دی۔۔۔ اور دوسرے گاؤں میں بیاہ دی گئی بیٹیوں کو بھی۔۔۔

گاؤں کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ سب میں ایسا اتفاق تھا کہ بنا کسی پنچایت کے فیصلے کو نے سب کو یہ معلوم تھا کہ گائے کو لے کر انہیں کیا کیا احتیاطی تدابیر کرنی ہیں۔۔۔ اور انہوں نے کیں بھی۔۔۔ جیسا کہ بابے نظام الدین نے سب سے کہا کہ آس پاس کے گاؤں چکوں میں منادی کروا دی جائے کہ ایسے ایسے ایک گائے اس کے گھر آ گئی ہے جس کی ہے آ کر لے جائے اور انہوں نے منادی نہ کروائی۔۔۔ اب گاؤں کے سیانے بھاسنے بالکل تھوڑا ہی تھے بابے دین کی طرح کہ جاتے یہ منادی کروانے کہ آ کر اپنی گائے لے جاؤ۔۔۔ عورتوں نے تو مردوں کو اپنی قسمیں دی تھیں کہ خبردار جو منادی کروانے ادھر ادھر گئے۔۔۔ اور مردوں نے ان قسموں کی لاج رکھی۔

کئی دن گزر گئے۔ کوئی آیا نہ گیا۔۔۔ ایک دن محکم الدین خود ہی گیا' اسے کچھ شک سا تھا بھلا مانس سا تھا شک بھی گناہ سمجھ کر کرتا تھا اس لیے کرہی نہ سکا اور چل پڑا۔۔۔ گاؤں نے اپنے جینے پینے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ سالوں بعد محکم الدین اپنے حجرے سے کیوں نکلا ہے۔ بہرحال انہوں نے گائے چھپادی کہ اگر محکم الدین مالک لے بھی آیا تو کہہ دیں گے کہ ہمیں کیا پتا گائے کیسے کھونٹا تڑوا کر نکل گئی جیسے آئی تھی ویسے چلی گئی۔ پر یہ کہنے کی نوبت نہ آئی محکم الدین رات کے پہلے پہر مایوس سا واپس آیا۔۔۔ مسجدوں میں اعلان کروا آیا تھا۔۔۔ گاؤں کے سیانوں کو بتا آیا تھا۔۔۔ لیکن کسی کو گائے کے ذکر میں دلچسپی نہیں تھی۔۔۔

خدا جانے گائے کے ساتھ کیا بنی تھی' وہ کس کی تھی کہاں کی تھی' یہاں کیوں آگئی تھی۔

اگلے کئی دن بھی بابا دین ایسے ہی جاتا رہا اور مایوس واپس آتا رہا تو گاؤں والوں نے جوق در جوق اس کے پاس آنا شروع کردیا کہ۔

"یہ گائے اللہ کا انعام ہے۔۔۔ اس کی نیکی و پرہیزگاری کی مہر۔۔۔ اس کا کوئی مالک نہیں۔۔۔ اس کا مالک اللہ ہے۔ اور اس کے مالک اب وہ اور گاؤں والے ہیں۔"

بابا دین خاموشی سے سنتا رہتا' اگلے دن پھر نکل جاتا گھر سے۔ اور پھر دن ڈھلے اسے ڈھلکے سر کے ساتھ آتا دیکھ کر سب کے سینوں میں ٹھنڈی سانسیں بھر جاتیں۔

"تو مان کیوں نہیں لیتا کہ یہ تیری عبادتوں کا ثمر ہے۔" گاؤں کے سفید چٹے والے سیانوں نے کہا۔

"عبادت کی ہی نہیں تو ثمر کیسا۔۔۔ مجھے تو یہ کوئی آزمائش لگتی ہے۔"

"پھر کیوں آئے گی آزمائش۔۔۔؟"

"کسی کے لیے تو آزمائش آئی ہے پھر۔۔۔ ایسے انعامات جب ایسے نازل ہوتے ہیں تو بڑے بھاری ہوتے ہیں۔۔۔ یاد کرو' بنی اسرائیل والوں کے سر من و سلویٰ کے ساتھ کیسی ذمہ داری آن پڑی تھی۔۔۔ روگردانی کی گنجائش نہیں رہتی پھر۔"

"تو کہاں نبیوں تک جا پہنچا۔۔۔ یہ گائے ضرور ہے پر نبی نہیں ہے۔"

"پر ہم سب تو نبی ہی ہوتا۔۔۔ انسان ہیں' ہم۔۔۔ نجانے کہاں چوک جائیں۔"

"تو تو صدری کی طرح پاگل بھی ہے محکم الدین۔"

"ہاں' میں پاگل ہوں لیکن صدری نہیں۔۔۔ وہ آسمان کو تکا کرتا ہے۔۔۔ وہ پاگل نہیں ہے۔۔۔ اسے میری طرح عبادت کرنے کے لیے صف پر کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کے وضو نہیں ٹوٹا کرتے۔۔۔"

گاؤں بھر میں مشہور ہوگیا کہ شیاما گائے بابے پر خدائی انعام بن کر نازل ہوئی ہے۔۔۔ ایسا انعام جس کے دودھ کی اسے پرواہ تھی نا اس کی کھال کی۔۔۔ وہ اس کے

گھر کے احاطے میں بندھی تھی' جھٹکے سے کسی کے بھی احاطے میں بندھ جاتی' اُسے تنگ برابر پروا نہیں تھی۔ بابے نے بڑا چارہ کیا کہ گائے کا مالک مل جائے لیکن مالک نہ ملا۔ گائے کی مشہوری کی بھنک پر اگر کوئی اسے دیکھنے آجاتا تو گاؤں والے اسے جیل کو بے بن کر نوچنے کے قریب ہو جاتے۔ بچے ایسے ملنے آنے والوں کو "وٹے" مار مار بھگاتے۔ انہیں ایسا کرنے کے لیے ان کے بڑے کہتے۔

"ہماری ہے وہ گائے۔ ہماری شبابا..... بھاگو یہاں سے۔" وٹے مارتے وہ چلاتے جاتے۔

گاؤں بھر تو پہلے ہی اس کا دودھ پیتا تھا جب کئی مہینوں بعد بھی اس کا مالک نہ آیا تو بابے بین نے اعلان کیا۔

"یہ سب کی گائے ہے اس پر سب کا حق ہے۔ اور میں اس کے حق سے دست بردار ہوتا ہوں۔ روز قیامت اس کو لے کر مجھ پر کوئی سوال نہ اٹھائے۔ میں اس گائے کی آمد کی حکمت سے انجان ہوں' اگر یہ میرا پول کھولنے آئی ہے تو اللہ میرے عیبوں پر پردے ڈالے اور اگر یہ تمہیں سیر کرنے آئی ہے تو یاد رکھنا انسان کا پیٹ کبھی نہیں بھرا۔ یہ بھی نہیں بھر سکے گی۔ اس لیے اللہ کو یاد کرتے رہنا کہیں بھٹک نہ جانا۔"

گاؤں والے آتے اور اپنی مرضی سے دودھ لے جاتے..... گاؤں کے گھر گھر کتنی گائیں تھیں' بھینسیں تھیں' لیکن شبابا تو نہیں تھی نا۔ اس ساز عفران ملا گلابی پنکھڑیوں کی ملاحت لیے مشک مشک دودھ دینے والی۔ جس برتن میں اس کا دودھ ڈالو نا تو اس برتن کو چاٹ چاٹ کھاؤ۔ اور نہیں تو ناک کے قریب رکھ کر سونگھتے سونگھتے سو جاؤ۔ لڑکیاں بالیاں اپنے منگیتروں کو اسی دودھ کی کھیر بنا بنا بھیجیں۔ ماؤں کے لاڈلے شبر جوان یہ دودھ پیتے لڑکیوں سے اس معاملے میں بھی وسیع برتی جاتی۔ سب کا مشترکہ ماننا تھا کہ جو مکھن' جو لسی' کھیر' وہی اس دودھ سے بنتا ہے وہ کسی اور دودھ سے نہیں بنتا۔ جو سرور اس دودھ کو پی کر ملتا ہے وہ تمام گائے کے دودھ کے مقابلے میں کئی ہزار گنا ہے۔ اس دودھ میں انگلی ڈبو کر چٹکیوں پر رگڑو اور وہ ہی دن میں گجیں کشمیری انار سے سرخ ہو جائیں۔ غرض گاؤں والوں کو تو ہزار ہا فوائد ازبر تھے... بچہ بچہ عقیدت واحترام سے "شبابا" کا ذکر کرتا کہ ان کے پیٹ کے دردوں میں اسی کا دودھ کام آتا ہے اور بچے کو بھی مل جاتا ہے بہانے سے۔

☼ ☼ ☼

بابے کے گھر کا پھاٹک کھلا رہتا' پہلے بھی کھلا ہی رہتا تھا اب اتنا نہیں کھلا رہنے لگا۔ دن رات گائے کے دودھ کے لیے آیا جاتا' وہ ایسی فرماں بردار گائے تھی کہ وہ بوند ہی دودھ دیتی لیکن بے وقت آنے والوں کے برتن بھی خالی نہ بھیجتی۔

جو کھیر پکاتا' مکھن نکالتا' وہی جماتا' بابے اور صدری کے لیے رکھ جاتا۔ بابا تو دن میں ایک وقت کا کھانا کھاتا تھا' وہ بھی روٹی اور پانی۔ صدری البتہ شوق سے سب کھاتا۔ وہ بھی سامنے آجاتا تو ورنہ منہ سے کبھی نہ کہتا کہ کھیر کھانی ہے' مکھن چاہیے۔ کسی کا جی چاہتا تب۔

گوبر لے جانے والیاں گوبر لے جاتیں' احاطے میں جھاڑو لگا جاتیں' احاطے کے پیچھے ایک ہی کمرہ تھا' اسے بھی صاف کر جاتیں۔ بابا لاکھ منع کرتا لیکن وہ کرتی جاتیں' کپڑے دھو کر سمیٹ کر بھی رکھ جاتیں۔

لڑکے بالے اُدھر اُدھر والے گائے کو کھونٹے سے کھول کر چرانے لے جاتے' ٹہلاتے بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتے کہ کہیں گائے جیسے آئی تھی ویسے ہی نہ چلی جائے' سب اس کی اچھی رکھوالی کرتے' اس پر داری صدقے ہوتے۔

گاؤں کا اکلوتا نلکی بھکو کھو کھلا بانس اس کے منہ میں ڈال کر اس کے اندر سرسوں کی کھلی انڈیلتا۔ جو کھلی لڑکیوں کو منہ دھونے کے لیے نصیب نہ تھی وہ شبابا کو منہ کے اندر کرنا نصیب تھی۔

"نہ ہمیں دودھ ملتا ہے نہ کھلی۔" وہ رونے رو تیں

گاؤں کا بڑا گوالا رحمت چپکے سے رات کو بابے کے پاس آیا اور گائے کو خریدنے کی بات کی۔ محکم الدین بگڑنے لگا۔

"جو چیز تمہاری ہے اسی کو خرید رہے ہو۔ وہ رہی گائے اسے کھول کر لے جاؤ۔"

رحمت نے ہرن کی سی قلانچ بھری اور گائے کھول یہ جا وہ جا۔

صبح دم جو عورتیں برتن لے کر آئیں' خالی احاطہ دیکھ کر سینہ کوبی کرنے لگیں۔

"چلی گئی۔ گئی شیاما۔ کتنی بار کہا بابے سے' رات کو تو پھاٹک بند کر' پر نہیں۔ چلی گئی نا۔ بابے تیرا بیڑا ترے۔"

"وہ گوالے رحمت کے گھر ہے' جاؤ۔ اب تم وہاں سے جا کر دودھ لو۔"

"ہائے مر جانا کم عقل بابا!" انہوں نے اور زور و شور سے سینہ کوبی کی یعنی اب وہ گوالا تو ضرور انہیں دودھ دوہنے دے گا۔ ہائے بابے محکم الدین تیرا ککھ نہ رہے۔"

عورتوں نے واہی تباہی بکتے اپنے مردوں کو جا لیا' گاؤں بھر میں شور اٹھا۔ سب رحمت کے گھر کی طرف لپکے.... اس نے صاف انکار کر دیا۔

"گائے اب میری ہے۔ یہ بابے دین کی تھی اس نے اپنی خوشی سے مجھے دی۔ بس اب یہ میری ہوگی۔"

"تو اسے رکھ' اس کا دودھ ہمارا ہے۔"

"ایک بوند بھی تمہاری نہیں اب...." وہ اکڑ گیا۔

"تو اس گائے کا باپ ہے؟"

"ہاں اب تو ہوں۔" اس نے کان کی بالی کو چھوا۔

"یہ بابے دین کا خدائی انعام ہے۔" چوہدری جی نے اسے شرم دلانا چاہی۔

"بابے دین نے یہ خدائی تحفہ مجھے سونپ دیا ہے۔ بس مرضی اللہ والوں کی...."

"سونے کے بھاؤ بیچے گا اس کا دودھ یہ۔" گاؤں کی دائی اس کی گردن دبوچنے کو تھی۔ اس کی آواز اتنی بلند ہو گئی کہ اللہ کی پناہ....

"اب جو کروں گا' دیکھ لینا۔" رحمتے نے سب کو چڑایا۔

"کہاں ہیں سارے شیر جوان جنہوں نے شیاما کا دودھ پیا ہے' مار مار کر اس کا بھرکس نکال دو۔ یہ کون ہوتا ہے گائے کا مالک بننے والا۔" رابیہ نے دھاڑ کر کہا۔ گائے کا دودھ پیا تھا' دھاڑ سکتی تھی۔

معاملہ بگڑ رہا تھا۔ سارے گاؤں والے ایک طرف ہو گئے تھے۔ لڑ مرنے کو تیار تھے۔

"شام کو پنچایت میں فیصلہ ہوگا۔" اعلان کیا گیا۔

شام کو پنچایت بٹھا دی گئی۔ بابے دین کے پاس بھی گئے۔ اس نے بڑے پیار سے کہا کہ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا وہ گائے سے دستبردار ہے۔

پنچایت لگی۔ سارا گاؤں اکٹھا ہوا۔ ایسی پنچایت شاید ہی کبھی لگی ہو۔ رحمت کسی کی بھی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ شام ڈھلنے لگی۔ مدھم مدھم ستارے نظر آنے لگے۔ رحمت کی ایک ہی رٹ تھی کہ گائے اس کی ہے بس۔ بابے دین کے گھر آئی تھی تو بابے دین کی تھی۔ اب اس کے پاس ہے تو اس کی ہے۔ بڑی تیر میر ہونے لگی.... گھبرو جوان لڑکے بھڑک بھڑک جاتے۔ انہیں ان کی ماؤں نے سمجھا کر بھیجا تھا۔

"نہ مانے تو سر کھول کر رکھ دینا رحمتے کا۔ آیا وڈا شیاما تے قبضہ کرن والا۔"

رحمتے نے بھی اپنے شلوکے میں پستول چھپا رکھی تھی' وہ تو سینے کھول کر رکھ دے گا سب کے.... کان میں زنانہ بالی نہیں پہنی تھی اس نے۔

ابھی گرما گرمی جاری تھی اور جاری ہی رہنے والی تھی کہ رحمتے کا بڑا لڑکا اس کے قریب جھکا۔ یہ لڑکا پنچایت کی کارروائی بھاگ بھاگ کر گھر جا جا رہا تھا اور گھر سے گاؤں بھر سے "کھپنی رن" کا خطاب پانے والی اپنی دادی کے پیغامات اپنے باپ کے کان میں انڈیل رہا تھا۔

"شیاما نے زہریلی کھمبیاں چارے میں کھالی

ہیں۔"

بھوں بھاں کر کے رحمت حیت سا ہو گیا۔ اس نے خون آلودہ دیدوں سے اپنے بیٹے کو گھورا اور خود کو اس کی گردن دبوچنے سے روکا۔

"بشیرے کی ماں کو مرگی کا دورہ پڑا ہے۔" رحمت کہہ کر گھر کو بھاگا۔ گاؤں والے حیران رہ گئے۔ یہ کون سی مرگی تھی جس کا دورہ ساری عمر چھوڑ کر اس عمر میں اچانک پڑا تھا۔

"کہاں سے کھالیں اس نے کھمبیاں؟" رحمت گھر جا کر دھاڑا۔ گھر میں پہلے ہی صف ماتم بچھی تھی۔

"پتا نہیں۔ اس کے چارے میں کہاں سے آ گئیں۔"

رحمت اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ او اب شیابا سے سارا گاؤں ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اسے کھونٹے سے کھولا اور پنچایت میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔

"لو سنبھالو اسے۔ میرے لیے تو یہ منحوس ہے۔ میری بیوی کو مرگی کا دورہ پڑا' ماں کا بانجھ جلا۔ اناج کے گودام میں آگ بھڑکی۔" رحمت نے جھوٹ بولا اسے کوئی ضرورت نہیں تھی بلدیہ کو مری ہوئی گائے کو اٹھانے کے لیے تین ہزار دینے کی۔ پنچایت جانے بابا دین۔

رحمت کے گھر جانے کے بعد پنچایت نے فیصلہ کر لیا تھا کہ رحمت سے گائے لے کر نجے کو میاں محمد بخش کے رکھا جائے گا جن کی بی بی بچوں کو سپارے پڑھایا کرتی ہیں۔ کہ بابے دین کی واپسی کی تو وہ اپنی کم عقلی سے پھر کسی کو گائے دے دے گا۔

تو گائے محمد بخش لے گیا۔ لیکن کیونکہ گاؤں تھا اور گھر سے گھر ملے ہوئے تھے تو یہ ذرا سی دیر میں ہی ایک بچے کی ماں بی بی کو بتا گئی کہ گائے زہریلی کھمبیاں اور کھمبو کے پھل کھا گئی ہے۔ بس مرنے ہی والی ہو گی۔ بی بی کے ہاتھ پیر پھولے اور دونوں میاں بیوی نے سوچ سمجھ بول گائے نکی کے حوالے کی۔

نکی بھی گاؤں میں ہی رہتا تھا۔ اسے بھی خبر ہو گئی۔

اس نے جھٹ بابے دین کے گھر لے جا کر گائے باندھ دی کہ بابا جانے اور گائے اور بلدیہ۔

جن جن کو خبر تھی سو وہ صبح دم گائے کے مرنے کی خبر کے منتظر تھے لیکن ایسی کوئی خبر نہ آئی۔ رحمیے کی ماں اپنا برتن لے کر بہانہ بنا کر آئی اور کیا دیکھتی ہے کہ احاطے کی دیوار کی دراڑ میں اگے پودوں پر جھاگ پڑی ہے۔ گائے بجھ ذرا ڈھیلی اور سست ضرور ہو گئی تھی لیکن مری نہیں تھی۔

رحمیے کی ماں نے جیسے وہ ہنہو اپنے بیٹے پر مارے۔ اس نے یوں گائے کو چلتا کیا تھا کہ اگر ایسے مر گئی تو گاؤں والے کہیں گے 'ہم نے مار ڈالا۔ جان کو آجائیں گے تمہ۔

دن چڑھتے چڑھتے اندر کی بات سارا عالم جان گیا۔ وہ دن انہوں نے گائے کے دودھ سے پرہیز کیا' جن پودوں پر شیابا کے منہ سے نکلی جھاگ گری تھی' وہ ہرے بھرے ہو گئے۔ ان پر گلابی پھول نکل آئے۔ گاؤں والوں نے سوچا کہ یہ تو کرامانی گائے ہے۔ زہر کھا کر زبان اگلتی ہے۔ یہ تو معجزانی گائے ہے۔ وہ اور عقیدت و احترام سے اسے رکھنے لگے۔ اس کا دودھ استعمال کرنے لگے۔ آگے پیچھے کے سال اس نے بچھڑے دیے لیکن وہ مر گئے۔

گاؤں والوں کو بڑی آس تھی کہ شیابا کے بچھڑے بچ جایا کریں۔ عورتیں ایسے اپنے اپنے گھروں میں دعائیں کیا کرتیں جیسے وہ اولاد بانجھ والی ہوں اور اب کے وہ اولاد نہ بچی تو مری جائیں گی۔ ہاں بس مری جائیں گی۔

اس کے دودھ میں شفا اور برکت بڑھتی ہی جا رہی تھی' بخار میں بیا' سر درد میں بیا' پیٹ درد میں بیا۔ بس جانو کہ کسی بھی بیماری کا سوچ کر پی لیا کہ "لو میں شیابا گائے کا دودھ بھی پیتا ہوں۔ مجھے فلاں بیماری' تکلیف ہے۔" اور اوچی بندہ بھلا چنگا۔

چار سال سے گائے گاؤں والوں کو بھلا چنگا کر رہی تھی۔ گائے کی آمد کے ڈیڑھ سال بعد بابا نجم الدین چل بسا تھا۔ خیر یہ ایسی فکر کی بات نہیں تھی

صدری تو زندہ تھا نا۔ اب گائے کا مالک وہی تو تھا۔ باپ کی طرح اسے بھی کوئی اعتراض نہ تھا کہ کون کب کب آتا ہے اور کیسے اور کتنا سونا سونا دودھ لے جاتا ہے۔ کام چل سو چل رہا تھا۔ محکم الدین کے مرنے پر وہ دیوانہ چلایا "بابا اسے پہلے ہی سمجھا گیا تھا کہ جو برحق ہے اس پر واویلا نہیں کرتے۔

برحق جانے والے کے حق ہو بیٹے نے زرا واویلا نہ کیا۔ وہ سو کر اٹھتا تو چنگیر میں روٹی 'سالن' اچار' لسی کا گلاس رکھے ہوتے۔ وہ کھا کر مٹکیل لے کر نکل جاتا' گھر آتا تو روٹی سالن' کھیر' مکھن' رکھی پڑا ہوتا وہ کھا لیتا۔ گندے کپڑے اتار کر کہیں بھی رکھ دیتا۔ اگلے دن وہ دھلے دھلائے تہہ کیے ملتے' کمرے میں احاطے میں جھاڑو دی ہوتی۔ تربوز' خربوزے' آم' مالٹے چنگیروں کے ساتھ ہی آتے' وہ سب کھا لیتا' اس کھانے لینے میں کسی کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ آم' مالٹے' کھیر' دلو' گوشت تھا کر وہ بھول بھی جاتا کہ ان کا ذائقہ کیسا تھا۔ شام کو یا رات کو گھر آتا تو صحن میں پڑ کر سو جاتا' باہر پھاٹک کھلا ہی رہتا اس نے کبھی بند کیا نہ اسے کبھی وہ بند ملا۔

ایک دن وہ بس میں بیٹھ کر شہر چلا گیا اور سارا دن بھوکا رہا۔ اسے تو روک کر کھلا دیا جاتا تھا تو شہر میں اسے کون روک کر کھلاتا۔ سو شیبا کا دودھ تھوڑی پیتے تھے۔

گھر آیا تو چنگیریں پڑی تھیں۔

ایسے ہی چند سال بیت گئے۔

شیبا پہلے دن کی دلہن کی طرح اب بھی ہر ایک کو دل عزیز تھی' آج بھی عورتیں اس کی نظریں اتارا کرتیں اور اس کے منہ میں کھلی انڈیلے جانے پر لڑکیاں آہیں بھرتیں' سردیوں میں شیبا کی آمد کے قصے چھیڑے جاتے اور دہرایا جاتا کہ اس کے دودھ سے کیسی کیسی کرامات جڑی ہیں۔ کون کون صحت یاب ہوا اور کیسے کیسے رنگ و روپ نکھر نکھر گئے۔ کئی بوڑھوں کو دوبارہ جوانی نصیب ہو گئی۔ ہاں لیکن شیبا سے متعلق بات کرتے وہ اس بات کا دھیان رکھتے تھے کہ کسی اجنبی کے سامنے یہ سب باتیں نہ کی جائیں۔ اجنبی اپنی کالی نظر نہ لگا دے۔ اور نہیں تو چرا ہی لے جائے۔ ورنہ بیوپاری مانگ بیٹھے۔

ایک شام صدری گھر آیا تو سارے گاؤں والے احاطے میں کھڑے بین کر رہے تھے۔ ایک ڈاکٹر گائے کا جائزہ لے رہا تھا۔

جیسے وہ آئی تھی ویسے ہی وہ چلی گئی۔ وہ مر چکی تھی۔

عورتیں باقاعدہ بین کر رہی تھیں۔ شیبا مر چکی تھی۔

اس رات صدری کو بھوکا سونا پڑا۔ سب گائے کے غم میں مبتلا سوگ منا رہے تھے اور اسی رات اس گھر کا پھاٹک بند ہوا۔ کسی نے پھاٹک کو غصے سے بھیڑ دیا تھا کہ اب یہاں کیا رکھا ہے جس کے لیے دن رات آیا جائے۔

ان کا نفع تو جا چکا تھا۔ اب وہاں کون تھا۔

☼ ☼ ☼

صدری کے گھر کا آنگن دھول سے اٹ گیا اور وہ میلے کپڑے ہی بدل بدل کر پہنتا رہا۔ باپ کے دین کی شلوار' شلوکا اور پگڑی۔ چند ایک ہی تھے اور وہ چند ایک میل سے اٹ چکے تھے۔ ان میں سے بو بھی آنے لگی تھی۔ چند ایک دن چنگیریں آتی رہی تھیں پھر ان میں ناغے آنے لگے اور سب سے بڑا ناغہ وہ دن تھا آیا۔ اسے مانگنے کی عادت نہیں تھی۔ مطلب اسے معلوم نہیں تھا کہ مانگنا بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔

گاؤں والیوں میں یہ چہ میگوئی شروع ہو چکی تھی کہ

"تو بے کس نے تو دو دن پہلے بھی دی تھی میں کیوں دوں۔ میں تو آدھ سیر دودھ لیا کرتی تھی آدھی بالٹی بھر بھر لے جایا کرتی تھی۔"

"میری بالٹی تیری سدا کی نظر تھی تو بھی بھر لیا کرتی بالٹی پر تو کر لی کیا' وہ بھری ہوتی کوئی منا منی' دولی تو بالٹی بھرتی نا۔ ہونہہ۔"

اب گاؤں بھر میں یہ قصہ شروع ہو چکا تھا کہ "میں تو

یہ دو بوند دودھ ہی لے کر جایا کرتا تھا۔ سارا دودھ تو تم لیا کرتے تھے۔ گائے سے اصل فائدہ تو تم نے لیا۔ جس نے فائدہ لیا وہ سنبھالے اس مستانے صدری کو۔ ہم کیا جانیں۔

صدری جب بھوک سے مرنے کے قریب ہو گیا اور بانی پی پی کر تھک گیا تو ہمسائی خالہ کے گھر گیا۔ اس نے ماتھے پر بل ڈال کر بچے کھچے روٹی کے ٹکڑے پکڑا دیے۔ صدری نے کھا لیے۔ اسے کیا فرق نہیں پڑا تھا کہ روٹی کے ٹکڑے سوکھے تھے اور نگلے نہیں جاتے تھے۔ یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ صدری مست لوگ سا تھا، بالکل دیوانہ نہ تھا۔ بس وہ دنیا میں رہ کر دنیا دار نہ تھا۔ اور ایسا کوئی باقاعدہ ولی صوفی بھی نہ تھا۔

اگلی دو روٹیاں بھی ماتھے پر بل ڈال کر دی گئیں اور پھر جب وہ چوتھی بار گیا تو خالہ حمیداں نے کہا۔

"مائی نوروالی کے پاس جا۔ اسے کہہ وہ تجھے کام پر رکھ لے۔ روز کے تین روپے دے گی اور روٹی بھی۔"

وہ بات تو نہ سمجھا لیکن انداز پر چپ سا ہو گیا اور گیلی مٹی کی طرح ڈھیر سا چلنے لگا۔ چنگیر کو اس نے خالہ حمیداں کی دہلیز پر ہی چھوڑا اور کتے کو لے کر گاؤں سے دور چلا گیا۔ وہ دن کسی نے اسے گاؤں میں نہ دیکھا جب وہ واپس آیا تو مکمل طور پر چپ تھا جیسے وہ دن کا چلہ کاٹ کر آیا ہو۔ اب وہ کلام فرید بھی نہ پڑھتا۔ جوہڑ کے پانی میں پیر ڈبو کر بھی نہ بیٹھتا نہ غلیل سے چڑیوں کو پھر اڑاتا۔ وہ انسانی نظروں کی پہنچ سے دور کسی درخت تلے چپ چاپ بیٹھا آسمان تکا کرتا۔ وہ ایسا ہو گیا تھا جیسے کسی استاد کے دیے سبق پر عمل پیرا ہو۔

اس نے گھر کا پھاٹک پھر سے کھول دیا تھا جیسے سرائے کے پھاٹک وا رہتے ہیں۔ آتے جاؤ۔ جاتے جاؤ۔ یہاں قیام ممکن نہیں۔ یہ خیال بھی ممکن نہیں۔

دن میں ایک بار گاؤں کے آخری کنارے لگے شہتوت کے درخت سے شہتوت توڑ کر کھا لیتا۔ اور

گاؤں والوں میں سے چند ایک نے غور کیا کہ درخت پر روز اتنے ہی شہتوت ہوتے ہیں جتنے اس نے کھانے ہوتے ہیں۔ اس منظر سے ان میں تھوڑی بے چینی سی پھیلی۔ اس کے باپ کی دعاؤں سے کئی بے اولادوں کو اولاد ملی تھی۔ کئی مرتوں کو شفا نصیب ہوئی تھی۔ وہ اسی باپ کا بیٹا تھا۔ پر بھوکا تھا۔ اور یہ کہ گائے مر چکی تھی اور اب صدری کسی کے کام کا نہیں تھا۔ نہ وہ دعا دیتا تھا نہ اس پر خدائی انعام "شیاما" کی صورت نازل ہو رہا تھا۔ تو وہ ان کے کام کا کیسے ہوتا۔ وہ ان کے لیے کش (خشک بھوسہ) بھی نہ رہا جسے پھونک مار کر اڑا دیا جاتا۔ گائے کا مالک ہونے کی وجہ سے کبھی وہ ان کی ترازو (جس پر رائج معیار ایسے تلتے ہیں) رہا تھا اب تو وہ جوتے کے تلے سے گیا گزرا تھا۔

ڈھور ڈنگروں میں بیماریاں پھوٹیں اور ایک ایک کر کے گھر کے گھر ان سے خالی ہونے لگے۔ قطرہ قطرہ دودھ بیچ دینے والوں کے گھروں میں پہلے فاقے شروع ہوئے۔ کھیت کھلیان والوں کی فصلوں پر بارشوں اور کیڑوں نے یلغار کی۔ کچھ کی ادویات کے بے جا استعمال سے فصلیں ہی زہریلی ہو گئیں۔ محکمہ خوراک نے اپنی نگرانی میں ایسی فصلوں کا اناج تلف کروایا۔

گاؤں میں باقاعدہ قحط نہ آیا اور قحط آ بھی گیا۔ اور انہیں یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ یہ سب ہوا کیونکر۔ فصلیں اچھی کیوں نہیں ہو رہیں۔ مویشی خرید خرید لا رہے ہیں تو وہ بیماری سے مرتے کیوں جا رہے ہیں۔ ساری جمع پونجی ان ہی کاموں میں نکل رہی ہے۔ آل اولاد بیمار رہنے لگی ہے۔ دوسری آفات الگ سے... بھوک ہے کہ مٹائے نہیں مٹ رہی... غربت ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ کیسی آفت آئی ہے... یہ کیسا کال پھوٹا ہے گاؤں میں...

گاؤں کے مرد شہروں کی طرف کام کاج کے لیے بھاگے لیکن جتنا وہ کما کر لاتے اس سے دو وقت کی روٹی پوری نہ ہوتی۔ گاؤں سے جیسے برکت ہی اٹھ گئی... ڈھور ڈنگروں کی خریداری کے لیے لیے گئے قرض جان کو آنے لگے۔

ایک شام چوپال میں بیٹھے چند لوگوں کو صدری نظر آیا۔ اپنے کتے کے ساتھ وہ گاؤں کے پچھواڑے جا رہا تھا۔ لوگوں کو اس پر بڑا رشک آیا کہ دیکھو نہ فکر نہ فاقہ۔۔ ایک سیانے کو ایسے ہی سوچ سی آگئی۔

"یہ کھاتا پیتا کہاں سے ہے؟؟"

"ہاں... یہ کھاتا کیا ہے کہ ہم اتنا ہلکان ہو کر بھوکے مر رہے ہیں۔" دوسرے نے کہا۔

ان چند کو اس پر حسد سا آیا اور انہوں نے صدری کی کھوج لگائی۔

"یہ بیر کھاتا ہے اور ایک وقت کھاتا ہے۔۔ اس کا باپ ولی تھا۔ شاید اس میں کوئی کرامت ہو۔۔ دیکھو کیسے ہٹا کٹا ہے۔۔ کبھی بیمار بھی نہیں ہوتا۔۔"

جن چند لوگوں نے کھوج لگائی تھی۔ انہوں نے درخت سے سارے بیر توڑ کر کھا ڈالے اور درخت ایسے خالی سا ہو گیا جیسے صدیوں اس پر پھل نہیں لگا۔۔ صدری پھر کبھی اس بیر کے درخت کے پاس نظر نہ آیا۔ لوگوں کو پھر کھوج لگی کہ وہ کیا کھا کر زندہ ہے۔

آخر۔۔ کھوجا اور جانا کہ وہ درختوں کے پتے کھاتا اور پانی پیتا ہے....

ان سب سے درختوں کے وہ پتے کھائے نہ گئے.... زعفران ملا دودھ پیتے رہے تھے' کیسے صرف پتے کھا لیتے۔

✡ ✡ ✡

جاڑا شروع ہوا تو گاؤں کی کمہارن کے گھر اس کی ماں کئی سالوں بعد آپائی.... وہ تو گھر اور گاؤں بھر میں بچھا قحط دیکھ کر حق دق رہ گئی... اسے خبر ملی کہ شاپایا بھی کب کی مر گئی۔ اور بابا محکم الدین تو اس سے بھی پہلے کا۔۔

"اور اس کا بیٹا صدری۔۔؟؟"

"وہ بھی یہیں کہیں ہوتا ہے۔"

"اپنے باپ پر گیا ہے نا...؟؟"

"نہیں۔۔ باپ پر کہاں.... آوارہ گھومتا رہتا ہے۔"

"ہے تو محکم الدین کا خون ہی نا۔۔ جس کے گھر وہ کراماتی گائے آئی تھی۔۔"

"بھاڑ پڑے" "میں کیا۔۔"

اماں نے چار دن سوچ بچار کی۔۔ عورتوں اور بچوں نے تو جیسے کئی زمانوں سے پیٹ بھر کر نہ کھایا تھا۔۔ جو تھوڑا بہت ہوتا' وہ پہلے مردوں کو کھلایا جاتا کہ مزدوری کرنے جو جاتے تھے۔

کمہارن کی ماں نے ایک دن بیٹی اور اس کے بچوں کو بھوکا رکھا اور چنگیر کو اچھے سے سجا کر صدری کے کھلے پھاٹک کے گھر پر رکھ آئی۔

"میں کیوں کھلاؤں اس نکمے آوارہ کو روٹی؟"

"چپ رہ۔۔ کچھ اثرات اس کے باپ نے ضرور اس میں چھوڑے ہوں گے۔"

چنگیر رکھ کر اماں رات کے پہلے پہر تک اس کا انتظار کرتی رہی پھر گھر آ کر دیوار کے اس طرف سے اس طرف نظر رکھی کہ کوئی کتا بلی روٹی نہ لے اڑے۔

صدری آیا۔۔ اور کمرے میں جا کر دروازہ بھیڑ لیا۔ چنگیر طاق میں رکھی رہ گئی۔ اماں دیوار پھلانگ کر کھلے پھاٹک سے اندر گئی اور طاق سے چنگیر اٹھا کر دروازہ دھڑ دھڑانے لگی۔

"سائیں صدری.... صدری سائیں! روٹی کھا لے۔"

صدری سائیں نے کوئی جواب نہ دیا۔۔ کمہارن نے طنز سے ماں کو دیکھا لیکن اماں کافی دیر تک دروازہ بجاتی رہی... بہت دیر بعد اندر سے آواز آئی۔

"کسی بھوکے کو کھلا دے مائی۔۔ اللہ بھوکوں کا پیٹ بھرے۔"

اماں کی باچھیں کھل اٹھیں۔ گھر آ کر سب نے مل کر روٹی کھائی۔ اگلے دن صبح ہی صبح اس کا جیٹھ جو دور کے گاؤں رہتا تھا' اناج کی دو بوریاں اور گھی کے کنستر لے کر آ گیا تھا۔ یہ وہی جیٹھ تھا جس کے پاس کمہار ادھار لینے گیا تھا تو اس نے اپنی ٹوٹی چپل آگے کر دی تھی کہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔۔ میں تو خود بھوکوں مر رہا ہوں۔"

اب کمہاون وو وچنگیر میں روٹی رکھ آئی۔ اگلے دن چنگیر اٹھالاتی' روٹی جوں کی توں ہوتی' سارا گاؤں بھوکا مرتا ہو اور ایک گھر میں گھی کے کنستر رکھے ہوں تو یہ بات جچتی ہے؟

منہ اندھیرے کئی پڑوسنوں نے کمہارن کو صدوکی کے گھر سے چنگیر اٹھالاتے دیکھا۔ اس سے پوچھا تو وہ ٹال گئی۔

مل ملا کر سب نے سوچا کہ ضرور اس میں کوئی راز ہے اور وہ سب مل کر کمہاون کے گھر گئیں۔ جیسے تیسے انہوں نے کمہاون سے اگلوالیا۔ اور پھر دن بھر بھوکا رہ کر صدوکی کے لیے اچھا سا سالن بنایا' دہی جمایا۔ روٹی پکائی اور چنگیر سجا کر سب احاطے میں رکھ گئیں۔ کوئی پانچ سات گاؤں والیاں۔ کیونکہ ان سب کا ماننا تھا کہ صدوکی بھی ولی کا درجہ پا گیا ہے اور اس کی دعا سے اب سب کچھ بدل جانے والا ہے۔ ان کے بھوکے پیٹ بھر جائیں گے اور ان کے قرضے اتر جائیں گے۔ اور ان کی فصلیں سونے کے بھاؤ بکیں گی۔ بس سب ٹھیک ہو جائے گا۔

چنگیریں رات بھر صدوکی کے احاطے میں پڑی رہیں۔ صبح ہونے ہی وہ اپنی چنگیریں اٹھا کر لے گئیں۔ انہیں بھی ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا۔ پر ان کے حالات تو جوں کے توں رہے۔

"تو نے ہمیں پوری بات نہیں بتائی۔" وہ کمہارن پر چڑھ دوڑیں۔

"جب وہ کہے گا کہ اللہ بھوکوں کا پیٹ بھرے تب سب بدلے گا۔"

اس دوران گاؤں بھر میں اتنی چہ مگوئیاں ہو چکی تھیں کہ سب کو کمہارن کا قصہ معلوم ہو چکا تھا۔ جس صدوکی کو آوارہ اور نکما کہا جاتا تھا اب اس کا نام عقیدت سے لیا جاتا۔

جس دوران صدوکی کو باعث عقیدت بنایا جا رہا تھا اسی دوران صدوکی گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں والوں کی جیسے جان ہی نکل گئی۔ یہ کیا ہوا ان کی تو امید ان کا نفع کہاں گیا۔

لڑکے صدوکی کی تلاش میں دوڑائے گئے۔ عورتیں خود بھی نکلیں اسے ڈھونڈنے۔ کئی سالوں سے جس کا آنا جانا نہیں ہوا کرتا تھا کہ کہاں ہے کس حال میں ہے۔ سارے گاؤں کو ایک دم سے اس کا حال معلوم کرنے کا بخار چڑھا۔ جیسے گاؤں میں شبا شبا ہوا کرتی تھی ویسے ہی صدوکی صدوکی ہونے لگی۔

"وہ کسی دوسری جگہ جا آباد ہوا ہے۔ انہیں فیض یاب کرے گا۔" کمہاون نے کہا۔

"ہائے منہ والی۔" کمہاون کی بات جس جس نے سنی' بڑبڑا کر رہ گئی۔

گاؤں والوں نے تڑپ تڑپ کر رات دن گزارے۔ یہ کیا ہو گیا ان کے ساتھ' صدوکی کہاں چلا گیا۔ ان کا نمک کھا چکا' نمک حرام کر گیا۔

☼ ☼ ☼

ایک شام گاؤں میں خبر پھیلی کہ صدوکی آچکا ہے اور اپنے گھر ہے۔

سب اس کے گھر کی طرف بھاگے' ڈھول مٹی سے اٹے احاطے میں کھڑے ہو گئے۔ اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ کئی ایک نے دروازہ بجایا اسے آوازیں دیں' لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

"اسے تنگ نہ کرو۔ ورنہ وہ بددعا دے دے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ سب واپس چلے گئے' البتہ اپنے پیٹ سے نوالے صدوکی کے لیے احاطے میں چھوڑ گئے۔ اگلا دن آیا۔ صدوکی کمرے سے باہر نہ آیا۔ نہ ہی اس کا کھانا۔ عورتیں اپنی چنگیریں واپس اٹھالائیں۔ شام تک انتظار کیا لیکن دروازہ نہ کھلا۔

رات ہونے لگی۔ گاؤں والیوں نے دل لگا کر سالن بنایا' روٹی پکائی اسے سلیقے سے چنگیر میں سجایا اور لالٹین ہاتھ میں پکڑ کر صدوکی کے گھر کی طرف چلیں' سب ازراہ ہمدردی' ازراہ رحم ایک دوسری کو اکسا کر رہی تھیں کہ تو مل کر خوش حالی لے کر آئیں صدوکی سے۔ وہ ایک ولی کو جتاتے' وہ ہمیں خالی ہاتھ نہیں

لوٹائے گا۔ ہماری جھولیاں بھر کر بھیجے گا۔

گلیوں سے ' نکڑوں سے ' گھروں سے چنگیریں اور لالٹینیں نکلتی آرہی تھیں۔ جیسے میلہ چراغاں میں اپنے اپنے چراغ رکھنے جارہے ہوں۔ سب کے سب پرامید صدری کے گھر کی طرف جارہے تھے' وہی گھر جہاں وہ منوں بان لے جایا کرتے تھے اور محکم الدین کو اجرت نہیں دیا کرتے تھے وہی گھر جہاں شیابا تھی اور جس کے دودھ کو انہوں نے سالوں پیا تھا۔ اور وہی گھر جہاں انہوں نے چنگیریں بھجوائی' چنگیریں رکھنی چھوڑ دی تھیں۔ آج چنگیریں اٹھائے عقیدت سے جارہے تھے.... سب احاطے میں اکٹھے ہو گئے اور دروازہ دھڑ دھڑانے لگے۔ عورتوں کے ساتھ ان کے مرد بھی تھے۔

"آج دروازہ کھلواؤ.... صدری کو باہر لاؤ.... ورنہ ہم بھوکے مرجائیں گے۔" ایک عورت نے روتے روتے کہا۔

"وہ سائیں ملوک اپنی لو میں لگا ہوگا۔ اس کی لو تھوڑی دیر کو توڑ دو۔"

دروازہ زور و شور سے بجایا جانے لگا' ساتھ آوازیں دی جانے لگیں.... لیکن دروازہ نہ کھلا۔ خیر دھکے مار کر دروازہ جھٹکے سے کھول لیا گیا کہ وہ تو خدا سے لو لگائے بیٹھا ہوگا' کہاں کانوں میں آواز جاتی ہوگی۔

ہاں وہ لو لگائے ہی بیٹھا تھا.... زمین پر بچھی صف پر چت ساکت لیٹا تھا جیسے زندہ نہ ہو۔ اس کا کتا اس کے پیروں میں منہ دبے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ دروازہ کھلنے اور ایک دم سے ہجوم کے آنے پر بھی اس کتے نے کوئی جنبش نہ کی۔ جیسے اسے بھی معلوم تھا کہ آگے کیا ہونا ہے۔

"صدری بابا!" سب اس پر جھکے۔ اس نے آنکھ نہ کھولی۔ اس کا منہ سوجا ہوا تھا' اس کا پورا جسم سوجا ہوا تھا۔ اس کی انگلیوں کے ناخن نیلے پڑ رہے تھے' اس کا جسم آگ کی حرارت دے رہا تھا.... یہ اس کے جسم کا حال تھا لیکن اس کی بند آنکھوں کے کٹھرے پر ابدی اطمینان تھا۔ جو اس کے باپ کے چہرے پر رہا

کرتا تھا۔ نہ بے چینی نہ بے سکونی اور نہ ہی تکلیف.... اس کے وجود کی بدلی ہوئی ہیئت سے الگ صدری ایسے تاثر کی نشاندہی کر رہا تھا جیسے وہ کسی من پسند ہنڈولے میں بیٹھا جھول رہا ہو.... یا جن پرندوں کو وہ تکا کرتا تھا وہ سب اسے مل کر اٹھائے اپنے ساتھ پرواز پر لیے جا رہے ہوں....

"اس نے کوئی زہریلی چیز کھائی ہے۔" کبھی کھیتوں کے مالک رہ چکے غفورے نے اس لعاب کو سونگھتے ہوئے کہا جو اس کے منہ سے نکلا تھا۔ "لیکن یہ زندہ ہے۔"

"ہاں۔ اس کی سانسیں چل رہی ہیں۔"

صدری کے منہ میں چند بوندیں پانی ٹپکایا گیا۔ اس دوران کتا ویسے ہی اس کی ٹانگوں سے لپٹا پڑا رہا۔

صدری نے آنکھیں کھولیں۔

"یہ مر رہا ہے.... اس کا جسم پھول چکا ہے۔ ہاتھ پیر دیکھو کیسے نیلے ہو گئے ہیں۔"

گاؤں والوں کو سانپ سا سونگھ گیا۔ اگر یہ ایسے مر گیا۔ ایسے ہی۔ اس کا سر اٹھا کر اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ واپس صف پر بچھ گیا۔

"سب مل کر کہو کہ صدری بابا ہمیں دعا دو.... ہماری مصیبتیں ختم ہو جائیں' کھیت ہرے بھرے ہو جائیں' بیماریاں ختم ہو جائیں۔ اس سے کہو کے اللہ بھوکوں کے پیٹ بھرے۔"

سب مل کر یک زبان یہ مناجات کرنے لگے۔

"صدری بابا کہو اللہ بھوکوں کے پیٹ بھرے۔ صدری بابا۔ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے' ہمارے حال دیکھو.... ہماری مصیبتیں دیکھو۔ رحم کرو۔ کہو اللہ ہم پر رحم کرے۔"

کمرے میں سارا گاؤں جمع تھا۔ باقی کا ہجوم احاطے میں اکٹھا تھا۔ یک زبان سب دہرا رہے تھے۔ صدری کے منہ میں دو بوندیں اور ٹپکائی گئیں۔ اس نے ایک بے غرض سی نظر ذرا سی بس ذرا سی آس پاس گھمائی جیسے اس تک آنے والے فرشتوں کو راستہ نہ دیا جا رہا ہو۔ اور وہ انہیں تلاش کر رہا ہو۔

چند عورتوں نے سسکیوں کے درمیان دبی دبی چیخیں ماریں کہ یہ مر گیا تو اگر یہ دعا دیے بنا مر گیا تو۔

صدری کے گھر میں کئی لالٹینوں اور چنگیروں کا ڈھیر لگا تھا۔ ڈھیر حضرت انسان کا بھی لگا تھا۔ مخلوق کے نام پر وہاں مٹی کے بت کھڑے تھے۔ وہ پیٹ والے تھے اور ان کے پیٹ کبھی نہ بھرنے والے تھے وہ مخلوق کے پہلے درجے پر بنائے گئے تھے' وہ خود کو اس درجے تک لے گئے تھے جہاں بدتر درجے کی مخلوق بھی نہیں ہوتی۔۔۔ وہ اپنے درجے میں ثانی تھے۔ اپنے اوصاف میں وہ باکمال تھے۔

"صدری بابا! خدا کا واسطہ ہے کہ دے اللہ ہمارے پیٹ بھرے۔ صدری بابا۔" عورتیں زور زور شور سے چلانے سی لگیں۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ اس کے حلق میں گھس کر خود یہ کہہ ڈالیں۔۔۔ اور اس کی جان کو مٹھی میں کر لیں کہ پہلے کہہ پھر تیری جان نکلے گی۔"

عرش و فرش پر موجود آنکھ والے اس تماشے کو دیکھتے ہوں گے۔ قومیں کیسے عذاب کی مستحق قرار پاتی ہیں۔۔۔ بستیاں کیسے زمین میں دھنسا دی جاتی ہیں۔ اس تماشے کو دیکھ کر جانا جا سکتا تھا۔

ایک عورت نے آگے بڑھ کر اس کے گال پر دونوں ہاتھ مار کر کہا۔ "صدری۔ بول۔ بولتا کیوں نہیں۔ بول!!"

صدری نے جیسے آخری بار آنکھیں کھول کر ان سب کو دیکھا۔

"رخ۔ خدا۔۔۔ بھوکوں۔ کے۔ پیٹ کبھی نہ بھرے۔"

اس سے بڑھ کر دعا کوئی نہ تھی۔ اس سے بڑھ کر بد دعا کوئی نہ تھی۔ کمرے کی چھت پر موجود بلیوں نے ایک دم سے رونا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں' جانور موت کی بو سونگھ لیتے ہیں۔ اور موت سے پہلے رونے لگتے ہیں۔ لیکن وہ پہلے نہیں بعد میں روئیں۔۔۔ وہ صدری کے لیے نہیں صدری کے گاؤں والوں کے لیے روئیں۔ کتا اٹھا اور گھر سے باہر۔ گاؤں سے باہر چلا گیا۔ عرش پر جیسے فرشتوں کو نئے احکامات لکھوائے گئے۔

"اناج کے دریا بہا دو۔ کھیت کھلیان ہرے بھرے رکھو۔ بیماری اور دکھ تکلیف سے کسی کا واسطہ نہ رہے۔ ان کے پیٹ بھرے رہیں اور انہیں اور بھوک لگتی رہے لیکن انہیں اور اور ملتا رہے۔ انہیں سب ملتا رہے۔۔۔ کسی بھی غرض کو لے کر انہیں میرے دربار نہ آنا پڑے۔ ان کے ہاتھوں کو حاجات کے لیے اٹھنے سے پہلے ہی ان کی جھولیاں بھر ڈالو۔ اور پھر ان پر مہر لگا دو۔ اللہ ان سے بے زار ہے۔"

اور پھر' گاؤں پاساں' شاد اور آباد ہو گیا۔ اس کی خوش حالی نے دنیا والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔۔۔ انہیں یاد نہ رہا کہ انہیں کب ہاتھ اٹھا کر مانگنے کی حاجت پیش آئی تھی۔۔۔ آخری بار کب۔

اور آخری بار کب کسی فقیر' ولی' صوفی کا اس گاؤں سے گزر ہوا تھا۔ شاید زمانے بیت گئے۔۔۔ وہ یہ جان نہ سکے کہ بزرگوں' ولیوں' صوفیوں' قطب' پرہیزگاروں' فقیروں میں یہ منادی کروا دی گئی ہے۔۔۔ کہ وہ' گاؤں پاساں سے اپنا گزر نہ کریں اور اس سے منہ پھیر لیں۔۔۔ اور اسے اپنی پشت دکھا دیں۔ کیونکہ وہ مہر ثبت ہیں اور اللہ ان سے بے زار ہے۔

نمرہ احمد

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ فارس غازی اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف فارس غازی کا بھانجا ہے جو اپنے ماموں فارس غازی سے ملنے جیل میں ہر ہفتے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں۔ ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعدی یوسف کی والدہ نے کڑی مشقت کر کے بچوں کی پرورش کی ہے۔ حنین اور اسامہ، سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر، سعدی

مکمل ناول

یوسف کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجے میں بیوی مرجاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ فارس غازی، سعدی یوسف کا ماموں ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے، جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کاردار کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔ ہاشم سونیا کی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

فارس غازی، ہاشم کاردار کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے، رہائش پذیر تھا۔ فارس غازی کے جیل جانے کے بعد اس کا پورشن مقفل ہے۔

سعدی یوسف کے لیے وہ دن خوشیوں سے بھرپور تھا جب اسے فارس غازی کے رہا ہونے کی خبر ملتی ہے۔

ہاشم نے یہ خبر سن کر عہد کیا کہ اگر اس میں سعدی کا ہاتھ ہے تو اسے اس کا حساب دینا ہوگا۔ فارس غازی جیل سے نکلتا ہے تو سعدی یوسف ان کا منتظر ہوتا ہے۔ فارس اس سے قبرستان چلنے کو کہتا ہے۔ قبرستان جا کر فارس دو قبروں پر فاتحہ پڑھتا ہے۔ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے سعدی کا موبائل لے لیتا ہے۔ قبرستان میں وہ کسی کو فون کر کے کوئی ہتھیار منگواتا ہے۔

ہاشم کاردار، زمر کو اپنی بیٹی سونیا کی سالگرہ کا کارڈ دینے کے ساتھ سعدی کا کارڈ بھی زمر کو دے دیتا ہے۔

زمر کے والد کو اپنے پوتے سعدی یوسف سے بہت محبت ہے۔ وہ زمر سے کہتے ہیں، سعدی کی سالگرہ ویش کرنے ان کے گھر جائے۔ وہ پھول لے کر کارڈ دینے سعدی کے گھر جاتی ہے۔ زمر کو دیکھ کر سعدی کے ساتھ تمام گھر والے حیران ہو جاتے ہیں۔ زمر، سعدی کو سونیا کی سالگرہ کا کارڈ دیتی ہے۔

زمر کے جانے کے بعد سعدی نے ہاتھ میں پکڑے سیاہ اور سنہرے کارڈ کو دیکھا۔ اسی وقت ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملایا۔ اس نے ہوٹل میں ہاشم کے لیپ ٹاپ پر فلیش ڈرائیو لگایا تھا۔ وہ اس کے لیپ ٹاپ سے ڈیٹا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سعدی نے جب بیگ سے ٹیبلٹ نکالا تو اسے پریس کرنے کے بعد اسکرین پر پیغام آیا کہ آپ کی ڈیوائس کو ایک ہارڈ ڈرائیو ملی ہے۔ کیا آپ سارا ڈیٹا کاپی کرنا چاہیں گے؟ سعدی نے مسکراتے ہوئے "یس" دبایا۔ اسکرین پر دوسرا پیغام دیکھ کر سعدی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

اسکرین پر پیغام جل بجھ رہا تھا کہ "پاس ورڈ داخل کریں" سعدی کے پاس پاس ورڈ نہیں تھا۔

سعدی یوسف، ہاشم کاردار کی سابقہ بیوی شہرین سے ایک شاپنگ مال میں مل کر کہتا ہے۔ "مجھے آپ سے ہاشم بھائی کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ چاہیے۔" شہرین، سعدی سے کہتی ہے کہ "تم کیا کرنے جا رہے ہو؟" سعدی زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے کہ "ہاشم بھائی نے جو ہم سے چرایا تھا، میں وہ واپس چرانے جا رہا ہوں۔"

شہرین نوشیرواں کے پاس جا کر کہتی ہے کہ سونیا کو اس کی اور ہاشم کی ان سین پکچرز چاہئیں۔ یہ جھوٹ بول کر نہایت چالاکی سے شہرین نوشیرواں سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

حنین یوسف پر اس کی دوست کی وجہ سے کمرۂ امتحان میں نقل کا الزام لگتا ہے۔ ٹیچرز حنین سے کہتی ہیں کہ اس پر کیس بنے گا اور وہ تین سال تک پیپرز نہیں دے سکتی۔ وہ حنین کو آفس میں بٹھا کر چلی جاتی ہیں تو حنین کی نظر میز پر سپرنٹنڈنٹ کے پرس کے ساتھ رکھے موبائل پر پڑتی ہے۔ حنین موبائل اٹھا کر دھڑکتے دل سے ہاشم کا نمبر ملا کر اسے تمام صورت حال

سے آگاہ کرتی ہے۔ ہاشم کچھ دیر بعد ہی امتحانی مرکز میں پہنچ جاتا ہے اور کمال ہوشیاری سے حنین کو مشکل وقت سے نہ صرف نکلواتا ہے بلکہ حنین کو پیپر مکمل کرنے کے لیے تجربے سے ایکسٹرا ٹائم بھی دلواتا ہے۔

پیپر دینے کے بعد حنین ہاشم کا شکریہ ادا کرتی ہے اور ہاشم سے کہتی ہے کہ سعدی بھائی کو اس معاملے کے بارے میں مت بتائیے گا۔ ہاشم حنین سے پارٹی میں آنے کا پوچھتا ہے جس پر حنین کہتی ہے کہ پارٹی میں ہم سب آئیں گے۔

قصر کے سبزہ زار میں سیاہ شام سنہرے تاروں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ روشنیاں گنتے، سیاہ اور سنہری امتزاج سے سجی سونیا کی سالگرہ کی تقریب کی رونق عروج پر تھی۔

حنین سنہری فراک میں جبکہ سعدی، اسیم اور زمر سیاہ سوٹ میں ملبوس تقریب میں شریک تھے۔ شہرین ان کی میز کے پاس آکر زمر کو زمی اے کہہ کر پکارتی ہے اور سعدی سے رسمی سا حال احوال پوچھ کر کمال مہارت سے فیب پکڑا کر وہاں سے چلی جاتی ہے۔ سعدی فیب کو کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر سوچتا ہے کہ آدھا کام ہو گیا مگر ابھی پاس ورڈ لینا باقی ہے۔

جواہرات دو تین خواتین کے ساتھ سعدی اور زمر کی میز کی طرف آتی ہے۔ جواہرات اپنی فرینڈز سے زمر کا تعارف کرواتی ہے پھر سعدی یوسف کا تعارف بھی کروا کر سعدی سے کہتی ہے کہ وہ اپنا شجرہ نسب ان خواتین کو بتائے۔ نوشیرواں قدرے فاصلے پر کھڑا تند نظروں سے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ سعدی سمجھ جاتا ہے کہ جواہرات اس وقت نوشیرواں کی بے عزتی کا بدلہ اتار رہی ہے پھر سعدی اپنا شجرہ نسب ایسا بتاتا ہے کہ جس سے نوشیرواں کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور جواہرات کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ اسی دوران جواہرات اپنی فرینڈز سے زمر کے سابقہ منگیتر حماد کا ذکر چھیڑ دیتی ہے جس کی وجہ سے زمر مضطرب ہو جاتی ہے۔

شہرین بڑی ہوشیاری سے سعدی کو پاس ورڈ بتا رہی ہے۔

دوسری جانب زمر کا گیسٹ روم میں فارس سے سامنا ہو جاتا ہے فارس کو دیکھ کر زمر غصے میں باہر کی طرف آجاتی ہے۔

پاس ورڈ ملتے ہی سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکیورٹی آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے۔ ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے لیکن سعدی پکڑ میں آئے بغیر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہاشم غصے میں خاور سے کہتا ہے کہ سعدی جیسے ہی ایگزٹ پر پہنچے اسے روکو۔ جبکہ ملازمہ فیروزہ ہاشم کے کہنے پر جان بوجھ کر سعدی سے ٹکراتی ہے اور اس کے کوٹ میں نیکلس ڈال کر معذرت کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔

جیسے ہی زمر، سعدی، حنین اور اسیم گھر جا رہے ہوتے ہیں تو خاور انہیں روک کر بتاتا ہے کہ مسز جواہرات کا نیکلس چوری ہو گیا ہے۔ زمر غصے میں خاور سے کہتی ہے کہ یہ میری فیملی کے بچے ہیں ان کی تلاشی لینے سے پہلے میری تلاشی لینا ہو گی۔ اسی دوران ہاشم بھی وہاں آجاتا ہے اور بگڑتی صورت حال دیکھ کر انہیں جانے دیتا ہے۔

ریسٹورنٹ کا بل دینے کے لیے سعدی حنین سے اپنے کوٹ سے والٹ نکالنے کو کہتا ہے حنین کے ہاتھ میں والٹ کے بجائے نیکلس آجاتا ہے۔ زمر کی نگاہیں نیکلس کو دیکھ کر ٹھہر جاتی ہیں۔ زمر غصے میں سعدی کو کہتی ہے اسے گھر ڈراپ کر دے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔

دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے شوٹ کروا دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

زمر سعدی کے ریسٹورنٹ جاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ بڑے ابا نے اسے بتا دیا ہے کہ اسے گروہ کی کسی خاتون نے نہیں بلکہ اس نے مروایا ہے۔ اسی دوران فارس وہاں آجاتا ہے جسے دیکھ کر زمر نفرت آمیز نگاہ فارس پر ڈال کر وہاں سے چلی جاتی ہے۔ سعدی بہت دنوں بعد آفس جاتا ہے اور وہاں باس سارہ کو فیلڈ رپورٹ دے کر کہتا ہے کہ اس نے کام مکمل کر لیا ہے اور فیلڈ پہ جانے کی تیاری بھی مکمل کر لی ہے۔

کوئی نہیں ہے پھپھو کے لیے۔" اس نے ناک سکیڑ کر منہ بنایا۔

"ہاں مگر سیم کی اپنی جگہ ہے۔" زمر نے سیم کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"بھائی میسا کوئی کیوں نہیں ہے؟"

"اس لیے سیم کہ جب سعدی تم جتنا تھا تو میں تمہاری بھتیجی تھی اور ہم بہترین دوست تھے۔ ہمارا اسکول بھی ایک تھا اور اسکول جانے سے پہلے اپنے اپنے گھر سے ہم ایک ہی کارٹون دیکھ کر آیا کرتے تھے۔ ہمارے زمانے میں صبح سات بجے پی ٹی وی پہ کارٹون لگا کرتے تھے۔"

سعدی بولی بالکل اس لیے رایس کرسی پہ آ بیٹھا۔ حنین خاموشی سے عدوت کے ساتھ برتن اٹھوانے لگی۔ کھانا کھایا جا چکا تھا اور وہ مزید زمر کے قریب نہیں بیٹھنا چاہتی تھی۔

"اور ہمیں گیمز بھی ایک ہی طرح کی پسند تھیں زمر!" سعدی یاد کر کے مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔

"ہم برف پانی، اونچ نیچ، پکڑن پکڑائی، ٹیلو ایکسپریس کھیلا کرتے تھے اور ہاں ہم لنگڑی، اور ڈارک روم اور کونا کونا بھی۔"

"اور وہ ویڈیو گیم یاد ہے پنج والی سعدی؟ ڈک ہنٹ؟ ہم پستول سے ٹی وی اسکرین پہ فائر کیا کرتے اور اڑتی ہوئی بطخیں گر جاتیں۔" حنین نے ایک دم سر اٹھایا میز صاف کرتے ہاتھ رکے۔

"وہ پستول ابھی بھی پڑی ہے ہمارے پاس!" بے اختیار وہ کہہ اٹھی۔ اس پہ زمر نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ ایک دم جلدی جلدی اپنا کام ختم کرنے لگی۔

"اور اس میں سپر ماریو بھی تھی اور لینکس والی ایک گیم بھی اور پھپھو! یاد ہے ہم گھنٹوں بیٹھ کر monopoly کھیلا کرتے تھے۔ مگر میں مونوپلی میں ہمیشہ دیوالیہ ہو جاتا تھا کیونکہ پھپھو اتنی اچھی پلیئر تھیں کہ ساری بہترین زمینیں خرید لیتیں اور میں ٹھہرا جذباتی اور ناکام پلیئر، میری گرنٹ جیل میں ہی پھنسی رہتی۔"

اور سعدی وہ ایک کارڈز گیم بھی تو ہم کھیلتے تھے رنگ برنگے کارڈز تھے جن پہ نمبر لکھے ہوتے تھے۔" زمر نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ حنین دوبارہ آئی تھی چہرے سے خوب قابو نہ رکھ سکی۔ بنا سوچے سمجھے بولی۔

"وہ اونو (ONO) تھی۔ ہمارے پاس ابھی بھی پڑی ہے۔"

"اچھا واقعی! تمہیں وہ بہت پسند تھی حنین' مجھے یاد ہے۔ اور تمہیں امریجر' اگرچہ کٹر ٹائپ کی گیمز بھی بہت پسند تھیں۔" زمر اب رخ بالکل حنین کی طرف موڑ کر بولی تو حنین کے لبوں پہ ایک بھولی بسری مسکراہٹ آٹھہری۔

"اور آپ کو عینک والا جن بہت پسند تھا۔"

"خیر مجھے تو نستور پسند تھا اور نستور کے بارے میں' میں اپنی فیلنگز چھپانے کی بالکل قائل نہیں ہوں۔" حنین کی مسکراہٹ اور بھی بڑھ گئی۔ "اور آپ کو دھواں ڈرامہ بھی بہت پسند تھا۔ ہمارے پاس کیسٹس تھیں اس کی مگر آپ ہر دفعہ داؤد کے مرنے کے سین پہ اٹھ کر چلی جایا کرتی تھیں۔"

"او حنین' میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ڈرامہ نگار اسی کردار کو کیوں مار دیتا ہے جس کو ہم بہت پسند کرتے ہیں؟"

"کیونکہ!" حنین نے نفی میں سر ہلایا۔ "انہیں جس کردار کو مارنا ہوتا ہے' وہ آپ کو پسند کرنے پہ مجبور کر دیتے ہیں۔"

"پھپھو مجھے بھی ONO کھیلنی آتی ہے' کیا ہم کھیلیں؟" سیم سے زیادہ دیر نظر انداز ہونا برداشت نہیں ہوا۔ حنین چونکی' پھر مسکراہٹ دبی سی ہوئی ذرا پیچھے ہو کر بیٹھی۔ وہ کس خوشی میں اتنا بولے جا رہی تھی بھلا! خود کو ڈانٹا۔

"ہاں اونو کھیلتے ہیں۔" سعدی نے اس کو اونو دیتے درمیان کا راستہ نکالا۔

"جاؤ حنہ' اونو لے آؤ' مگر کارڈز میں شفل (shuffle) کروں گا۔ یاد ہے پھپھو! حنہ اپنے گھٹنے کے نیچے اونو کے چاروں کارڈ پہلے ہی چھپا لیتی

غلطی' اس لیے میں کبھی بھی نہیں جیتتا تھا۔ مجھے کچھ احساس ہو رہا ہے کہ میں یہ سارے گیم ہمیشہ ہار جاتا ہوں۔ اس لیے حنین! تم آج اپنی چیٹنگ کرنے کی صلاحیتوں سے باز رہنا۔" مصنوعی ناراضی سے اس نے حنین کو دیکھتے ہوئے کہا مگر...

حنین ذوالفقار یوسف خان۔ بالکل ساکت رہ گئی۔ سعدی کو بے یقینی سے دیکھتی اس کی نگاہیں پتھرا گئیں۔ رنگت سفید پڑ گئی جیسے وہ کوئی برف کا مجسمہ ہو۔

"میں... چیٹنگ نہیں کرتی بھائی!" اس نے اتنی بے یقینی سے اسے دیکھتے کہا تھا کہ سعدی کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ حنین ایک دم کھڑی ہوئی۔ زمر نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں کارڈز لاتی ہوں۔" وہ مڑ گئی۔ سعدی فوراً اس کے پیچھے لپکا۔

"آئی ایم سوری' میں نے... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ سعدی کے کمرے میں اسٹڈی ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی' جب وہ اس کے سامنے آیا۔ حنین سر بار کر جھک کر دراز کھولنے لگی۔

"مجھے پتا ہے تم کبھی چیٹنگ نہیں کر سکتیں۔ میں صرف مذاق کر رہا تھا۔"

"آئی نو۔" اس نے کارڈز نکالے اور دراز بند کر کے سیدھی ہوئی۔ وہ اسی طرح فکر مندی سے اپنی بہن کو دیکھ رہا تھا جس کی رنگت ہنوز سفید تھی۔

"حنین! ہمارا مسیحا صرف ایک شخص ہوتا ہے اور وہ شخص ہم خود ہوتے ہیں۔"

"مجھے پتا ہے بھائی!" اس نے سر ہلا کر پھیکا سا مسکرانے کی کوشش کی پھر مڑی تو ایک دم قدم زنجیر ہو گئے۔

سعدی کا لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔ زمر کے آنے سے قبل وہ جو کام کر رہا تھا وہ یونہی رکھا تھا۔ اسکرین پہ نمبرز چل رہے تھے۔ اوپر نیچے' حنین کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں' اس نے چہرہ ذرا آگے کیا۔

ایک ہاتھ نے دھپ سے لیپ ٹاپ اسکرین کو کی بورڈ پہ گرا دیا۔ اس نے چونک کر بھائی کو دیکھا۔

"اولو کو دیر نہیں کرانے کا گناہ ملتا ہے۔" مگر وہ یونہی سعدی کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں الجھن' شک' سب کچھ تھا۔

"بھائی! آپ کیا کر رہے ہیں؟"

مگر زمر اندر آ رہی تھی۔

"سعدی... ہاشم!" کہتے اس نے فون پکڑایا۔ سعدی نے گڑبڑا کر فون تھاما' چہرے سے وہ خوشگوار تاثرات غائب ہوئے اور ان کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔

"جی... او کے۔" اس نے فون بند کیا تو حنین تیزی سے بولی۔

"کیا کہہ رہے تھے' مطلب اس دن کے لیے معذرت کر رہے تھے؟"

سعدی لمحے بھر کو رکا۔ ہاشم نے کہا تھا کہ اس کی سیکرٹری صبح کال کر کے اسے ملاقات کا وقت دے دے گی مگر چونکہ اس کا فی الحال ہاشم سے ملنے کا کوئی ارادہ نہ تھا' اس لیے اس نے "ہاں" کہہ کر بات ختم کر دی۔

"آپ گیم شروع کریں' میں آتی ہوں۔" وہ وہاں سے نکل آئی۔ اپنے پیچھے اسے سعدی اور زمر باتیں کرتے راہداری میں آگے جاتے محسوس ہوئے' مگر وہ اپنے اور سیم کے مشترکہ کمرے میں آئی۔ (جہاں آج پھپھو اور اسے رہنا تھا) دروازہ بند کیا۔ الماری کھولی۔ کپڑوں کا ہونٹ اپ ورسٹ آج نہیں گرا کیونکہ صبح اسی نے الماری جمائی تھی۔ وہ جوتوں کے خانے پہ جھکی' چند ڈبے باہر نکالے' پھر ہاتھ ڈال کر اندر کونے میں رکھا ایک ننھا مخملیں ڈبا نکالا۔

سنہری مخمل کا وہ ڈبا کھولنے سے پہلے اس نے بہت دیر سوچا' اتنی دیر کہ ہاتھ شل ہو گئے' اور پھر اس نے کھول ہی دیا۔

اندر سنہرے مخمل پہ ایک سنہری چین والا لاکٹ رکھا تھا۔ مگر کسی سونے چاندی کی جگہ اس زنجیر میں سیاہ ہیرے کی شکل کا اسٹون پرویا تھا' جس کے اوپر سنہرے حروف میں "اینسی اور آفز" کندہ تھا۔ یہ سعدی کے کی چین کا جڑواں تھا۔

اس نے زنجیر کو ہولے سے چھوا مگر پھر ہاتھ ہٹا دیا '
جیسے کرنٹ کے ننگے تار کو چھو لیا ہو' سر جھٹک کر ڈبا بند
کیا' اسے جھٹکنے والے انداز میں نچلے خانے میں ڈالا'
جوتوں کے ڈبے اندر رکھے اور زور سے الماری بند کی۔
گہری سانس لے کر وہ اٹھی تو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ
وہ بھائی کو ہاشم بھائی والی بات بتا دے گی۔ آخر ہاشم بھائی
ہی تو تھے نا کوئی غیر تو نہیں تھا۔ بھائی سمجھ جائے گا اس
لیے وہ بتا دے گی۔
مگر کب؟ یہ حنین نے ابھی طے نہیں کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہے دشت طلب بھی کیا کوئی شہر طلسم ہے۔
جواہرات کا اندازہ ہمیشہ کی طرح درست تھا۔
نوشیرواں دوستوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ وہ اس پر
رونق مارکیٹ آگیا تھا جہاں رات میں بھی دن کا سماں
تھا۔ جو نیو کنٹینرز آج کل لوٹے جا رہے تھے' ان کا
سامان یہاں کوڑیوں کے بھاؤ بک رہا تھا' پٹھان اور
مقامی دکاندار اس بات سے قطعاً" بے نیاز کہ وہ جو بیچ
رہے ہیں وہ بے حد قیمتی 'برانڈڈ اشیا ہیں' بہت مزے
سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھے۔
نوشیرواں نے کار کہیں دور کھڑی کی تھی اور اب وہ
جیبوں میں ہاتھ ڈالے 'فٹ پاتھ پہ چلتا ہوا آگے بڑھ
رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اس کی متلاشی نگاہیں آس پاس
چہروں کو کھوج رہی تھیں۔ اسی تلاش میں وہ آگے چلتا
گیا۔ کافی دیر بعد ڈرائی فروٹ کی ایک سامنے سے کھلی
دکان کے سامنے وہ رکا۔ چند ثانیے پتلیاں سکیڑ کر
دکاندار کو دیکھتا رہا جو صفائی سے اشیا جھاڑ رہا تھا۔ اور پھر
آگے آیا۔
"جی صاحب' ناو ڈرائی فروٹ ہے۔" دکاندار
اس کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ جلدی جلدی اپنی اشیا کی
خصوصیات گنوانے لگا۔ نوشیرواں نے پہلے دو فقرے تو
بے زاری سے سن لیے' پھر بات کاٹ کر بولا۔
"چالیس گرام چاہیے۔"
"بس؟ مگر کون سا.....؟"
"تمہیں پتا ہے مجھے کیا چیز چالیس گرام چاہیے۔"
اس کی آنکھوں میں دیکھ کر درشتی سے بولا تو دکاندار کے
الفاظ حلق میں اٹک گئے۔ اس نے زبردستی مسکرانے
کی کوشش کی مگر رنگت متغیر ہو گئی تھی۔
"صاحب! تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے' ہم ایسے کام
نہیں کرتا۔"
"میں پولیس والا نہیں ہوں' مال دو تو میں جاؤں۔"
وہ بگڑے تاثرات سے بولا۔
"صاب! ہم نے بتایا نا' نہیں ہے۔"
"دیکھو بھائی! میری ایک جیب میں پستول ہے اور
دوسری میں بٹوہ' تمہیں کون سی جیب دکھاؤں جو تو
میری بات سنے گا؟"
کہتے ساتھ اس نے شرٹ کا کنارہ ترچھا کیا' اور پچھلی
جیب میں اڑسا پستول ذرا سا جھانکا۔ دکاندار نے ہاتھ اٹھا
کر سر اثبات میں ہلایا۔
"گلابی والے قائداعظم چلیں گے۔ اندر آؤ اور بتاؤ
کون سا چاہیے۔"
نوشیرواں استہزائیہ مسکرایا اور اس کے پیچھے اندر
چلا گیا۔
جس وقت وہ گھر واپس آیا' ہاشم لاؤنج میں نیم دراز
تھا' یوں کہ پاؤں میز پہ رکھے تھے' اور سونیا اس کے سینے
پر سر رکھے ترچھی لیٹی' ہاتھ میں آئی پیڈ پکڑے گیم
کھیل رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے سونیا کے نرم' سیاہ
بال سہلاتا' دوسرے میں پکڑے مگ سے گھونٹ
بھرتے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔
"بابا! میرا گیم دیکھیں نا۔" وہ خفا خفا سی بولی۔ ہاشم
نے ایک نظر اسکرین پہ ڈالی۔
"اتنی دیر سے تو ان لمبی ناکوں والے پرندوں کو دیکھ
رہا ہوں' اب تو مجھے ان کی شکل بھی یاد ہو گئی ہے۔"
مسکراہٹ دبا کر کہتا وہ پھر سے ٹی وی دیکھنے لگا۔
"آپ کو میرا کوئی گیم سمجھ میں ہی نہیں آتا۔" وہ مسلسل
اسکرین پہ انگلیاں چلاتی کہہ رہی تھی۔
"میں اس طرح کے گیم نہیں کھیلا کرتا سونی' اور جو
میں کھیلتا ہوں' وہ میں ہمیشہ جیتتا ہوں۔"

"شیرو میرے ساتھ سب گیم کھیلتا ہے۔"

"ہیں شیرو اور تمہاری عمر میں زیادہ فرق ہے بھی نہیں۔" ہاشم نے ٹی وی کو ہی دیکھتے ہوئے جھک کر اس کے بال بگاڑے۔

"کیا سونی کو پتا ہے وہ ماما کے ساتھ چھٹیوں پہ نہیں جارہی؟"

"ہوں!" وہ گیم میں مصروف تھی۔

"گڈ! میرے دو ایک کام ختم ہو جائیں پھر بابا اور سونی چھٹیوں پہ جائیں گے ٹھیک؟"

"اور شیرو بھی جائے گا؟ اور ماما بھی؟ اور نی بھی؟"

"ماما کے علاوہ سب جائیں گے۔ ماما کے ساتھ سونیا سردیوں میں چلی جائے گی۔"

"او کے۔" اس نے سر ہلا دیا۔ گیم مشکل ہوتا جارہا تھا۔ تبھی ہاشم کی نگاہ اندر آتے شیرو پہ پڑی جو نگاہ ملائے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہاشم نے اسے پکارا۔

"ہو سکتا ہے کل سعدی آئے میں چاہوں گا کہ تم میرے ساتھ ہو تب۔"

نوشیرواں پہلے زینے پہ رکا مڑا نہیں۔ آہستہ سے کہا۔

"او کے۔"

"کیا بات ہے سعد؟ اور اس کے بھائی کے کیس کا کیا بنا؟"

بغور اسے دیکھتے ہوئے مگ سے گھونٹ بھرا۔ اسے ابھی جواہرات کی طرح یقین تھا کہ شیرو دوست کے پاس نہیں گیا۔

"پتا نہیں میں نے پوچھا نہیں۔" وہ نگاہ ملائے بغیر سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ ہاشم نے بھی بحث نہیں کی۔

اندر آکر اس نے دروازہ لاک کیا اور اسٹڈی ٹیبل تک آیا۔ جیب سے پیکٹ نکال کر میز پہ رکھا۔ اس میں عجیب سے ننھے ننھے ٹکڑے تھے۔ کرسی کھینچ کر بیٹھتے اس نے دراز سے خالی سگریٹ نکالا، اس میں پیکٹ میں رکھی منشیات مسل کر بھرنے لگا۔ یہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ذرا سی لرزش تھی۔ پیشانی پہ پسینہ بھی تھا۔

لائٹر جلا کر سگریٹ کے کنارے کو سلگایا اور دوسرا کنارہ لبوں سے لگایا۔ سانس اندر کھینچی۔ آنکھیں بند کیں۔ کڑوا دھواں اندر اترتا گیا۔

سانس باہر خارج کی تو دھوئیں کے مرغولے ہر طرف بکھر گئے۔ اس کا دماغ ہلکا ہوتا گیا۔ ہر شے سے ہلکا۔ ہوا سے بھی ہلکا۔

☆ ☆ ☆

ناشتے کے بعد تیاری کی افراتفری پورے گھر میں پھیلی تھی۔ سیم بھاگ بھاگ کر اسکول کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ سعدی آفس اور زمر کورٹ کے لیے۔ واپسی پہ اس نے بڑے ابا کو لے کر اپنے گھر جانا تھا۔ سو وہ سب سے زیادہ سکون سے بیٹھے تھے۔ حنین ان کے قریب بیٹھی اخبار میں سے کچھ سناتی ساتھ ساتھ تبصرہ بھی کیے جارہی تھی جب زمر اتر آئی۔ حنین کی بولتی زبان ذرا دھیمی ہوئی، الرٹ سی ہو کر بیٹھی۔ زمر بھی ساتھ آ بیٹھی، حنین نے اسے نظرانداز کیا۔

"ماسٹرز کس سبجیکٹ میں کرنے کا ارادہ ہے حنین؟" جھک کر جوتے کے اسٹریپ بند کرتی وہ ساتھ بیٹھی زری سے پوچھنے لگی۔ حنین کے تنے تاثرات قدرے نرم ہو گئے۔

"لٹریچر میں یا عربی میں۔ ابھی فیصلہ نہیں کیا۔" پھر رک کر اضافہ کیا۔ "بیچلرز میں بھی لٹریچر رکھا تھا۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ تم اتنی ذہین ہو کچھ بھی کر لو گی۔" وہ اب جھکی ہوئی دوسرا جوتا بند کر رہی تھی۔ حنین ذرا سا مسکرائی، ساتھ ہی وہ اخبار کے کونے کو عادتاً ناخن کے اندر رول کر رہی تھی۔

"مگر مجھے یاد ہے تم نے ایف ایس سی میں بورڈ میں پوزیشن لی تھی اور انٹری ٹیسٹ میں بھی بہت اچھے نمبر تھے، ٹاپ میرٹ بنتا تھا تمہارا، پھر انجینئرنگ میں کیوں نہیں ایڈمیشن لیا؟"

حنین کی مسکراہٹ مدھم ہو گئی۔ اس نے سر اٹھا کر زمر کو دیکھا۔ وہ اسٹریپ بند کر کے اٹھ رہی تھی۔ "لوگوں کو پتا بھی نہیں چلتا اور وہ گردن دبا جاتے ہیں۔"

"اچانک سے دل پلٹ گیا ہو کوئی اسے کس واعظ سے لیا۔ دل تو کبھی بھی پلٹ جاتا ہے نا بھیجو!"

اس کا اخبار کا کنارہ موڑنا ناخن مزید تیز ہو گیا۔ سر جھکا کر وہ بڑے ابا کو کوئی دوسری خبر سنانے لگی' البتہ اب کے انداز سست تھا۔

زمر نے جاتے جاتے مڑ کر اسے دیکھا۔ یہ آخری فقرہ کہتے اس کی آواز میں نہ طنز تھا' نہ تلخی۔ بس عجیب سی اداسی تھی۔

وہ راہداری سے گزر کر سعدی کے کمرے کے دروازے تک آئی تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا نظر آرہا تھا۔ کالر اکڑے ہوئے اوپر کھڑے تھے اور وہ ٹائی کی گرہ لگا رہا تھا۔ زمر ذرا سا مسکرائی۔ دروازہ ہولے سے بجایا۔

"تو تمہارا کوئی آفس بھی ہے؟"

گرہ کھینچ کر اوپر لے جاتے وہ خفگی سے پلٹا اور کالر درست کیے۔

"دو سال میں پہلی دفعہ چھٹی لی' وہ بھی صرف دو ہفتے کی اور باس سے چپڑاسی تک ہر بندہ گزرتے گزرتے طعنے دے جاتا ہے' آپ تو ایسے مت کریں۔"

"او ہو اتنی لمبی چھٹی کیوں لی؟"

سعدی چپ ہو گیا۔ (زج پہ آخری دنوں میں بربشر والا تھا' ماموں کو نکلوانا تھا' ہاشم بھائی' البیب نا ب ہیک کرنا تھا' جس کا موقع آپ کے توسط سے مل ہی گیا اور اب ان فائلز کو کھولنا ہے مگر چھٹی ختم) یہ سب صرف سوچا۔ جب بولا تو تحمل آنا۔

"کچھ ریسرچ ورک کر رہا تھا' اسی کو مکمل کرنا تھا۔"

"چلو پھر ویک اینڈ پہ تم ملنے کا پلان کرتے ہیں۔"

"جی' آپ تو شادی میں نہیں آئیں گی نا؟" اس نے سرسری سا ذکر چھیڑا۔ وہ جو مڑنے لگی تھی' چونک گئی۔

"کس کی شادی؟"

"اب پورا رشتہ معلوم نہیں مگر' جس لڑکے کی شادی ہے وہ ہمارا بھی رشتہ دار ہے اور اس نماو کا بھی۔

نماو اور کرن اس سے لواسے ہوئے ہیں آسٹریلیا سے۔ وہ بھی ہوں گے شادی پہ' اور کرن' کاروار خاندان کو بالخصوص بلوائے گی۔ وہ سب بھی ہوں گے۔ سو اگر آپ نماو کا سامنا نہیں کر سکیں گی' مجھے پتا ہے۔ اس لیے آپ کا کاروز ادھر آیا تو میں نے امی سے کہا کہ پھپھو کو نہ بھیجیں' وہ نہیں آئیں گی۔"

زمر کے لب بھنچے اور آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔ سینے پہ بازو لپیٹ کر اسے تندی سے دیکھا۔ "اور تمہیں کیوں لگا کہ میں اس کا سامنا نہیں کر سکتی؟"

"آپ نہیں کر سکتیں تب ہی تو خاندان میں کسی تقریب پہ نہیں جاتیں۔ خیر آپ نے نہیں جانا تو کوئی بات نہیں' میں سمجھ سکتا ہوں۔" بہت سمجھداری سے اس نے کہا۔

"میں اس لیے نہیں جاتی کیوں کہ وقت نہیں ملتا اور....."

"ویک اینڈ پہ وقت ہو گا پھر؟" وہ تیزی سے بولا۔

زمر نے بے دھیانی سے "ہاں" کہا تو اس نے اسی تیزی سے پوچھا۔ "مطلب آپ چلیں گی؟"

"میں... دیکھوں گی۔" وہ رک کر بولی۔ پھر گھڑی دیکھی۔ اسے اب جلنا تھا۔ وہ نکلی تو سعدی مکمل تیار ہو کر نکھرا نکھرا سا باہر نکلا۔ لاؤنج میں بس بڑے ابا تھے' حنین سونے چلی گئی تھی۔ انہوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ تقریب پہ جانے کے لیے مان گئی؟"

"بالکل!" مسکرا کر کہتے اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور سامنے بیٹھا۔ بڑے ابا نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"تم نے کیسے راضی کیا اسے؟ میں کہتا تو کبھی نہ مانتی۔"

"اب آپ کے پاس سعدی یوسف جیسا دماغ تھوڑی ہے۔" گھونٹ بھرتے وہ مسکرایا' پھر کچن کی طرف رخ کر کے آواز لگائی۔

"امی! اب ناشتہ لا دیں بڑے لا رہی ہیں یا کچن سے ہی؟"

"کچن سے میں نے جوتا پھینکنا ہے تمہارے اندر کا"

لحاظ کیے بغیر۔" وہ بڑے انداز سے مصنوعی خفگی سے بولتی آرہی تھیں۔ سعدی نے افسوس سے ماموں کو دیکھا۔

"کوئی مانے گا کہ یہ خاتون میرے بچپن میرے۔ بس بھائی کو میری مثالیں دیتی ہیں؟"

"مجھے پتا ہے اچھے سے 'جلدی جلدی کا شور اس لیے مچاتے ہو تاکہ ناشتہ آدھا کرنا پڑے۔ اب اگر تم نے یہ ختم نہ کیا تو سعدی تو مجھے ہی نہ کہنا۔" وہ سامنے بیٹھتے ہوئے اس کی شکایت والے انداز سے لگا رہی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے بس سن رہے تھے۔

سعدی نے حسب عادت تھوڑا سا کھایا، پھر ہاتھ صاف کرتا اٹھا اور بہت متانت سے ماں کو مخاطب کیا۔

"اچھا ندرت بہن! اللہ حافظ۔" اور اس سے پہلے کہ وہ واقعی اس کے قد کا لحاظ کیے بغیر ایک ہاتھ جڑ دیتیں، وہ باہر نکل چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

تو نے کہا کہ اب زندگی وحشت و درد میں بھر آیا مجھے
اب تو اپنے درد و الم بھی جانتے ہیں پرایا مجھے

سارہ آفس کے لیے تیار ہو کر کار کا دروازہ کھول رہی تھی جب گیٹ کی گھنٹی بجی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ گیٹ اونچا تھا۔ یہاں سے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ باہر کون ہے۔ وہ چابی دروازے میں چھوڑ کر، بیگ کار کی چھت پہ رکھ کر گیٹ تک آئی، اور اسے کھولا۔ آدھا دروازہ کھلتے ہی ہاتھ ٹھٹک کر رک گئے۔

باہر فارس کھڑا تھا۔ ٹی شرٹ، جینز، چھوٹے کٹے بال، سنجیدہ گہری نظریں اور سپاٹ چہرہ۔ سارہ نے باقی کا دروازہ سست روی سے کھولا۔

"فارس؟" کوئی تابندہ لٹ کان کے پیچھے اڑستی وہ ایک طرف ہٹی۔ چہرے پہ تذبذب سا در آیا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" سرسری سا سوال کیا البتہ اس کو بغور گہری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ "ہوں" میں سر ذرا سا ہلا کر مزید ایک جانب ہوئی۔

"میرا اتنی صبح آنا اچھا نہیں لگا آپ کو؟" اس کے ہیجان کے باعث وہ ذرا سرد سا ہوا۔ سارہ کے چہرے پہ شرمندگی ابھری۔

"ایسا نہیں ہے آؤ۔"

"بچوں سے ملنے آیا تھا میں۔" وہ وہیں کھڑا رہا۔ سارہ بھی ادھر ہی کھڑی رہی مگر اس سے نگاہ نہیں ملائی۔

"وہ اسکول کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔ بس ہم نکلنے ہی والے تھے۔" ساتھ ہی اس نے گھڑی دیکھی جیسے جلدی میں ہو۔

"یعنی کسی اور وقت آؤں؟" اس کے چہرے کے بدلتے رنگ بغور دیکھتے وہ خشک انداز میں کہہ رہا تھا۔ سارہ نے اضطراب سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم آسکتے ہو فارس۔"

"مگر... زیادہ نہیں، ہوں؟" وہ اس کے تاثرات پڑھ رہا تھا۔ "تو آپ کے خیال میں وارث کو میں نے قتل کیا تھا؟"

"ایسا نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں پھنسایا گیا تھا یقیناً۔ تمہارے دشمن بہت ہوں گے اور...."

"اور میرا ادھر آنا آپ کے خاندان کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ میں سمجھ گیا۔ آئندہ دور رہوں گا۔" سرہلا کر وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے واقعی سمجھ گیا ہو۔ سارہ نے دکھ سے اسے دیکھا۔

"فارس، آئی ایم سوری۔ مگر میں پہلے ہی بہت مشکل زندگی گزار رہی ہوں۔ میرے پاس میری بچیوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ ان کو کسی بھی خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ تم پلیز مجھے غلط مت سمجھنا۔"

"کہا نا، سمجھ گیا۔ اب چل لوں یا جاؤں؟"

"نہیں، آؤ پلیز۔" وہ اب کے واقعی پیچھے ہٹی اور اندر کی طرف بڑھی۔ وہ چند لمحے ضبط سے اسے آگے جاتے دیکھتا رہا، پھر سر جھٹک کر پیچھے ہو لیا۔

☼ ☼ ☼

ہر حقیقت فریب لگتی ہے
جب کوئی اعتبار کھو بیٹھے

اسٹڈی روم میں خاموشی پھیلی تھی۔ نوشیرواں بھی

اسی خاموشی کا حصہ بنا لیوں۔ مٹھی رکھے میز کے اس طرف بیٹھے ہاشم کو دیکھ رہا تھا' جو بہت انہماک سے فائل کے صفحے کو پڑھ رہا تھا۔ اسے آج آفس دیر سے جانا تھا۔ اس لیے وہ رات والے لباس میں تھا۔

"تیسری دفعہ پوچھ رہا ہوں' سعدی کب آئے گا؟" وہ اب بے زار ہونے لگا تو مقدس خاموشی کو توڑا۔

"ہوں۔" ہاشم نے صفحہ پلٹا' پھر نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا اس کے انتظار میں تم تمام رات نہیں سوئے؟" اس نے شیرو کی ہلکی گلابی آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا۔ شیرو کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ رنگت ذرا پھیکی ہوئی۔

"سویا تھا' مگر بہت دیر سے۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔ پھر بغور ہاشم کے تاثرات دیکھے۔ وہ پھر سے فائل میں مصروف ہو گیا تھا۔ لاکھ شاطر سہی' اتنی جلدی ہاشم کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ پھر سے ڈرگز پہ آ گیا ہے۔

موبائل بجا' ہاشم نے انگلی سے بٹن دبایا اور "ہیلو" کہتے ہوئے فائل کا دوسرا صفحہ پلٹا۔ اس کے پاس اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ موبائل کان سے لگاتا۔ اس کی سیکرٹری کی آواز گونجی۔

"سر! میں نے سعدی یوسف کو کال کی تھی۔" وہ رک گئی۔ ہاشم نے پین سے اس صفحے میں کچھ انڈر لائن کیا۔

"حلیمہ! میں اگلے کتنے منٹ تمہارے بولنے کا انتظار کروں گا؟"

"سوری سر! انہوں نے کہا کہ وہ مصروف ہیں' ان کو اپنا شیڈول دیکھنا پڑے گا۔ آج تو ناممکن ہے' اگلے ہفتے میں ان کو دوبارہ کال کر کے پوچھوں' اگر..." وہ رکی' مگر پھر جلدی سے بولی۔ "اگر ہاشم بھائی کو مجھ سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے تو۔"

"اوکے۔" ہاشم نے بٹن آف کیا اور صفحے پہ دو الفاظ کے گرد دائرہ لگایا۔ وکالت سارا الفاظ کا کھیل ہی تھا۔

شیرو کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"ایٹی ٹیوڈ دیکھا آپ نے اس کا؟ بد تمیز انسان۔ خود کو سمجھتا کیا ہے؟"

ہاشم نے تھکاوٹ سے سر نفی میں ہلا کر شیرو کو دیکھا۔ "تم کب بین السطور باتیں پڑھنا سیکھو گے نوشیرواں؟"

وہ جو بپھرا ہوا' آگے ہو کر بیٹھا' کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا' حیرت سے رکا۔

"اس کی اس بات کا اور کیا مطلب۔"

"کیا تم سعدی کو نہیں جانتے؟ وہ بد تمیزی نہیں کر رہا' وہ مجھ سے ملاقات کو ٹال رہا ہے۔"

"مگر وہ کیوں ٹالے گا؟"

"جب اس کو کوئی مدفن ثبوت ملے گا تو وہ سب سے پہلے میرے پاس آئے گا' صاف بات ہے' اس سے میری فائلز نہیں کھلیں۔ بغیر ثبوت کے' وہ میرا سامنا نہیں کرنا چاہے گا اور فائلز کو کھولنے کے لیے اسے وقت چاہیے۔"

"اور اگر اس نے فائلز کھول لیں؟"

"نہیں کھلیں گی۔" ہاشم نے اطمینان سے کہتے ہوئے وہ فائل اسٹینڈ پہ رکھے لفافے پہ ڈالی اور لیپ ٹاپ اپنے قریب کیا۔

"سعدی کبھی بھی کمپیوٹرز کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ میرے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈرائیو کو وہ اپنی کسی ڈیوائس سے (Remotely access) ریموٹلی ایکسیس تو کر سکتا ہے' مگر فائلز کے تالے کھولنے کے لیے وہ ایسے پروگرامز استعمال کرے گا جو تالا توڑ نہیں سکتے' مگر اس میں باری باری ہزاروں چابیاں لگا کر دیکھتے ہیں کہ شاید کوئی چابی لگ جائے اور جب آدھے سفر میں بھی تالا نہیں کھلتا تو فرسٹریشن کا شکار شخص زور زور سے چابی گھماتا ہے اور اس کے بعد جانتے ہو کیا ہوتا ہے شیرو؟"

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "غلط چابی' تالے میں ٹوٹ جاتی ہے اور ٹوٹی چابی والا لاک پھر صحیح چابی سے کھلنے کے قابل بھی نہیں رہتا اور اگر تمہاری غلط فہمی سعدی ختم ہو چکی ہے تو میں کام کروں؟"

شیرو ماتھے پہ بل لیے اٹھا' میز پہ دھرا اپنا موبائل بھی اٹھایا۔ ادھر اس نے اپنے موبائل کو دیکھا ادھر ہاشم نے

اس کی نگاہوں کو۔

پھر ہاشم نے سنجیدگی سے ہاتھ بڑھایا۔ "فون دو۔"
شیرو نے ناسمجھی سے فون اسے پکڑا دیا۔ ہاشم نے اسکرین کو چند دفعہ دبایا۔ "یہ سعدی کا نمبر ہے۔" اسکرین شیرو کو دکھائی اور فون پھر اپنے سامنے کر لیا
"اور یہ ہو گیا سعدی کا نمبر ڈیلیٹ۔" دوبارہ اسکرین لہرائی۔ تو شیرواں کا منہ کھل گیا۔

"بھائی بس... مگر..."

"تم میری اسٹڈی سے نکل کر اسے کال کرنے اور اس سے فساد کرنے کا سوچ رہے تھے نا! بالکل بھی انکار مت کرنا اور مجھے معلوم ہے تم اس کا نمبر کہیں سے دوبارہ بھی لے سکتے ہو، مگر میں تمہیں یہ جتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اگر تم نے سعدی کو چھیڑ کر میرے لیے کوئی مصیبت کھڑی کی تو میں تمہارے ساتھ کتنی سختی سے پیش آ سکتا ہوں۔" اس کا فون اپنی دراز میں ڈالتے ہوئے وہ قطعیت سے کہہ رہا تھا۔ شیرو نے خفگی سے اسے دیکھا پھر او کے کہہ کر مڑ گیا۔

"اور ناشتے کے لیے جاتے ہوئے فیونا سے کہہ دینا کہ آج کے سارے کھانے تمہیں تمہارے کمرے میں پہنچائے کیونکہ آج کے دن تم گھر سے باہر نہیں نکلو گے۔" وہ کوئی دوسری کتاب کھولتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ شیرو ہکا بکا سا پلٹا۔

"میں پچیس سال کا ہوں بھائی!" اس نے احتجاجاً دبا دبا سا کہا۔

"اور میں پینتیس کا۔ کیا مجھے دوبارہ دہرانے کی ضرورت ہے کہ تم آج کے لیے (grounded) گراؤنڈڈ ہو؟" ابرو اٹھا کر ایک سخت نگاہ اس پہ ڈالتے ہاشم نے پوچھا۔ شیرو کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"سوری بھائی میں اسے اپروچ نہیں کروں گا۔"

"اور میں اس بات پہ کل صبح یقین کروں گا۔ فیونا سے کہو میرا ناشتہ یہیں پہنچا دے۔ میں آفس دیر سے جاؤں گا۔"

شیرو نے منہ بنا کر دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی ہاشم نے بند دروازے کو دیکھا اور ہلکا سا مسکرا کر سر جھٹکا۔

"یہ کب بڑا ہو گا؟"

واپس کتاب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے وہ لمحے بھر کو رکا، چہرہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسٹڈی کے ریکس کتابوں سے لبریز۔ ایک عجیب سے تاسف بھرے احساس نے ہاشم کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ کتاب پرے کر کے اس نے پیچھے ٹیک لگائی اور قلم ہاتھوں میں گھماتے ان در و دیوار کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔ پھر اس نے اپنا موبائل نکالا اور جیسے ریت میں دبا کوئی گم گشتہ صندوق ڈھونڈ رہا ہو، سعدی کا نمبر تلاش کیا۔ فون کان سے لگا کر وہ گھنٹی جاتے سنتا رہا۔

"جی ہاشم بھائی۔" وہ آج بھی اس کی کال ریجیکٹ نہیں کر سکتا تھا۔ ہاشم کے لبوں پہ مسکراہٹ در آئی۔

"تم نے آنے سے انکار کیوں کر دیا؟" وہ دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا۔ "آج آفس دوبارہ اسٹارٹ کیا ہے تو ابھی نکلنا مشکل ہو گا۔"

"تم چاہو تو میں تمہارے آفس آ جاتا ہوں۔" وہ نرمی سے بولا۔

"آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں ہاشم بھائی؟"
"کیونکہ مجھے لگتا ہے تم بدل گئے ہو۔"

"وقت بدل گیا ہے۔" وہ محتاط سا بول رہا تھا۔ ہاشم نے دو انگلیوں سے آنکھیں مسلیں، ناک کی ہڈی کو چٹکی میں لیا۔ پھر گہری سانس لی۔

"وقت بھی وہی ہے، میں بھی وہی ہوں اور تم بھی... شاید ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی آ گئی ہے۔ میں وہ دور کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔" اسے تو یقین تھا۔ ہاشم خاموش ہو گیا۔ چند لمحے اسٹڈی کی خاموشی ان دونوں کو بولنے پہ مجبور کرتی رہی، مگر دونوں چپ رہے۔

"سعدی! کیا ہم واپس جا سکتے ہیں؟ اچھے وقتوں میں واپس، جب ہمارے درمیان یہ دوری نہیں تھی اور تم ناراض نہیں ہوا کرتے تھے۔ تم رات کے ایک بجے بھی میری ایک

کال پہ چلے آتے تھے۔ جب تم مجھے ہاشم بھائی کہا کرتے تھے' تو دل سے کہتے تھے۔ کیا کوئی واسطہ بچا ہے سعدی کے؟؟"

"شاید نہیں۔"

ہاشم نے موبائل بند کر کے میز پہ ڈال دیا۔ اسٹڈی کے در و دیوار پھر سے بولنے لگے' اس کی سماعتوں میں اچھے وقتوں کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ بمشکل ان سب کو ذہن سے جھٹکتا' ہاشم سیدھا ہوا اور کتاب پھر سے کھول لی۔

دوسری طرف' اپنے آفس میں' لیپ ٹاپ کے سامنے' سوچ میں گم بیٹھا سعدی ابھی تک موبائل کو تک رہا تھا' پھر وہ بھی ہر چیز کو ذہن سے جھٹکتا سیدھا ہوا اور لیپ ٹاپ قریب کیا۔ گردن ذرا اونچی کر کے آگے پیچھے کا جائزہ بھی لے لیا اور پھر اپنا پروگرام دیکھا جو ابھی تک چل رہا تھا۔ ناکامی ہو رہی تھی۔ اسے شدید فرسٹریشن ہوئی۔ مضطرب سے انداز میں چند ایک کیز دبا میں' پروگرام سے ایک ساتھ دو تین کام کروانے کی کوشش کی اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ اسکرین پہ جلتا بجھتا نشان جگمگانے لگا۔ اس نے دوبارہ چھیڑ چھاڑ کی اور ۔۔۔ پروگرام کرپٹ ہو گیا۔

ساری کی ساری محنت ضائع چلی گئی۔ جالی لاک میں ٹوٹ گئی تھی۔ سب برباد ہو گیا۔

فائلز ڈیلیٹ ہو چکی تھیں اور اب کوئی بھی چیز ان کو ری کور نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ واقعی کمپیوٹرز کے ساتھ اچھا نہ تھا اور وہ بغیر ثبوت کے کسی سے مدد بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔

اب وہ کیا کرے؟ اس نے سر اٹھا کر اپنے آفس کو اجنبی نظروں سے پھیکی پڑتی رنگت کے ساتھ دیکھا۔ دوبارہ سے ہاشم کا کمپیوٹر ۔۔۔؟ ناممکن اب تو ہاشم اس کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دے۔

"اور ایک وقت تھا جب۔۔۔" جب اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اچھے وقتوں کی ساری کہانیاں فضا میں آج بھی ان مٹ روشنائی سے لکھی تھیں۔

☆ ☆ ☆

سات سال پہلے

عشرت وقت کو آواز دیا کرتی ہیں
ہر ٹوٹے لمحے کی دہلیز پہ جا کر یادیں

کانٹریکٹ لا کی کلاس میں مخصوص خاموشی تھی۔ باہر اترتی شام کی سرمئی شعاعوں میں اندر کاغذ پہ قلم کھینچنے کی آواز مدغم ہو رہی تھی۔ تمام طلبا غور سے سنتے یا سننے کی اداکاری کرتے' لیکچرر کی جانب متوجہ تھے جو لیکچر کا اختتام کرتے ہوئے حسب عادت کہہ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے میری اتنی لمبی تقریر آپ میں سے بہت سوں کی سمجھ میں آ گئی ہو گی اور اگر میرا خیال درست ہے تو چند ایک کی سمجھ میں نہیں بھی آئی ہو گی' اس لیے وہ چند ایک ابھی یا امتحانات سے قبل میرے پاس فارغ وقت میں آ کر اپنی کنفیوژن کلیئر کر لیں اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اپنے رزلٹ کی خرابی کی تمام تر ذمہ داری صرف آپ کے کندھوں پہ ہو گی' رائٹ؟"

نرمی سے مسکرا کر کہتی زمر یوسف کی آنکھیں پوری کلاس پہ مرکوز تھیں۔ اور اس نرمی میں بھی رعب پنہاں تھا۔ جوڑے میں بندھے گھنگھریالے بال' شفاف جلد' ناک میں سونے کی بالی کی طرح تھا اور ہاں' ابھی آنکھوں کے گرد ایک دو جھریاں بھی نہیں پڑی تھیں۔

چند ایک طلبہ و طالبات نے ہاتھ بلند کیے' کنفیوژن کلیئر کی' وہ تحمل سے جواب دیتی رہی اور ایسا کرتے ہوئے اس کی نگاہ ہال کے ایک ایک چہرے سے گزرتی اس اجنبی شناسا سے چہرے پہ ٹھہر سی گئی۔ لبوں پہ مبہم سی مسکراہٹ والا وہ شخص اس ایوننگ کلاس میں چار روز سے آ رہا تھا اور ہر دفعہ اسے دیکھ کر لاشعور میں کوئی احساس جاگزیں ہوتا جیسے وہ اسے کہیں دیکھ چکی ہے' مگر' شعور اس چہرے کو کسی نام کے ساتھ فٹ نہیں کر پا رہا تھا' سو وہ نظر انداز کر کے کلاس برخاست کرنے لگی۔ اسٹوڈنٹس یکے بعد دیگرے اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ زمر نے میز سے اپنی چیزیں

کیمیں۔ ان کو تو نیب سے بیگ کے مختلف خانوں میں رکھا۔ نفاست سے فائل اور کتابیں جوڑیں۔ بیگ کندھے سے لٹکایا اور سر اٹھایا تو وہ شخص سامنے کھڑا تھا۔

"کہیے میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں؟" وہ سر جھکا کر بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے بولی۔ میز کی چمکتی سطح میں اس کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ لمبا چوڑا کافی اسمارٹ' اٹھائیس انتیس سال کے لگ بھگ' ہلکی آنکھوں اور چھوٹے کٹے بالوں والا شخص...

"میں کروں آپ کی مدد؟" اس نے نرمی سے کہا مگر لاپروائی کا عنصر غالب تھا۔ زمر نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔

"سوری؟"

"میں مائیگریٹ ہو کر ادھر آیا ہوں۔" انگلی سے کان کی لو مسلتا وہ ادھر ادھر دیکھتا کہہ رہا تھا۔ اس کا انداز غصہ نہیں دلاتا تھا' ورنہ کوئی ایسے بات کرتا تو شاید اس کے سر لگ جاتی۔

"تو؟"

"تو چار دن سے آپ کو دیکھ کر ذرا..." (ہاتھ سے اشارہ کیا) ذرا کنفیوزڈ ہیں' یو نو deja vu فیلنگ"

زمر نے بمشکل تعجب چھپایا۔ "آئی ایم سوری' مجھے یاد نہیں اگر ہم پہلے مل چکے ہیں۔ ابھی تک میرے وجنز میں آپ کا نام بھی نہیں پہنچا۔"

"شاید کئی سال پہلے اب زیادہ بھی نہیں..." پھر ذرا سے شانے اچکائے۔ زمر بھنویں سکوڑے اس کو دیکھتی رہی' تو وہ ذرا سا مسکرایا۔

"میں فارس غازی ہوں' سعدی کا ماموں!"

زمر کے تعجب سے ابرو ڈھیلے پڑے' لب "اوہ" میں سکڑے' چہرے پہ پہلے حیرت اور پھر شرمندگی ابھری۔

"اوہ... آئی ایم سوری... میں نے واقعی نہیں پہچانا۔ میں شاید آپ سے ملی بھی نہیں کبھی مگر آپ کو کیسے پتا میں سعدی کی...؟"

"سہیل!" اس نے کندھے جھٹکے۔ "سعدی نے بتایا تھا کہ آپ شام میں ادھر پڑھاتی ہیں اور صبح سعود واثا کے چیمبر میں ہوتی ہیں۔"

"اوہ... مگر اس نے مجھے نہیں بتایا' میرا مطلب ہے "آپ سعدی کے وہی ماموں ہیں نا جو..." وہ گڑبڑا کر رکی۔

"جی' وہی جو سوچا ہے۔" وہ پھر ذرا سا مسکرایا۔ زمر کے رخسار گلابی ہوئے۔

"میں' میرا مطلب تھا وہ جو آئی بی (انٹیلی جنس) میں ہوتے ہیں اور کہیں سندھ وغیرہ میں پوسٹڈ تھے۔ کیونکہ سعدی کے نیب والے ماموں سے تو اکثر ملاقات ہو جاتی ہے۔"

"جی' میں کئی سال سے ادھر تھا' اسی ہفتے آیا ہوں۔"

کلاس قریباً خالی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے۔ راہداری میں ایک ستون کے ساتھ کھڑے ہو کر زمر نے اس کی طرف رخ کرتے پوچھا۔

"تو آپ میری کلاس میں کیسے؟ ڈونٹ ٹیل می' ہماری کلاس میں آپ کسی کی جاسوسی کرنے آئے ہیں۔"

اس بات پہ فارس ہنس پڑا۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔

"میں جاسوس نہیں ہوں' جاسوسوں کا ڈیپارٹمنٹ الگ ہوتا ہے۔ میں یوں ہوں جیسے پولیس آفیسرز ہوتے ہیں' ہم مختلف کیسز پہ کام کرتے ہیں۔ ہاں ادھر پڑھنے آیا ہوں میں۔" وہ گردن ذرا جھکا کر عادتاً ناخن سے کان رگڑتا کہہ رہا تھا۔ ساتھ میں شاید وہ چیونگم بھی چبا رہا تھا۔

"تو کیا نوکری چھوڑ دی؟"

"نوکری کے لیے تو پڑھ رہا ہوں۔ پہلے زیادہ پڑھ نہیں سکا تھا۔ چھوٹی پوسٹ پہ بھرتی ہوا تھا' اب ترقی تو ملتی رہی ہے مگر لاء کی ڈگری ہونے کے لیے بہت اچھی ہوتی ہے' ترقی کے چانسز بڑھتے ہیں۔" پھر رک کر زمر کا چہرہ جیسے جانچا۔ "کیا آپ کے والد نے نہیں بتایا کہ کس طرح وہ نوکری اور نوکری سے پہلے میری مدد کرتے رہے تھے؟"

"آ... نہیں بالکل نہیں' میرے اردگرد کے لوگوں کی خاموش خفگیوں کی علامت ہے شاید۔" زمر نے مسکرا کر گہری سانس لی۔

"برے وقتوں میں انہوں نے قرض دیا مجھے' احسان تھا ان کا۔"

"ان فیکٹ' مجھے یاد آرہا ہے' سعدی کے سوتیلے سوری' چھوٹے ماموں' آپ کی امی تو کافی ریل آف سی تھیں' مجھے باقی آپ کا فیملی ٹری بالکل یاد نہیں' یہ بھی ندرت بھابھی نے شاید کبھی ذکر کیا تھا۔"

"جی' اورنگ زیب کاردار... میرے ماموں ڈیڈ بل آف ہیں' میری امی نہیں۔ کچھ نہیں چھوڑا میرے لیے' سوائے نصیحتوں کے۔" پھر سے بے نیازی سے شانے اچکا کر ہنسا۔ زمر بھی ساتھ ہی ہنس دی۔ پھر اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

"اوکے فارس' اچھا لگا آپ سے مل کر۔ آپ کو پڑھائی یا یونیورسٹی میں کسی بھی قسم کی مدد چاہیے ہو تو آپ مجھ سے کہہ سکتے ہیں۔ اب تو ملاقات ہوتی رہے گی۔" وہ اب رخصت چاہ رہی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ جاتی' فارس نے عجلت میں پکارا۔

"کیا آپ ہاشم کی شادی میں آئیں گی؟" زمر جاتے جاتے واپس ہوئی' نا سمجھی سے ابرو اٹھائے۔ "سوری' کون ہاشم؟"

"اوہ' کیا ندرت آپا نے نہیں بتایا؟ میرا کزن ہاشم' اس کی اگلے ہفتے شادی ہے' انہوں نے سعدی لوگوں کی پوری فیملی کو بلایا ہے' آپ سمیت۔"

زمر نے چند لمحے سوچا' پھر کندھے اچکا دیے۔

"میں بالکل بھی نہیں جانتی آپ کے کزن کو' لیکن اگر وہ بلائیں گے تو دیکھیں گے۔"

فارس نے سر ہلا کر گویا جانے کی اجازت دے دی۔ وہ ایک الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ مڑ گئی۔

فارس وہاں کھڑا تب تک اسے دیکھتا رہا' جب تک وہ راہداری کے دوسرے سرے پہ گم نہ ہو گئی۔ پھر ایک دم چونکا اور خفیف سا ہو کر سر جھٹکا۔

"وہ خوب صورت تو نہیں تھی' پھر بھی اچھی کیوں لگ رہی تھی؟ سعدی کی پھپھو تھی' اس لیے شاید۔" وہ خود کو مطمئن کر کے غیر مطمئن کرتا' وہاں سے پلٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

☆ خدا ہے محبت' محبت خدا ہے

مرحوم ذوالفقار یوسف کے گھر میں باتوں کا شور' ٹی وی کی آواز اور رات کے کھانے کی مہک ہر سو پھیلی تھی۔ لاؤنج کے فرشی سیٹر صوفے کے ایک کنارے پہ بیٹھی زمر' دوسرے سرے پہ موجود ندرت سے کہہ رہی تھی۔

"آپ مجھے جتا ہی دیتیں کہ آپ کا بھائی آرہا ہے' میں مائیگریشن اور دوسرے کاغذی معاملات میں اس کی مدد ہی کر دیتی۔ بہت مشکل ہوئی ہو گی اسے تو۔"

"بس اس کی اچانک پوسٹنگ ہوئی' ادھر آیا اور گھر کھولا' وہیں اپنے اورنگ زیب ماموں کی انیکسی میں رہتا ہے' وہ اس کی ماں کے حصے میں تھی نا۔"

"آپ ذکر ہی کر دیتیں اور تم تو ادھر آؤ' ذرا' میرا سارا بائیو ڈیٹا اپنے ماموں کو دے دیا اور تمہیں آکر بھی نہیں کہا۔ کتنی شرمندگی ہوتی مجھے اگر میں اس کو ڈانٹ رہی ہوتی۔" کمرے سے نکلتے سعدی کو خفگی سے پکارا۔ وہ سیب کھا رہا تھا' کھاتے کھاتے کندھے ذرا سے اچکائے اور مسکراتا ہوا سامنے کشن پر آ بیٹھا۔

"سوری' ٹکٹ بھول گیا۔"

"اور ہاں' اس نے کسی کزن کی شادی کا بھی ذکر کیا تھا۔" زمر نے یاد کرتے ہوئے ندرت کو دیکھا۔ انہوں نے سر ہلایا۔ "ہاں ہاشم کی شادی ہے اگلے ہفتے۔"

"کون ہاشم؟" سعدی نے سیب پہ دانت گاڑنے رک کر پوچھا۔

"فارس کے ماموں کا بڑا بیٹا ہے۔ تم لوگ نہیں جانتے' میں نے بھی عرصہ پہلے دیکھا تھا۔ اصل میں زمر' فارس ادھر ہوتا جو تمہیں تھا' تو اس سے جڑے بہت سے لوگوں سے بچوں کا تعارف نہیں ہے۔ خیر اب وہ آگیا ہے تو اس کی وجہ سے وہ ہمیں بھی بلائیں گے۔"

ندرت بات کرتے ہوئے مسلسل چھ سالہ سیم کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر اس کو میز کی چیزیں اٹھانے سے روک رہی تھیں۔ اور وہ خاور نا" ہر شے اٹھا کر پھینکنا چاہتا تھا۔

"اس پہ نظر رکھو میں ذرا روٹی ڈال لوں۔ کھانا کھا کر جانا زمر!" سعدی اور اسے ایک ساتھ مخاطب کرتے وہ اٹھیں تو زمر نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

"اوہو۔ امی منتظر ہوں گی' دیر ہو جائے گی۔ ویسے پکا کیا ہے؟"

"مٹر قیمہ۔" ندرت بھی مسکرائیں اور سعدی بھی۔

"اب رہ گئیں نا پھوپھو سوچ میں۔"

"سوچنے والی بات ہی نہیں ہے۔ مجھے جلدی جانا ہے تو یہاں کھا نہیں سکتی مگر پیک تو کروا سکتی ہوں۔"

ندرت مسکراتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئیں تو وہ سعدی کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اسکالرشپ کے لیے ناموں کا اعلان ہو گیا؟"

"ابھی نہیں۔ مگر اسی ہفتے ہونا ہے۔" چہرہ ذرا مایوس ہوا۔ "مجھے نہیں لگتا مجھے اسکالرشپ ملے گا۔ میں تو نارمل سا اسٹوڈنٹ ہوں' مجھ سے بہتر امیدوار ہوں گے وہاں۔"

"مگر مجھے یقین ہے کہ تمہیں اسکالرشپ مل جائے گا۔"

سعدی کا چہرہ امید سے چمکا۔ "اچھا' آپ کو کیسے یقین ہے؟"

"یہ یقین ہے' ریاضی کا سوال نہیں جو اس کی کوئی لاجک بھی ہو۔ بس ہے تو ہے۔" اس نے ذرا سے کندھے اچکائے۔

"چلیں سب نام لکھوائیں' ہم پارٹی کر رہے ہیں۔"

اندر سے تیرہ سالہ حنین بولتی ہوئی آئی۔ اس کے ماتھے پہ کٹے ہوئے بال گرے تھے' ناک پہ چشمہ تھا اور لبوں پہ شرمگیں مسکراہٹ' جو صرف زمر کو دیکھ کر آتی تھی۔ زمر بھی اسے دیکھ کر مسکرائی۔ حنین نے ایک فہرست سامنے رکھی اور ہاتھ میں پین پکڑے' بہت سنجیدگی سے اعلان کیا۔

"سوموار کی شام ہم پارٹی کریں گے۔ میں دہی بھلے لاؤں گی اور سیم' تم برگرز لاؤ گے۔" تحکم سے سیم سے کہا۔ وہ جلدی جلدی سر اثبات میں ہلانے لگا۔ (سیم کی چیز ہمیشہ امی لاتی تھیں)

"اور پھوپھو آپ؟" زمر کو دیکھ کر پوچھتے اس کی آنکھوں میں وہی شرمگیں مسکان پھر سے جھلملانے لگی۔

"میں لزانیہ لاؤں گی۔"

"اور امی آپ؟" حنین نے زور سے آواز دی۔

کچن سے آواز واپس آئی "میں فروٹ چاٹ لاؤں گی۔"

اب سب نے سوالیہ نظروں سے سعدی کو دیکھا تو وہ ایک گال کھجاتا ہوا بولا۔ "میں بریانی لاؤں گا۔"

حنین کی بھنویں ناراضی سے بھنچیں فوراً" بھیجو کو پکارا۔ "بھیجو! بھائی کو کہیں کہ یہ سموسے لائیں گے۔"

"اتنا کچھ تو ہے' پہلے تم وہ تو کھاؤ' ہنو۔"

"کوئی بہانہ نہیں سعدی' تم سموسے لاؤ گے۔" زمر نے مسکراہٹ دبا کر اسے تنبیہہ کی' وہ منہ میں کچھ بڑبڑا کر سر جھٹک کر رہ گیا۔ حنین کے ناراض تاثرات نارمل ہوئے' اس نے بڑے جوش سے سعدی کا نام لسٹ میں لکھ لیا۔ پھر باری باری سب سے سائن کروائے۔ تب ہی امی نے پکارا تو وہ بھیجو کا پاس لیتے کچن میں بھاگی۔ زمر نے پالی اٹھائی تو سعدی بھی پیچھے ہی گیا۔

زمر نے پرس سے سن گلاسز نکالے اور آہستہ سے صوفے کے نیچے کارپٹ پہ رکھ دیے' پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

ندرت ڈبا لے آئیں تو وہ سب اسے چھوڑنے دروازے تک آئے۔ حنین فوراً" واپس آ کر لاؤنج کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھنے لگی۔ زمر اور سعدی کار کے پاس کھڑے تھے' زمر اندر بیٹھنے لگی' پھر کسی احساس کے تحت بیگ کھولا' ادھر ادھر دیکھا۔

حنین چونکی پھر فوراً صوفے تک آئی، چیزیں ادھر ادھر کیں، اوپر نیچے دیکھا۔ گلاسز نیچے گرے پڑے تھے۔

"اوہ پھپھو پھر کچھ بھول گئیں۔" فاتحانہ خوشی سے کہتی، وہ عینک اٹھا کر دروازے کی طرف بھاگی۔ زمر واپس آ رہی تھی۔ ادھر اس نے دروازہ کھولا، ادھر حنین نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ گلاسز والا ہاتھ بڑھایا۔

"میں شاید اپنے گلا... اوہ۔" زمر کا سوال مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ حنین کو دیکھ کر لب بھینچے۔ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے عینک پکڑی، اور ہولے سے حنہ کا گال تھپتھپایا۔

"میری زندگی میں دوڑنے کے لیے شکریہ حنہ۔"

اب کے وہ گئی تو حنین واپس صوفے پہ آ بیٹھی۔ اسے دوبارہ کھڑکی میں نہیں کھڑے ہونا تھا۔ کیونکہ زمر بھول صرف ایک دفعہ کرتی تھی۔ حنین اٹیک صرف ایک دفعہ لگاتی تھی۔

اس نے میز سے لسٹ اٹھائی تو فوراً" سے مسکراہٹ ازخود ہی ہوئی۔ وہیں سعدی کے نام کے آگے لکھا سموسے کاٹ کر برتن لکھا تھا۔ اور بھائی خود غائب تھا۔ حنین نے غصے سے چلانے کے لیے منہ کھولا مگر پھر خود ہی ہنس پڑی اور برتن کو دوبارہ سموسے کر کے لاؤنج کے کونے میں رکھی کمپیوٹر ٹیبل پہ آ گئی۔ ادھر اس نے کمپیوٹر آن کیا ادھر سیم ساتھ والی کرسی پہ آ بیٹھا۔ وہ گیم کھیلے گی تو وہ دیکھے گا، یہی دستور تھا، یہی معمول تھا۔

☆ ☆ ☆

ڈائننگ ٹیبل پہ کریلے گوشت کے قریب مرتبہ بھی ایک چھوٹے ڈونگے میں رکھا تھا اور فرحانہ بیگم اس میں سے چمچ سے سالن نکالتی کہہ رہی تھیں۔

"مرچیں ندرت ہمیشہ تیز ڈالتی ہے۔ اب اگر تمہیں دینا ہی تھا تو وہ سالن دیتی جس میں مسالہ کم ہو مگر نہ جی۔" مسرا کرسی پہ براجمان۔

بڑے ابا روٹی کا نوالہ توڑ رہے تھے، اور دائیں ہاتھ بیٹھی زمر پانی کا گھونٹ بھر رہی تھی، دونوں نے نہیں سنا۔

"اصل میں پتا ہوتا ہے نا اس کو کہ ہم دونوں بوڑھوں نے بھی کھانا ہے اور مرچیں ہمیں کتنا نقصان کریں گی۔" اب کی بار یوسف خان نے خفگی سے ان کو دیکھا۔

"بوڑھوں کی فہرست آپ خود تک محدود رکھیے بیگم! میں ابھی اس میں شامل نہیں ہوا ہوں۔"

زمر نے مسکراتے ہوئے منہ میں موجود لقمہ چبایا اور پھر ان کو متوجہ کیا۔

"پتا ہے آج کل میری کلاس میں کون آ رہا ہے؟" کہہ کر اس نے دوسرا لقمہ منہ میں رکھا اور لب بند کیے بہت نفاست سے اسے چباتی رہی اور وہ دونوں اس کو دیکھتے رہے۔ جب نگل چکی تو بولی۔

"فارس غازی۔ ندرت بھابھی کا سوتیلا بھائی جو انٹیلی جنس میں ہوتا تھا۔"

فرحانہ حیران ہوئیں، پھر مشکوک۔

"تمہاری کلاس میں وہ کیا کر رہا ہے؟"

"ہاں زمر! اس نے مجھے بتایا تھا کہ ایل ایل بی کر رہا ہے۔ اس سے اس کو ترقی کے چانسز زیادہ ملیں گے۔ یہ لڑکے بھی نا، پڑھائی سے بھاگنے کے لیے فورسز میں جاتے ہیں اور پھر وہاں پڑھتے بھی ہیں اور بھاگتے بھی ہیں۔"

"کیا ندرت نے ذکر کیا تھا پہلے؟" ان کو نظر انداز کیے فرحانہ تیزی سے بولیں۔

"کیا ہوتا تو میں تبادلے میں اس کی مدد ہی کروا دیتی۔" وہ سلاد کی پلیٹ اٹھا کر کانٹے سے کچھ کھیرے اپنی پلیٹ میں نکال رہی تھی۔

"اب تم زیادہ اچھی نہ بننا کہ اس کے سوتیلے بھائی کو فیور دینے لگ جاؤ۔"

زمر نے گلاس سے گھونٹ بھرا، گیلے لب ٹیشو سے تھپتھپائے اور سر اٹھا کر امی کو سنجیدگی سے دیکھا۔

"امی! ایک چیز ابھی سے کلیئر کر لیتے ہیں۔"

یونیورسٹی مجھے ایوننگ کلاسز لینے کا ایک معقول معاوضہ دیتی ہے اور اس معاوضے کو حلال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ میں یونیورسٹی کے ساتھ کیے گئے اپنے معاہدے کو پورا کروں جس کے تحت میں ہر اسٹوڈنٹ کی غیر مشروط مدد کرنے کی پابند ہوں۔ اور اس لیے میں ذاتی تعصب کی بنا پر نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتی ہوں اور نہ ہی ذاتی تعلق کی بنا پر غیر ضروری فائدہ دے سکتی ہوں۔ پھر چاہے بھابھی کا بھائی ہو یا سلیم درزی کا بیٹا جو بھی میرے پاس مسئلہ لے کر آئے گا، مجھے اسے حل کرنا ہوگا۔"

بہت نرمی اور درسان سے اس نے کہا مگر عام حالات میں شگفتہ رہنے والی فرحانہ، مدرت کے ذکر پر خفا سی ہو کر برتن اٹھانے لگیں۔

"ہاں ہاں میں تو کھا کر پھنس جاتی ہوں۔"

"پھنس تو آپ اچھا کھانا بنا کر بھی جاتی ہیں، کیونکہ ہم تجویز شاید اگلے ماہ ون ڈش رکھیں تو اس میں بھی مجھے ایسا ہی کریلے گوشت بنا کر دیجیے گا، کیونکہ ماں کے ہاتھ کے کریلے کبھی کڑوے نہیں ہوتے۔"

"ہاں تو برا کھانا بنایا ہے میں نے کبھی؟" اب کے ناراضی مصنوعی تھی۔ وہ برتن لے کر کچن میں چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی یوسف صاحب فوراً" زمر کی طرف مڑے۔

"فارس کا ہر طرح سے خیال رکھنا، کوئی بھی ضرورت ہو تو اس کی مدد ضرور کرنا۔"

"جیسا کہ میں نے ابھی کہا، بلاضرورت کوئی فائدہ دوں گی نہ بے وجہ کوئی نقصان۔" وہ کندھا دبا کر تو جہ یک لگی رہی تھی۔

"ویسے آپ کا ذکر کر رہا تھا وہ۔" سرسری سا کہا۔ بڑے ابا چونکے، کچن کو دیکھا، پھر اس کو۔

"اچھے لوگوں کی اچھی عادتوں میں سے ایک دوسروں کو اچھے لفظوں میں یاد رکھنا بھی ہوتی ہے۔"

"آپ یہ کہنے کے لیے تمہید باندھ رہے ہیں کہ آپ نے بھی اس کی کوئی مدد نہیں کی؟"

"تم سے کس نے کہا ہے؟"

"جب آخری دفعہ میں نے چیک کیا تھا تو میرے اوپر وحی تو نازل نہیں ہوتی۔" وہ بہت اطمینان سے نیپکن سے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ "پھر کیا مدد کی تھی آپ نے ان کی؟"

"ہم..." تلملا کر پھر سے کچن کو دیکھا۔ "تم میرے گھر کا ماحول خراب کرنے پر تلی ہو۔"

"اگر آپ کے منہ سے نکلنے والے اگلے الفاظ میرے سوال کے جواب کے علاوہ ہوئے تو میں یہی سوال تھوڑی دیر بعد گرما گرم چائے کے ساتھ دہرا دوں گی۔" اب وہ ہتھیلی پہ چہرہ ٹکائے مسکرا کر ان کو دیکھ رہی تھی۔

"اتنا بھی نہیں کیا کچھ خاص، جتنا وہ یاد رکھتا ہے۔ وہ زیادہ پڑھ نہیں سکا تھا، ماں نے تھوڑا بہت روپیہ پیسہ چھوڑا تھا اس سے چھوٹی عمر میں کاروبار کرنے کی کوشش کی تو سب ڈوب گیا۔ اوپر سے قرضہ بھی چڑھ گیا۔ اس کے ماموں کافی امیر آدمی ہیں مگر ان سے مانگتے اس کی ناک آڑے آتی تھی، اس لیے میں نے اس کی مدد کی تھی، قرضہ اتارنے میں اور پھر ایجنسی میں نوکری کے لیے بھی تھوڑی بہت کوشش کی، حالانکہ وہ میرٹ پہ سلیکٹ ہوا مگر اس کو بھی میرے کھاتے میں ڈال دیتا ہے۔ اب تو سارا قرضہ لوٹا بھی چکا ہے، پھر بھی بھولتا نہیں ہے۔"

"تو اچھی بات ہے نا۔ زندگی بن گئی اس کی، اس لیے یاد رکھتا ہے۔"

وہ کہنیاں میز پہ ٹکائے اب پھر سے پانی پی رہی تھی۔ بڑے ابا نیپکن ہٹا کر اٹھے اور کونے میں لگے سنک کے اوپر کھڑے ہاتھ دھونے لگے۔ زمر گھونٹ گھونٹ پانی پیتی مسکرا کر اپنے ابا کو دیکھتی رہی، جو واقعی ابھی بوڑھوں اور معذوروں کی فہرست میں شامل نہیں ہوئے تھے۔

دروازہ زور زور سے بجا۔ ایک' دو' تین۔ سعدی نے "آ رہا ہوں" کہتے راہداری پار کی۔ دوبارہ دستک ہوئی۔ بیل بھی بجی۔ اور وہ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے فارس کھڑا تھا۔

"یار ماموں! میں کھول ہی رہا تھا' آپ..." گڑبڑا کر وہ چپ ہوا۔ فارس نے آنکھ سے اشارہ کیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"آئیے ماموں!" سعدی کے لب کھل گئے۔ مطلب 'ماموں کے ماموں؟' وہ کچھ بغیر اندر بھاگا۔ امی کچن میں شام کی چائے کو دم لگا رہی تھیں۔ وہ ان کے سر پہ جا پہنچا۔

"امی۔ ماموں کے۔ ماموں آئے ہیں۔ مطلب' ابو۔"

"کیا؟" پہلے تو امی کو سمجھ نہیں آیا اور جب آیا تو جلدی سے باہر آئیں۔ فارس راہداری سے ہوتا ہوا ان کو لا رہا تھا۔ گرے سوٹ میں ملبوس' باریک تراشیدہ سفید' سرمئی مونچھوں والے' کالی بارعب' نکر چند سم آدمی تھے۔ آنکھوں میں ایک سخت سا تاثر تھا' گردن میں سریا۔ امی کے سلام کا سر کے خم سے جواب دیا۔ تنے ابرو کے ساتھ کروفر سے بڑے صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھے۔

"بہت اچھا لگا کہ آپ آئے۔" امی اپنی ابتدائی بوکھلاہٹ پہ قابو پاتی' کہتے ہوئے صوفے کے کشن برابر کر رہی تھیں۔ شکر کہ لاؤنج صاف پڑا تھا۔ پھر بھی نظر گھما کر دیکھا اور جب فارس پہ نگاہ ٹھہری تو ندرت نے بتایا کیوں نہیں؟" والے انداز میں اسے گھورا' مگر وہ ذرا سے شانے اچکا کر سنگل صوفے پہ جا بیٹھا۔

"یہ میرا بیٹا ہے' سعدی!" امی سامنے کھڑی' تعارف کروانے لگیں۔ سعدی نے مسکرا کر سلام کیا' انہوں نے بنا مسکرائے مگر شائستگی سے جواب دیا۔ وہ کشن لے کر کارپٹ پہ بیٹھ گیا۔ لاؤنج کے کونے میں کمپیوٹر ٹیبل پہ جیسی حنین مستقل کی بورڈ پہ کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔ ندرت نے بظاہر مسکراتے ہوئے مگر گھور کر کہا۔

"حنہ' سلام کرو۔" تو وہ ذرا سی مڑی' سلام کیا اور واپس۔ اور نگزیب کاردار نے تو شاید سنا ہی نہیں۔ بے تکلف سے بیٹھے تھے۔ "آپ کو عزت بخشی ہے" والا انداز۔

راہداری کا دروازہ پھر بجا' دھیما سا جیسے کسی نے انگلی کی پشت سے ناک کیا ہو۔ سعدی فوراً" اٹھا تو کاردار صاحب بولے۔

"میرا بیٹا ہو گا" کال سننے رک گیا تھا۔" سعدی راہداری میں آیا تو وہ ادھر کھلے دروازے میں کھڑا تھا۔ اس نے ٹائی اور ویسٹ بھی پہن رکھی تھی' بس کوٹ نہیں تھا۔ ٹائی پن' کف لنکس' جوتے' ہر شے اپنی نیت آپ بتاتی تھی اور اس سے زیادہ بیش قیمت اس کی مسکراہٹ تھی۔

"میں ہاشم ہوں' ہاشم کاردار۔ میرے ڈیڈ غالباً" اندر ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے اپنائیت سے بولا تھا۔ سعدی جلدی سے اس تک آیا۔

"جی' وہ اندر ہیں۔ میں سعدی یوسف ہوں۔" اس نے بھی مسکرا کر بتایا' اندر آنے کا راستہ دیا۔

ہاشم ندرت سے بھی اسی مسکراہٹ کے ساتھ ملا۔ پھر اپنے باپ کے ساتھ صوفے کے دوسرے سرے پہ جا بیٹھا۔ سعدی کو محسوس ہوا کہ وہ ہمیشہ اپنی گہری آنکھوں سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے مسکراتے رہنے کا عادی تھا۔ جو بھی تھا' وہ اسے اچھا لگا تھا۔

"ہاشم کی شادی ہے اگلے ہفتے۔ ولیمہ کا کارڈ مل گیا آپ کو؟" اسی سنجیدگی سے اورنگزیب کاردار نے ندرت کو مخاطب کیا۔ وہ سامنے سنگل صوفے پہ ٹکی تھیں' سر ہلانے لگیں۔

"جی' جی' ہم ضرور آئیں گے۔" (حالانکہ اس سے پہلے آنے کا ارادہ نہ تھا۔)

"ہاشم اور میں آفس سے نکلے تھے تو فارس مل گیا۔" ہاتھ سے ذرا سا اشارہ کیا اس کی طرف' جو بے نیاز سا دوسرے سنگل صوفے پہ بیٹھا' موبائل پہ کچھ کر رہا تھا "تو سوچا' اس کے رشتے داروں کو ذاتی طور پر مدعو کر دیں۔ باقی آپ کے دوسرے رشتے دار..." گنگر پھر کر

ہاشم کو دیکھا "وہ سب ہاشم سنبھال لے گا۔" ہاشم نے اثبات میں سر کو خم دیا۔ اب اورنگزیب کاردار کلائی پہ بندھی گھڑی کو دیکھتے خاموش بیٹھے تھے۔ بہرحال' ان کی مہربانی تھی کہ وہ چلے آئے' ورنہ مزاج کے تو وہ اسی طرح سخت اور غصہ ور مشہور تھے۔ ندرت نے سوچا۔

خاموشی کا وقفہ ذرا بڑھا تو ہاشم نے دوستانہ انداز میں کارپٹ پہ کشن کے سہارے بیٹھے اٹھارہ سالہ سعدی کو مخاطب کیا۔

"کیا پڑھ رہے ہو تم؟"

"یونیورسٹی آف لیڈز میں کیمیکل انجینئرنگ کے لیے اپلائی کیا ہے' مگر ابھی اسکالرشپ کا حتمی فیصلہ نہیں آیا۔"

"تو کتنی امید ہے کہ انجینئر بن جاؤ گے؟"

سعدی ذرا جھینپ کر ہنسا۔ "میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"پھر بھی' گھر میں ایک بچہ ایسا ہوتا ہے جس کے بارے میں ماں باپ کو بچپن سے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ سب سنبھال سکتا ہے(مسکرا کر ایک نظر ابا کو دیکھا اور ندرت کی طرف متوجہ ہوا) وہ جو ضرور کسی قابل بن جائے گا' تو آپ کے بچوں میں سے ایسا کون ہے؟"

پھر سعدی کو دیکھا۔

"کیا وہ تم ہو؟"

"ہم تینوں میں سے بھی ایک کا سب کو پتا ہے کہ اس نے انجینئر ضرور بننا ہے' باقیوں کا کوئی پتا نہیں اور وہ ایک میں نہیں ہوں بالکل بھی۔"

ہاشم نے شاید اس جواب کی توقع نہیں کی تھی' تبھی تعجب سے ابرو سوالیہ اٹھائی۔

"تو؟"

کمپیوٹر چیئر گھماتی' ماتھے پہ کٹے بالوں والی لڑکی سامنے ہوئی' اور ہاشم کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"وہ میں ہوں' حنین یوسف ذوالفقار خان۔"

(عرف حنہ' عرف کنو بیگم) سعدی نے اتنا آہستہ بڑبڑایا کہ اپنے سوا کسی کو آواز نہیں آئی۔

"ہوں۔ گڈ!" ہاشم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ بے نیازی سے واپس گھوم گئی۔

"حنین تو انجینئر بن ہی جائے گی' یہ سارہ خالہ کی طرح پڑھائی میں بہت اچھی ہے۔"

"کیا۔ فارس کی کوئی اور بہن بھی ہے؟"

اورنگزیب کاردار نے چونک کر فارس کو دیکھا۔ وہ موبائل سے نظریں ہٹائے بغیر ہاتھ مسلسل چلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں' وہ وارث کی بیوی ہے۔ اصل میں سارہ میری فرسٹ کزن بھی ہے' تو بچے بچپن سے خالہ بولتے ہیں' بعد میں اس کی شادی میرے بھائی سے ہو گئی تو ان کی ممانی بھی بن گئی۔" ندرت نے تفصیل سے بتایا۔ مگر سعدی کو اس نامکمل تعارف پہ بے چینی ہوئی۔

"وہ یوکے گئی ہوئی ہیں پی ایچ ڈی کرنے اور وہ پراسیس ڈیزائن میں پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی پاکستانی ہیں۔" ہاشم نے مسکرا کر سر ہلایا اور اورنگزیب پھر سے گھڑی کو دیکھنے لگے۔ سعدی کو لگا' کوئی متاثر نہیں ہوا۔ اس نے ہاشم سے پوچھا۔

"آپ نے کہاں سے پڑھا ہے؟"

"اسٹین فورڈ سے۔ میں لائیر ہوں۔"

سعدی کے لب "اوہ۔" میں سکڑے۔ "تو آپ وکیل ہیں۔ میری پھپھو بھی وکیل ہیں۔"

"انہوں نے کہاں سے پڑھا ہے؟" وہ اسی نرم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

"یہیں پاکستان سے۔" سعدی کے لہجے میں فخر تھا۔

ندرت چائے کے لیے انہیں تو اورنگ زیب منع کرنے لگے ان کو جانے کی عجلت تھی۔ ان کا وقت بے حد قیمتی تھا۔ مگر ندرت بصد اصرار چلی ہی گئیں۔

"تم میرے ساتھ روف کی طرف آؤ گے؟" انہوں نے ہاشم کو مخاطب کیا۔

"جی' مگر میں وہاں سے جلدی اٹھ جاؤں گا' شیری نے کوئی نئی مووی لی تھی' ہمارا ساتھ دیکھنے کا پروگرام تھا۔" اورنگ زیب صاحب نے ہوں میں سر کو خم دیا۔

ایک دفعہ پھر گھڑی دیکھی۔ اس سے پہلے کہ وہ فارس سے کہتے کہ اپنی بہن کو فضول کی خاطر داری سے منع کریں۔

کمپیوٹر چیئر کے پیچھے گھومتے حنین سامنے ہوئی۔
"کون سی مووی دیکھنے جا رہے ہیں آپ؟" ہاشم نے بے اختیار اسے دیکھا۔
"ایک نئی امریکی مووی آئی ہے۔"
"آپ نام بتائیں' میں نے دیکھ رکھی ہوگی۔"
"یہ..." وہ متذبذب ہوا" ابھی کچھ عرصے پہلے ریلیز ہوئی ہے۔ بورن الٹی میٹم۔"
"اوہ... بورن سیریز۔" حنین نے منہ بنایا" اس کا صرف پہلا پارٹ اچھا تھا' تیسرے والا پارٹ کافی اوور ایگ کیا گیا ہے' بورن آئی ڈینٹٹی Identity Bourne والی بات نہیں ہے اس میں۔"
ہاشم نے مسکراتے ہوئے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ تم بورن سیریز کے ناولز کی بات نہیں کر رہیں؟"
"آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں ناول پڑھ کر ظاہر کر رہی ہوں کہ میں نے مووی بھی دیکھ رکھی ہے؟ شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ یہ سیریز ان ناولز پہ صرف Losely Based ہے اور جب آپ یہ تیسرا پارٹ دیکھیں' اور اکثر جگہوں پہ کیمرہ بری طرح ہلتا ہوا محسوس ہو' اور لگے جیسے کیمرہ مین کو رعشہ لاحق ہے تو جان لیجئے گا کہ آپ سے پہلے یہ فلم دیکھ لینے والی حنین یوسف سچ کہہ رہی تھی اور میں اس فلم کو مزید ڈسکس کرنا نہیں چاہتی' مجھے اس طرح کی فلمیں زیادہ پسند نہیں۔ سو بات ختم!"
ہاشم نے صرف مسکرا کر سر ہلایا' مگر اورنگ زیب کاردار آنکھیں سکیڑ کر اس کو دیکھنے لگے تھے۔
"تو تمہیں کس طرح کی فلمیں پسند ہیں؟" وہ ابھی بھی پُرتکلف اور سرد آواز میں پوچھ رہے تھے مگر توجہ پوری اس کی طرف تھی۔ سعدی نے گہری سانس لے کر سر جھکا' جیسے کچھ سننے کی تاب اس میں نہیں تھی

حنین نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔
"فلم کا اچھا ہونے کے لیے کسی خاص طرح کا ہونا ضروری نہیں ہوتا' پلاٹ اور کرداروں کو اچھا ہونا چاہیے اور کسی بھی کہانی کے اچھا ہونے کا مطلب حقیقت سے قریب ہونا نہیں کنونسنگ ہونا ہے۔ مجھے ایسی امریکی فلمیں نہیں پسند جن میں ہیرو مار کھا کھا کر بھی نہیں مرتا' مگر ڈائی ہارڈ مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے وار فلمیں بھی سخت ناپسند ہیں مگر "دی لاسٹ سمورائی" بہت اچھی ہے۔ جادوئی فینٹسی تو مجھے زہر لگتی ہے مگر ہیری پوٹر اور لارڈ آف دی رنگز کی کیا بات ہے۔ سائنس فکشن بھی بہت بور کرتی ہیں مجھے مگر "آئی روبوٹ" میں بار بار دیکھ سکتی ہوں۔ سائیکو تھرلرز سے تو مجھے چڑ ہے مگر سائلنس آف دی لیمب میری فیورٹ ہے۔ پیریڈ فلمیں بھی بعض اوقات بہت مصنوعی ہوجاتی ہیں مگر گلیڈی ایٹر' بریو ہارٹ اور ٹرائے پارٹ میں میری جان ہے۔"
وہ تب خاموش ہوئی جب چائے آئی اور اورنگ زیب صاحب نے کپ پکڑ بھی لیا اور گھونٹ بھر بھی لیا۔ دیکھا ابھی تک وہ اسی کو رہے تھے۔
"تو پھر تمہیں آخر پسند کس طرح کی انگریزی فلمیں ہیں؟"
"کس نے کہا مجھے انگریزی فلمیں پسند ہیں؟ ہالی ووڈ کی ہر فلم اب ایک جیسی لگنے لگی ہے۔ میں تو ایرانی' کورین' چائنیز' تامل اور ہسپانوی فلمیں دیکھتی ہوں زیادہ شوق سے اور ہسپانوی بھی وہ جو اسپین کی نہیں بلکہ کولمبیا کی ہسپانوی زبان میں بنی فلمیں ہوں۔"
ہاشم نے باپ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"اور ایک لائق اسٹوڈنٹ کو فلمیں دیکھنے کا فارغ وقت کیسے مل جاتا ہے؟"
"کس نے کہا کہ میں اپنا فارغ وقت صرف موویز پہ لگاتی ہوں؟ مجھے تو کمپیوٹر گیمز زیادہ پسند ہیں۔ میں نے اب تک کال آف ڈیوٹی میں بنا ہے کتنے..."
"حنین اگر تم ابھی سے ابھی خاموش ہو کر ہمیں

شکریے کا موقع دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کل تمہارے لیے چھ عدد سیخ کباب لاؤں گا۔" سعدی نے بس ہاتھ نہیں جوڑے، لہجہ ورنہ ایسا ہی تھا۔ حنین نے سنجیدگی سے ذرا مڑ کر اسے دیکھا۔

"چھ نہیں، بارہ۔ اور ساتھ میں مایونیز والی ساس بھی۔" اور واپس گھوم گئی۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔" سعدی نے جھلا کر گویا جان چھڑائی۔ اور تگزیب صاحب آدھی چائے پی چکے تھے۔ باکس آفس ختم ہوا تو باقی چائے کی امید بھی دم توڑ گئی۔ وہ اٹھ گئے۔

"فنکشن میں آنا اور اس بچی کو بھی ساتھ لانا۔" دروازے تک جاتے انہوں نے ندرت سے بس اتنا کہا۔ سعدی اور وہ انہیں چھوڑنے باہر تک آئے۔ فارس وہیں بیٹھا تھا۔

"جب تک تمہارا اسکالرشپ فائنل نہیں ہوتا، تم میرے گھر آجایا کرو، میری اسٹڈی تمہیں ضرور متاثر کرے گی اور تم وہاں بیٹھ کر بہت کچھ پڑھ بھی سکو گے۔" ہاشم نے کار کے ساتھ کھڑے سعدی کو جب یہ بات کہی تو اس نے اسے ازراہ مروت کی جانے والی پیشکش سمجھا، مگر آخری خدا حافظ سے پہلے جب ہاشم نے یہ دہرایا تو سعدی نے بھی مسکرا کر آنے کا وعدہ کر لیا۔ گو کہ اسے بالکل بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ کاردار ز کے گھر جائے گا۔

اسے غلط لگتا تھا۔

☆ ☆ ☆

زمر فون کان سے لگائے لاؤنج میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شدید اضطراب رقم تھا۔ دوسری جانب گھنٹی جا رہی تھی۔

وفعتاً وہ رکی۔ "جی! میں زمر بات کر رہی ہوں، جی بالکل۔۔۔ میں نے طلبا کی فہرست معلوم کرنے کے لیے کال کی تھی جو اسکالرشپ کے لیے نامزد ہوئے ہیں۔"

ایک ہتھیلی پہ لسٹ انگلی پہ لپیٹتی، بظاہر نارمل انداز میں کہہ رہی تھی۔

"آپ مجھے وہ پانچ نام پڑھ کر سنا سکتے ہیں؟ جی۔۔۔ جی ہولڈ۔" وہ لب آپس میں پیوست کیے منتظر ہوگئی۔ چہرے پہ تناؤ بڑھتا گیا۔ ایک، دو، پانچ۔

"کیا یہی تمام نام ہیں؟ آر یو شیور؟" آہستہ آہستہ آنکھوں میں امید کی جوت بجھتی گئی۔

"اوکے۔۔۔ مگر کیا آپ کاؤنٹر چیک کر سکتے ہیں؟ اس فہرست میں واقعی کسی سعدی یوسف کا نام نہیں ہے؟" ایک آخری امید۔۔۔ وہی جس پہ سب کی بنیاد قائم ہے۔ مگر جواب سن کر ساری بنیاد ڈوب گئی۔

"اوکے۔" اسے اپنی آواز مدھم سی سنائی دی۔ آہستہ سے فون رکھا اور صوفے پہ بیٹھ گئی۔ کمرے سے فرحانہ کے دروازہ کھولنے کی آواز آئی۔ لحاف کا بنڈل بنا کر اٹھائے، وہ اسٹور روم کی طرف جا رہی تھیں۔ اسے زرد و شل سا بیٹھے دیکھ کر رکیں۔

"کیا ہوا؟" وہ چونکی، پھر پھیکا سا مسکرائی۔

"کچھ نہیں ہوا۔" اور یہی تو صدمہ تھا کہ کچھ نہیں ہوا۔

☆ ☆ ☆

آج کمپیوٹر چیئر خالی تھی کیونکہ حنین صوفے پہ بیٹھی تھی۔ گود میں پلیٹ تھی اور وہ ابھی تک کھا رہی تھی۔ ان کی "ون ڈش" پارٹی ختم ہو چکی تھی۔

زمر بڑے صوفے پہ بیٹھی ٹشو سے نفاست سے لب تھپتھپا رہی تھی۔ سعدی، امی کے ساتھ برتن اٹھوا رہا تھا۔ سیم باقی ماندہ پیپسی پی رہا تھا۔

"ہاں، میں نے بنا کیا تھا۔" ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے زمر نے سعدی کے سوال کا جواب دیا اور پھر اس کی طرف دیکھ کر سکون سے بولی۔ "ناموں کا اعلان ابھی نہیں ہوا۔ شاید دو تین دن مزید لگیں۔"

"اوہ۔" سعدی کا جوش، امید، خوف، سب ٹھنڈا ہوا۔ وہ آخری پلیٹ ندرت کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے میں رکھ کر زمر کے ساتھ صوفے پہ آبیٹھا۔ گھٹنوں پہ کہنیاں رکھے، آگے کو جھک کر بیٹھے وہ مایوس لگ رہا تھا۔

"سعدی! تمہیں اسکالرشپ مل جائے گا، بعض دفعہ لوگ میرٹ پہ اسکالرشپ نہیں بانٹتے، بلکہ

ناانصافی کر جاتے ہیں' اس کے باوجود تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔" اس نے سعدی کو کندھے کو تھپکا

وہ "ہوں۔" کہہ کر مسکرا دیا۔ مگر وہ بددل زیادہ تھا۔

تب ہی جب گھنٹی بجی تو اس نے کہا۔

"سیم 'سوتے آلو! جاؤ جا کر دروازہ کھولو۔ کبھی کوئی کام بھی کر لیا کرو۔"

سیم نے فوراً تعمیل کی۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے پیچھے فارس تھا۔ چوکھٹ پہ وہ ذرا دیر کو ٹھٹکا۔ زمر بھی اسے دیکھ کر ذرا زیادہ سیدھی ہوئی۔

"سوری' میں غلط وقت پہ آ گیا۔ وہ جو چیزیں کہی تھیں آپا نے' وہی لینے آیا تھا۔" اور وہ بالکل بھی نادم نہیں نظر آ رہا تھا۔

"السلام علیکم ماموں' آئیں۔ ہم بس پارٹی ختم کر چکے تھے۔" سعدی اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہوں... میں بھی بس نکلنے والی تھی اور آپ ٹھیک ہیں؟" زمر اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے اسے دیکھ کر ذرا سا مسکرائی۔ فارس نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا اور میز کی حالت کو۔ پارٹی واقعی ختم ہو چکی تھی۔

(صبح آپا نے تو کہا تھا کہ زمر اور بچوں نے شام کو پارٹی کرنی ہے؟ میں لیٹ ہو گیا یا ان کے جلدی نمٹ گئے؟) اس نے سوچا پھر سر جھٹکا۔ اسے کیا' وہ تو اپنی چیزیں اٹھانے آیا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے' اسے کل صبح لینی تھیں وہ چیزیں' لیکن اگر جلدی آ گیا تو کیا ہوا بھلا؟

"یا۔ ایم فائن۔" اس نے کندھے اچکائے' پھر کچن کی طرف رخ کر کے آواز دی۔ "آپا' میرا بیگ دے دیں تو میں جاؤں۔"

"اوہ' تم ابھی آ گئے' میں سمجھی کل آؤ گے۔" ندرت ہاتھ صاف کرتی حیرت سے ادھر آئیں۔ "اچھا بیٹھو' میں لاتی ہوں۔"

زمر نے اپنی چیزیں سمیٹ لی تھیں۔ صرف کار کی چابیاں ہاتھ میں پکڑ رکھی تھیں۔ اب اسے اٹھنا تھا' مگر حنین سامنے بیٹھی' بہت ہی دل جمعی سے پنیر سے بوٹی الگ کر کے کھا رہی تھی۔ زمر نے اسے دیکھا تو وہ ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ گھر کا سب سے پُراعتماد بچہ پھپھو کے دیکھنے پہ شرما جاتا تھا۔ مسکرا کر کھانے لگی۔ زمر بھی مسکرا دی اور فارس کو دیکھا' جو ابھی تک کھڑا تھا۔

سعدی نے سنگل صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹھ جائیں' یہ کاٹتا نہیں ہے۔"

مگر وہ نظر انداز کر کے آپا کی طرف بڑھ گیا جو اندر سے اس کا بیگ لا رہی تھیں۔

"کیا بس یہی بھجوایا ہے سلیم انکل نے؟" اس نے بیگ کو ہاتھوں میں لے کر ٹٹولا جیسے وزن چیک کیا۔

"ہاں' ایک دفعہ دیکھ کر تسلی کر لو' سب کچھ پورا ہے۔" وہ بیٹھ گیا' بیگ کی زپ کھولی' زمر بھی بے اختیار دیکھنے لگی۔ باقی سب کو شاید پتا تھا کہ اندر کیا ہے۔

فارس نے ہاتھ ڈال کر صندوق نکالی۔ لمبی نالی والی antique گن۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اندر موجود گولیاں چیک کیں' ہوں' سب پورا تھا۔

"یہ ہمارے ابو کے ایک دوست تھے' ان کو شکار کا بہت شوق ہے' فارس کو ان کی کوئی گن اچھی لگی تو انہوں نے اس کے لیے بھجوا دی' مگر اس کو ضد تھی کہ یہ خریدے گا' تحفہ نہیں لے گا۔ یوں کرتے کرتے ان کو باہر جانا پڑ گیا تو بے منت ملنے کے بعد میری طرف ڈراپ کروا دی۔" ندرت نے زمر کو دیکھتے ہوئے وضاحت دی۔ فارس نے زپ بند کر کے سر اٹھایا تو وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو گنز پسند ہیں؟" تعجب سے اس نے ابرو اٹھائی۔ فارس نے دو تین سیکنڈ اس کی آنکھوں میں دیکھا' پھر ابرو اچکا کر بولا۔

"بہت زیادہ۔ کیونکہ گنز انسانوں کو نہیں مارتیں۔ انسان انسانوں کو مارتے ہیں۔"

"آ... میرا یہ مطلب نہیں تھا... اور آپ کی پڑھائی ٹھیک جا رہی ہے؟" اس نے بات بدلی۔ صوفے کے کنارے ٹکی' وہ بس جانے کی تیاری میں تھی۔

"ہوں۔ ٹھیک۔" اسے دیکھتے ہوئے فارس ٹھہرا۔

"آپ نے جو پچھلے ہفتے چند آؤٹ فوٹو کاپی کروا کر کلاس

میں دیا تھا' وہ مجھے نہیں ملا۔"
"اوہ... مگر وہ تو آپ کے آنے کے بعد دیا گیا تھا۔"
"شاید ابھی کوئی میری اہمیت نہیں ہے وہاں۔"
اس نے شانے اچکا دیے۔ زمر فکرمند ہوئی۔
"پھر تو آپ کو وہ تینوں ٹاپکس سمجھ میں نہیں آئے ہوں گے۔"
"سب اوپر سے گزر گیا۔" ہاتھ سے سر کے اوپر اشارہ کیا۔ "اگر آپ کے پاس وقت ہو تو؟"
"جی' بالکل' میں کل' نہیں پرسوں۔" ٹھوڑی پہ انگلی رکھے اس نے سوچا۔ "ہاں پرسوں آپ میرے پاس آئے گا کلاس سے پہلے میں تب تک آپ کے لیے وہ نوٹس دوبارہ کاپی کروا دوں گی۔"
"شیور تھینکس۔" اس نے بس اتنا کہا۔ حنین اب ہاتھ دھونے کچن میں جا چکی تھی۔
زمر جانے کے لیے اٹھ گئی مگر اٹھنے سے قبل اس نے چاہا کشن کے پیچھے رکھیں اور ان کو دیکھے بنا کھڑی ہوئی۔ فارس نے بیگ کندھے پہ ڈالتے ہوئے کن انکھیوں سے یہ دیکھا تھا۔ اسے چھوڑنے باہر گیا۔ حنین واپس آئی تو وہ جا چکی تھی۔ وہ ایک دم کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی۔
فارس چپلیں سکیڑ کر اب بغور حنین کو دیکھ رہا تھا۔
دفعتاً" وہ جھکی' چہرے پہ سارے زمانے کی خوشی در آئی
"پھپھو پھر بھول گئیں۔" اور جلدی سے صوفے تک آئی اور نیچے ہاتھ مارا۔ کشن ہٹے کیا" یہ رہا چابیوں کا گچھا۔ اس نے فاتحانہ انداز میں وہ اٹھایا اور راہداری کی طرف لپکی۔ فارس کو ساں تک آوازیں آ رہی تھیں۔
زمر اور سعدی واپس آئے تھے۔
"پھپھو چابی بھول گئیں۔" سعدی نے پکارا۔
حنین ان کو چابی دے رہی تھی' زمر کچھ کہہ رہی تھی... ہر دفعہ کا معمول... سعدی ہر دفعہ حیران ہوتا' پھر بھی ہنس دیتا۔ اب بھی ہنس دیا۔ وہ چلی گئی اور گھر خاموش ہو گیا' حالانکہ وہ تو اتنا بولتی بھی نہیں تھی' خاموشی ساتھ لاتی تھی' خاموشی چھوڑ جاتی تھی۔
حنین واپس آئی تو اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ بڑی فرصت سے اس نے پلیٹ اٹھائی' اور کچن میں چلی گئی۔
کچھ دیر بعد فارس جب ان کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلا تو گاڑی میں بیٹھتے ہی بیگ پچھلی سیٹ پہ پھینکا' ڈیش بورڈ کا خانہ کھولا تو ادھر ادھر چیزیں پلٹیں۔ پھر وہ مل گیا۔
فوٹو کاپی شدہ نوٹس۔
وہ اسے اٹھائے باہر نکلا' سڑک کنارے ایک کوڑے کے بڑے سے ڈبے کے اوپر کھڑے ہو کر' دونوں ہاتھوں میں اسے پکڑتے اس کے چار ٹکڑے کیے اور اندر پھینک دیا۔ پھر دور آسمان کو دیکھتے ہوئے گہری سانس لی۔
"اب منہ سے نکل جائے کچھ تو بندہ کیا کرے؟"
شانے اچکا کر وہ واپس ہو لیا۔

☼ ☼ ☼

کاردار ز کا قصر اپنی پوری آب و تاب سے اس سبزہ زار پہ کھڑا تھا' لان میں باوردی ملازموں کی آمد و رفت جاری تھی۔ سارے بقیہ ماندہ کام جلدی جلدی نمٹائے جا رہے تھے۔ شادی میں دن نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔
سعدی یوسف نے مین ڈور کے سامنے کھڑے ہو کر چند گہرے سانس لیے۔
"ایک آدمی... مروت میں جنبش کرے اور میں فوراً" سے پہنچ جاؤں کیا یہ اچھا لگتا ہے؟" ابھی جب وہ فارس سے ملا تھا تو اس نے پوچھا تھا۔
"اچھا لگتا ہو یا برا' میں نکل رہا ہوں اب تم ادھر بیٹھ کر ٹی وی دیکھو' دیواروں سے باتیں کرو یا ہاشم سے مل آؤ' تمہاری مرضی۔" وہ چابی اور والٹ اٹھاتے ہوئے بولا تو سعدی نے تندی سے اسے دیکھا۔
"ایسا سلوک کرتا ہے کوئی مہمان کے ساتھ؟"
"مہمان کون؟" فارس نے سر اٹھا کر واقعی تعجب سے پوچھا۔
"چھوڑیں یار..." وہ بددل ہوا۔ "اچھا آپ جائیں مگر... وہ جو مجھے بیچانے ہی نہ تو؟"

"تو... ہاشم بھی کچھ بھولتا ہے؟" فارس نے سر جھٹکا۔ اس کے انداز پہ سعدی نے غور سے اسے دیکھا۔

"آپ کی اپنے کزن سے نہیں بنتی کیا؟ اس دن بھی آپ نے ان سے کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"دیکھو یار..." فارس نے ہاتھ اٹھا کر روک ٹوک... کہنا شروع کیا۔ "وہ وہ گا اچھا آدمی 'میرا سارا خیال' وہ گا اچھا 'مگر وہ میرے جیسے لوگ نہیں ہیں۔ ہم تم تو ذرا سیور ہوٹل پہ ماش کی دال کھا کر 'میٹھی چائے پی کر وہاں چارپائی پہ لیٹ جانے والے بندے ہیں۔ مگر یہ اور طرح کے لوگ ہیں۔ کی ویلیو ٹائپ۔ میں ان سے کبھی گھل مل نہیں سکا نہ سکتا ہوں۔ اب تم جا رہے ہو یا تمہیں اندر لاک کر جاؤں؟"

اور وہ اب دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ بجایا بھی نہیں تھا 'مگر اندر سے جیسے اسے دیکھ لیا گیا تھا۔ دروازہ کھلا اور فلپائنی ملازمہ میری اینجیو مسکراتی ہوئی کھڑی تھی۔

"گڈ ایوننگ۔"

"تھینکس... میں آ... ہاشم گھر پہ ہیں؟" ماموں کے کزن کو کیا کہہ کر پکارنا چاہیے 'سمجھ میں نہیں آیا۔

"اور آپ کون؟"

"میں سعدی ہوں 'اصل میں انہوں نے کہا تھا کہ..."

"سعدی یوسف خان 'فارس صاحب کے بھانجے؟ مسٹر کاردار نے آپ کے بارے میں اطلاع کر دی تھی' اگر وہ نہ ہوتے تو ان کے احکام کے مطابق میں آپ کو اسٹڈی میں لے جاتی 'لیکن چونکہ وہ ہیں 'اس لیے آپ ادھر آ جائیے۔"

میری نے اپنی خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے ادب سے اندر آنے کا اشارہ کیا کہ وہ واقعی حیران ہوا۔ بہر حال اس کا اعتماد بڑھا۔ وہ اندر آیا۔ نگاہیں گھما کر اونچے اور عالیشان لونگ روم کا جائزہ لیا 'اور پھر جو کہتا ہے کہ اسے خوب صورتی متوجہ نہیں کرتی 'وہ اس دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا ہے اور متاثر تو وہ بھی ہوا۔ (کتنا بڑا اور پیارا گھر ہے) مگر اتنا کہ اللہ ان کو نصیب کرے۔ آمین اور بس۔

میری کے پیچھے... تب میں قدم اٹھاتا وہ لاؤنج کے وسط میں آیا۔ ایک لمبے سے چیز لونگ کے کنارے پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے 'گھونٹ گھونٹ بھرتی وہ بیٹھی تھی جو یہاں کی مالکن لگتی تھی۔ سیدھے بھورے بال 'گوری نازک 'ہاشم کی سی سیاہ آنکھیں۔ دو انگلیوں سے لاکٹ میں پرویا پتھر چھیڑتی۔ آہٹ پہ سر اٹھایا 'مسکرائی اور سوالیہ نظروں سے میری کو دیکھا۔

"ہاشم صاحب کے مہمان ہیں یہ۔ بیٹھیے میں ان کو اطلاع کرتی ہوں۔" وہ سیڑھیوں کے لیے مڑی تو جواہرات نے مسکراتے ہوئے سعدی کو دیکھا۔ البتہ آنکھیں بالکل سرد تھیں۔

"میں فارس کا بھانجا ہوں 'سعدی یوسف۔" وہ ذرا سنجیدگی سے بولا۔ اپنے یہاں آنے کے فیصلے پہ پھر سے سوچا 'کہیں غلطی تو نہیں کی؟

"آئی سی!" جواہرات نے اثبات میں سر ہلایا۔ تاثرات نہیں بدلے۔

میری ابھی سیڑھیوں کے وسط میں تھی جب ہاشم کمرے سے نکلتا دکھائی دیا۔ ٹائی میں کوٹ پہنتا 'سعدی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے وہ نیچے اترنے لگا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم آئے ہو۔"

"آپ شاید جلدی میں ہیں 'ہاشم بھائی!" بس یہی منہ سے نکلا اور یہی طے ہو گیا۔

ہاشم اتر آیا تھا۔ مسکرا کر اس کا شانہ تھپکا۔

"میں واقعی جلدی میں ہوں اور مجھے واقعی بہت ضروری کام ہے 'مگر تمہیں میں اپنی اسٹڈی دکھانا چاہوں گا اور یہ میں اپنی خوشی کے لیے کر رہا ہوں۔" پھر ماں کو دیکھا۔

"کیا تعارف ہو چکے؟" اپنے سوال کا جواب خود ہی سمجھ کر "آؤ" کہتا اسے اوپر لے آیا۔ سیڑھیوں کے اختتام پہ پہنچ کر سعدی نے گردن موڑی۔

نیچے جواہرات ہنوز اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے آنے پہ خوش ہے یا غصے میں ہے 'اس کے تاثرات سے

بتانے سے قاصر تھے۔ وہ سر جھٹک کر ہاشم کے پیچھے ہو لیا۔

وہ وسیع اور طویل اسٹڈی تھی۔ کتابوں کے سائیڈنگ ریکس' ان کے پیچھے مزید ریکس۔ شیلف' ٹیبلز' سعدی نے ستائش سے آگے پیچھے گردن گھمائی۔

"واؤ۔ آپ تو واقعی پڑھنے والے لوگ لگتے ہیں۔" ہاشم کا دوستانہ رویہ' اس کو مزید پُراعتماد کر رہا تھا۔ اس کی بات پہ ہاشم ہنس دیا۔

"تم آج کی شام میری کتابوں کے نام کرو۔ مجھے ایک کال کرنی ہے' باہر نکلنے سے قبل میں خدا حافظ کرنے آؤں گا۔ مگر تم کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤ گے۔"

"جی' اٹس او کے' میں۔" وہ شرمندہ ہوا مگر ہاشم مسکراتا ہوا پلٹ چکا تھا۔ ساتھ ہی وہ موبائل پہ نمبر بھی ڈائل کر رہا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ بہت اختیار سے ایک ہی وقت بہت سے محاذوں کو نمٹانے والا۔

نیچے جواہرات مگ کے آخری گھونٹ بھر رہی تھی۔ سر اٹھا کر اس نے ہاشم کو اسٹڈی سے نکل کر اپنے کمرے میں جاتے دیکھا تو مگ رکھ کر کھڑی ہوئی۔ باریک ہیل سے چلتی وہ لاؤنج کے سرے پہ بنے اپنے کمرے تک آئی۔

اندر قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے اورنگزیب ٹائی کی ناٹ درست کر رہے تھے۔ ایک سوٹ میں ملبوس ملازم ان کے کوٹ کو کندھے سے ہلکا سا برش کر کے پیچھے ہو کر تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا۔

"کیا تم مجھے میرے شوہر کے ساتھ تنہا چھوڑ دو گے؟" مسکرا کر کہتی جواہرات آئینے کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔ ملازم سر ہلا کر "فوراً" سے باہر نکل گیا۔ کف لنکس اٹھاتے اورنگزیب نے ایک ناپسندیدہ نظر اس پہ ڈالی۔

"کیا ہاشم تیار ہو گیا؟"

"پہلے وہ تمہارے بھانجے کے رشتے داروں کی خاطر مدارات تو کر لے۔ ویسے اس کام کے لیے کیا تم بہت نہیں تھے؟" مسکراہٹ ہنوز لبوں پہ تھی' مگر آنکھیں سلگ رہی تھیں۔

"فارس کے رشتے دار جب چاہیں ادھر آسکتے ہیں۔ اس کو اس کی ماں کا جائز حصہ میں نے کبھی نہیں دیا' تمہارے لیے اب اور کیا چاہتی ہو؟"

"اور اینکسی؟"

"وہ اس کے حصے سے بہت کم ہے' تم جانتی ہو۔" تلخی سے کہتے وہ ٹائی پن لگا رہے تھے۔

"تمہارے بس میں ہو تو تم اسے اور بھی بہت دے دو' بے شک' مگر وہ خود ہی کچھ لینے میں انٹرسٹڈ نہیں۔"

"کتنا اچھا ہو اگر تم اپنی شکل مجھے کم سے کم دکھایا کرو۔" وہ آئینے میں خود کو دیکھتے سامنے پلٹے بغیر بولے تھے۔ جواہرات کی مسکراہٹ ختم ہو چکی تھی۔ بمشکل اس نے ضبط کیا۔

"میں جا رہی تھی مگر تم سے مخاطب ہونے کی تکلیف میں نے صرف اس لیے اٹھائی کہ اگر ہم تینوں جا رہے ہیں تو فارس کا رشتہ دار میرے گھر میں اکیلا کیوں ہے؟"

"کیا تمہارا دوسرا بیٹا اپنے کمرے میں اپنی ناکامی کا سوگ نہیں منا رہا؟"

وہ جو سنگھار میز سے پرس اٹھانے آئی تھی' رکی' جھپٹ کر پرس اٹھایا اور گھوم کر اس کے سامنے آئی۔

"اسے ناکام مت کہو اورنگزیب۔ وہ اگر پہلے نمبر پہ نہیں آتا تو دوسرے نمبر سے نیچے بھی نہیں جاتا۔ اگر وہ اسٹینفورڈ یا ہارورڈ نہیں جاسکا' تب بھی تین بہترین یونیورسٹیز اسے ایڈمٹ کر چکی ہیں اور ایک دفعہ تم اس کا ڈی این اے ٹیسٹ کیوں نہیں کرا لیتے' تاکہ تمہیں بھی معلوم ہو جائے کہ وہ تمہارا ہی بیٹا ہے اور شاید پھر تم اس کی قدر کرنا شروع کر دو۔" شیرنی بپھر چکی تھی۔ اور اورنگزیب اب کالر درست کر رہے تھے۔

"وہ میرا بیٹا ہے' مجھے عزیز ہے' اس لیے جہاں اسے دیکھنا چاہتا ہوں' وہ وہاں نہیں ہے' اچھا ہوتا صرف ہاشم جیسا ہوتا نہیں ہوتا۔ وہ فارس کی بہن کے بچے۔ وہ مجھے زیادہ قابل لگتے تھے۔"

جواہرات شعلہ بار آنکھوں سے انہیں گھورتی رہی

'پھر تیزی سے پلٹ گئی۔ باہر آکر اس نے مؤدب کھڑی میری کو روکا۔

"فارس کے رشتے دار کو چائے وغیرہ بھجوا دینا پھر رات کا کھانا کھلائے بغیر مت جانے دینا' اور اس پہ نظر بھی رکھنا۔" گہری نظروں سے گھور کر کہا۔ میری نے سر ہلایا۔

اوپر ہاشم اپنے کمرے سے نکل کر اسٹڈی میں جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

اندر سعدی ایک کرسی پہ بیٹھا' کسی کتاب کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ وہ اتنا محو تھا کہ جب ہاشم اس کے قریب آیا تو بھی نہیں ہلا' بس پڑھتا رہا۔ ہاشم نے گردن ترچھی کر کے کتاب کا سرورق دیکھا۔

"یہ کہاں سے نکال لی تم نے؟ میں تو اسے بھول بھی چکا تھا۔"

سعدی چونکا' پھر اسے دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہوا۔

"اوہ۔ میرا خیال تھا آپ جا چکے ہیں۔ بلکہ آپ جایئے ہاشم بھائی' مجھے ورنہ لگے گا کہ میں آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں۔"

ہاشم نے جواب دیے بنا کتاب اس کے ہاتھ سے لی' الٹی پلٹی۔ پہلے صفحے پہ قلم سے لکھا تھا۔ "ہاشم کاردار کے نام۔ شاید کبھی ضرورت پڑے فقط' محمد اولیٰ۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"محمد اولیٰ اور محمد ثانی' یہ دو جڑواں بھائی تھے میرے ساتھ لاء اسکول میں۔ محمد اولیٰ نے مجھے یہ کتاب دی تھی' وہ خود کسی ڈراما سے گزرا تھا تو اس کو شاید اس کتاب نے ٹھیک ہونے میں مدد کی تھی۔ واٹ ایور مجھے تو یاد بھی نہیں ٹھیک سے۔" وہ اس کی پشت کو پڑھنے لگا۔ "یہ تیرہویں صدی کے کسی مسلمان عالم کی لکھی گئی کتاب ہے۔ میں نے تب پڑھی تھی اچھی تھی مگر اب بھول چکا ہوں۔ کیا تمہیں پسند آئی؟" اس نے چہرہ اٹھا کر سعدی کو دیکھا۔

"بہت زیادہ عجیب چارم ہے اس میں' جیسے میں شیخ کے زمانے میں واپس چلا گیا ہوں۔"

ہاشم نے کتاب میز پہ رکھی' جھک کر کھڑے ہوئے' قلم نکال کر پہلے صفحے پہ محمد اولیٰ کے دستخط تلے لکھا۔

"For the reading pleasure of saadi yousuf"

نیچے اپنے سائن کیے' تاریخ ڈالی اور کتاب بند کر کے اسے تھمائی۔

"پہلی دفعہ میرے پاس سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔"

"ارے۔ تھینک یو.... مگر اس کی ضرورت نہیں تھی۔" وہ شرمندہ ہوا۔

"ضرورت مجھے بھی نہیں تھی مگر تم ذہین لڑکے ہو' اور میں ذہین لوگوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ میں صرف ذہین جمع مخلص لوگوں سے متاثر ہوتا ہوں اور تم وہ بھی ہو۔ کھانا کھا کر جانا۔" کندھا تھپک کر بالکل کسی بڑے بھائی کی طرح' وہ کوٹ کا بٹن بند کرتا مڑ گیا اور تیز تیز باہر نکل گیا۔

"کیا بندہ ہے۔" سعدی نے ستائش سے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

میڈم رمشہ کے آفس میں خاموشی چھائی تھی۔ میز کے دونوں سروں پہ چائے کے کپ دھرے تھے۔ میڈم کی طرف والا تو آدھا خالی تھا۔ مگر زمر کی چائے بالائی کی تہہ تلے چھپی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ وہ تنی ہوئی گردن اور اس سے زیادہ تنے ہوئے نقوش کے ساتھ سامنے بیٹھی خاتون کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں' کھل کر کہیں زمر۔" انہوں نے بہت سکون سے کہا۔ زمر نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"میں کھل کر بات کرنے ہی آئی تھی کیوں کہ مجھے لگتا ہے مسز رمشہ بلگرامی کہ آپ نے میرٹ پہ اسکالر شپ دینے کے بجائے' ان امیدواروں کو دیے ہیں جن کے تعلیمی اداروں یا خود انہوں نے آپ کو اس کام کے لیے کمیشن دیا ہے اور مجھے ایسے مت دیکھیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے اور میں زمر یوسف ہوں اس لیے میں کروں گی یہ کہ میں آپ کے

ادارے کے خلاف ایک چارج شیٹ تیار کروں گی اور پچھلے دس سال کے ریجیکٹ ہوئے امیدواروں کو تلاش کرکے سامنے لاؤں گی جن کا حق بالکل سعدی کی طرح مارا گیا تھا' اور میں ان کا موازنہ ان بچوں سے کروں گی جن کو آپ نے اسکالرشپ دیے ہیں اور نہ صرف یہ موازنہ میڈیا پہ آئے گا' بلکہ آپ کے اکاؤنٹس اور بینک بیلنس کی تمام تفصیل سمیت میں کورٹ میں جاؤں گی' جس کے نتیجے میں آپ کو اپنی جاب چھوڑنی پڑے گی' آپ کا گھر' بچے سب متاثر ہوں گے' اس لیے آپ ہر اس بچے کا نام لسٹ سے خارج کریں' جس کو ناجائز اسکالرشپ دیا گیا ہے۔"

وہ خاموش ہو کر' بیٹھ گئی' تو میڈم رمشہ نے سر ہلایا' تحمل سے جیسے ایک گہری سانس خارج کی اور اسی اطمینان سے اسے دیکھا۔

"آپ نے کہہ لیا زمر؟"

"اور اب میں آپ کے کہنے کی منتظر ہوں۔" اس کا لہجہ بے لچک تھا۔

میڈم رمشہ جھکیں' دراز سے ایک فائل نکالی' سیدھی ہو کر اس کے آگے رکھی اور بولیں۔ "اس کے پہلے صفحے پہ سعدی کا اکیڈمک ریکارڈ اور تمام کوائف ہیں اور اگلے صفحوں پہ ان پانچ بچوں کے۔ آپ ایک نظر دیکھ لیجیے' اس کے بعد آپ جس کا نام کہیں گی' میں نکال کر سعدی کا ڈال دوں گی۔"

زمر نے تندی سے ان کو دیکھتے فائل اٹھائی' کھولی اور پہلا صفحہ سامنے کیا۔ سعدی کے کوائف پڑھتے گردن مزید اونچی ہوئی' آنکھوں میں فخر در آیا' ابرو اٹھا کر ان کو جتاتی نظروں سے دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا کر صفحہ پلٹا۔

تنے ہوئے تاثرات کے ساتھ وہ پڑھتی گئی۔ صفحے الٹتی گئی۔ آہستہ آہستہ نقوش ڈھیلے ہوئے' کندھے ڈھلکے' بھنویں خفگی مگر بے بسی سے بھنچیں۔ فائل ختم کرکے وہ کتنی ہی دیر اس کو دیکھتی لب کاٹتی رہی۔

"اب ان میں سے کس کا نام آپ نکلوانا چاہتی ہیں زمر؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ زمر نے خاموشی سے ان کو دیکھا اور فائل آہستہ سے میز پہ ڈالی۔

"زمر! اپنے بچے ہم سب کو پیارے ہوتے ہیں' چاہے وہ پیارے نہ بھی ہوں۔ وہ ہم سب کو قابل لگتے ہیں' چاہے وہ قابل نہ بھی ہوں۔"

"آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ سعدی مستحق نہیں تھا؟"

"میں یہ کہہ رہی ہوں کہ یہ بچے سعدی سے زیادہ مستحق تھے۔"

زمر نے آنکھیں بند کرکے کنپٹی مسلی۔ وہ بے حد تھکاوٹ کا شکار لگ رہی تھی۔

"آئی ایم سوری' مگر اس سے زیادہ قابل اور غریب بچے تھے وہ پانچ۔ میری جگہ آپ ہوتیں تو آپ بھی یہی فیصلہ کرتیں۔"

زمر نے بند آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ ابھی کچھ دیر وہ آنکھیں نہیں کھولنا چاہتی تھی۔ خواب ٹوٹ چکا تھا' نیند کھل چکی تھی' مگر وہ کچھ اور دیر اسی خواب میں رہنا چاہتی تھی۔

"کیا اس نے کسی اور اسکالرشپ پروگرام میں اپلائی نہیں کیا؟"

زمر نے آنکھیں کھولیں۔ سارے خواب ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "وہ کر چکا ہے' وہاں بھی نہیں ملا۔"

"آئی ایم سوری!" وہ افسوس سے اسے دیکھ رہی تھیں اور زمر بھی ان کو دیکھتی کچھ سوچ رہی تھی' ذہن منتشر تھا' سوچیں بھٹک رہی تھیں' مگر وہ نقطہ سامنے تھا جس پہ اسے پہنچنا تھا۔ ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔

"مسز رمشہ! کیا آپ مجھے ایک فیور دیں گی؟"

☆ ☆ ☆

کتاب ہاتھ میں لیے وہ پڑھتے پڑھتے بالکونی میں جا بیٹھا تھا۔ باہر شام ابھی ہلکی نیلی تھی۔ دور تک پھیلا سبزہ زار اور وہاں سے نظر آتی فارس کی انیکسی۔

لائبریری کی بالکونی کے دائیں طرف ہاشم کی بالکونی

تھی اور اس کے مزید پرے ایک اور بالکونی۔ البتہ وہ ایک دوسرے سے جدا تھیں۔ کسی دوسری بالکونی تک جانے کے لیے آپ کو اندر سے ہی جانا پڑتا۔ سعدی ان سب سے بے خبر رہتا اگر اسے وہ آواز نہ آتی۔ ایسی آواز جیسے کوئی دم گھٹنے کی کیفیت میں کھانسنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ ہاشم کی بالکونی سے پرے ایک دوسری بالکونی کے کمرے کو کھلنے دروازے پہ وہ بیٹھا تھا۔ گھٹنوں میں تقریباً سر دیے وہ ازے 'کھانستا' سے قے کرنے کی کوشش کرتا وہ کم عمر نوجوان لگتا تھا۔ نہ وہ کمرے کے اندر تھا' نہ باہر نہ ہوش میں' نہ بے ہوش۔ درمیان میں تھا کہیں۔

کتاب پھینک کر وہ اندر بھاگا۔ لائبریری سے نکل کر ریلنگ کے اوپر آیا' بدحواسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر نیچے رہائی جواہرات کے صوفے پہ اسی کے انداز میں میری بیٹھی ٹک سے کافی پی رہی تھی۔ باقی سب سنسان پڑا تھا۔

"سنو اوپر آؤ جلدی۔" اس نے پکارا۔ میری گڑبڑا کر اٹھی' پھر سنبھل کر سیڑھیوں تک آئی۔ سعدی تب تک آگے جا کر ہاشم کے ساتھ والے کمرے کا ہینڈل گھمانے لگا تھا۔ وہ لاکڈ تھا۔

"کھانا تیار ہے' میں آپ کو بلانے ہی چلی تھی۔" وہ زینہ زینہ چڑھتی اوپر آئی۔

"اس کمرے میں کون ہے؟"

"آ... یہ نوشیرواں ہیں' مگر۔" وہ اسے دروازے سے زور آزمائی کرتے دیکھ کر رک گئی۔

"اسے کھولو... وہ ٹھیک نہیں ہے۔" وہ اب دروازے کو دھکا دے رہا تھا۔

میری کی جرأت پہ غصہ غالب آنے لگا۔ وہ تیزی سے اس کے سامنے آئی۔

"وہ آرام کر رہے ہیں اور ان کا حکم ہے کہ اس دوران اگر کسی نے ان کو تنگ کیا تو وہ بہت برہے پیش آئیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ میرے ساتھ ڈائننگ ہال..."

"اگر وہ لڑکا مر گیا تو تمہارے مالک تمہاری جان لینے میں کتنے سیکنڈ لگائیں گے' ہاں؟" وہ اس کی طرف مڑ کر اتنے غصے سے بولا کہ میری چپ ہو گئی۔

"اوکے' میں چابی لاتی ہوں' یہ ایسے نہیں کھلے گا۔"

وہ اب کے ذرا تیز رفتاری سے نیچے گئی۔ اس کے واپس آنے تک سعدی مسلسل دروازے کو زور زور سے ٹھڈے مار رہا تھا۔ چابی لگی تو وہ پیچھے ہوا۔ دروازہ کھلا تو بالکونی کا منظر دوسرے زاویے سے سامنے آیا۔ چوکھٹ پہ قریباً اوندھا گرا لڑکا' منہ سے نکلتا جھاگ' حلق سے آتی عجیب آوازیں... سعدی تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ "یا!" میری کا منہ کھل گیا۔

"تم ٹھیک ہو؟ نو' ادھر دیکھو۔" وہ جلدی جلدی لڑکے کو سیدھا کرتا' اسے جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی رنگت متغیر ہو رہی تھی' آنکھیں کھل بند رہی تھیں۔

"تم فکر مت کرو' تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے' ہم تمہیں ہاسپٹل لے جا رہے ہیں۔ تم سونا نہیں' جاگنے کی کوشش کرو!"

اس کا چہرہ پھیکا' وہ پریشانی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ نوشیرواں نے ادھ کھلی آنکھوں سے دھندلا سا منظر دیکھا۔ اس پہ جھکا لڑکا چھوٹے گھنگھریالے بال... پریشان آواز... اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا گیا۔

"گاڑی تیار کرواؤ اور ملازموں کو ادھر بھیجو' اسے اٹھانا ہے۔ دیکھ کیا رہی ہو' جلدی کرو۔" وہ میری کو ہکا بکا کھڑے دیکھ کر چیخا تھا۔

"میں سر کاردار..."

"ان کو بعد میں اطلاع کرنا' پہلے گاڑی نکلواؤ۔ جاؤ!"

میری سٹپٹا کر باہر بھاگی۔ یہ سب اس کے لیے بہت اچانک اور غیر متوقع تھا۔

☼ ☼ ☼

لاؤنج میں ٹی وی مدھم آواز میں چل رہا تھا۔ بڑے

ابا عینک لگائے، صوفے پہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ زمر نے چائے کے دو کپ میز پہ رکھے اور خود سامنے جا بیٹھی۔ الائچی اور دار چینی کی مہک، انہوں نے عینک کے اوپر سے نگاہ اٹھا کر کپوں کو دیکھا اور بھرا سے۔

"مہینے کا آخر چل رہا ہے اور تم خود کماتی ہو، اس لیے وہ تین ہزار سے اوپر مانگنے کا سوچنا بھی مت۔" وہ بار سے پڑھتے پڑھتے اطلاع دی۔

"میں کچھ اور مانگنے آئی ہوں۔" اپنا کپ لے کر اس نے ٹیک لگائی، پھر گھونٹ بھرتے ہوئے بڑے ابا کو دیکھنے لگی۔

"اور اس وقت آئی ہو جب تمہاری ماں گھر پہ نہیں ہے اس لیے اگر موضوع گفتگو ندرت کے رشتے دار کی شادی میں جانا ہے تو بھی صاف انکار ہے۔"

"آپ نے نئے ایئر پورٹ کے قریب جو عرصہ ہوا پلاٹ لے رکھا تھا میرے نام سے، اس کے کاغذات آپ کے پاس ہیں؟" جتنی سنجیدگی سے اس نے پوچھا، وہ اتنے ہی چونکے۔ عینک اتاری، اخبار رکھا اور اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"کیوں نہیں ہوں گے؟ وہ پلاٹ میری ساری زندگی کی کمائی ہے۔ تمہارے اور زلفی کے نام جو تھوڑا بہت جوڑا تھا، اس میں سے زلفی نے اپنا حصہ اپنی نوکری کے دوران ہی لے لیا تھا، کاروبار میں بھی لگایا اس نے، مگر کاروبار میں تو پیشانی کا لکھا چلتا ہے، اس کا پیسہ کم ہوا، بڑھا نہیں۔ تمہارے حصے سے یہ پلاٹ میں نے ان دونوں میں خریدا تھا اور اب وہ اچھا خاصا مہنگا ہو چکا ہے۔ اس کو بیچ کر میں تمہاری شادی کروں گا اور بہت دھوم دھام سے کروں گا۔"

"مگر فی الحال تو... میری شادی کا کوئی سلسلہ نہیں چل رہا۔"

"مگر جلد چلے گا۔ کچھ تمہاری پڑھائی، کچھ اس کم عمری میں نولی منگنی کے باعث ہم زیادہ ہی ڈھیلے ہو گئے تھے، ورنہ تمہاری شادی میں کر بھی چکا ہوتا۔ اب بھی رشتے دیکھ رہا ہوں، مگر... زمر! تم بے وجہ ایسے ذکر نہیں چھیڑا کرتیں... تو؟" سوالیہ ابرو اٹھائی۔

زمر چند لمحے بالکل خاموشی سے ان کو دیکھتی رہی۔ خاموشی، دنیا کا سب سے بڑا اقرار، سب سے بڑی سزا۔

"ابا... سعدی کو اسکالرشپ نہیں ملا۔"

وہ بالکل چپ ہو گئے۔ آنکھوں میں رنج و ملال ابھرا۔

"اناللہ... مگر شاید کسی اور جگہ سے۔"

"اب وقت نہیں ہے، وہ نہیں پڑھنے جا سکتا ماسوائے اس کے..." وہ رکی، ایک وقفہ دیا، مگر ابا کی آنکھوں سے نگاہ نہیں ہٹائی۔ "مگر ہم اس کی فیس بھر دیں۔"

"مگر ہم اتنی مہنگی یونیورسٹی افورڈ نہیں۔" الفاظ لبوں میں ٹوٹ گئے۔ وہ ایک دم شاکڈ سے اس کو دیکھنے لگے۔ "ایک منٹ... تم کہہ رہی ہو کہ..."

"میں بالکل یہی کہہ رہی ہوں۔ ہم وہ پلاٹ بیچ دیتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" شاک کی جگہ غصے نے لے لی۔ "وہ میری ساری زندگی کی کمائی ہے، وہ تمہارا حق ہے، تمہاری شادی، زیور، سب اس سے بنے گا، اور بقیہ رقم تمہارا بینک بیلنس ہو گی۔ وہ تمہارا فیوچر ہے۔"

"سعدی ہمارا فیوچر ہے۔"

"پانچ سال کی پڑھائی، ہر سال کی لاکھوں روپے کی فیس... نہیں زمر! میں یہ نہیں کر سکتا۔"

"یعنی آپ کو سعدی سے بالکل محبت نہیں ہے؟"

"مجھے ایموشنل بلیک میل مت کرو، یہ حربے مجھ پہ اثر نہیں کرتے۔" وہ تلخی سے اس کی بات کاٹ کر بولے۔ "مجھے وہ بہت پیارا ہے، اصل سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے، مگر مجھے حنین اور اسامہ بھی پیارے ہیں اور سب سے بڑھ کر، مجھے تم پیاری ہو۔ میں ندرت کے گھر کا آدھے سے زیادہ خرچا اٹھاتا ہوں، کل کو حنین بڑی ہو گی، اور پھر تمہاری شادی۔ جس وجہ سے ایک دفعہ شادی ٹوٹی، وہ دوبارہ نہیں دہرا سکتا میں۔"

"میری فکر مت کریں۔"

"تمہارے کہنے سے میں فکر کرنا چھوڑ تو نہیں سکتا میں باقی سب کو نظر انداز کر کے سارا پیسہ سعدی پہ

خرچ نہیں کر سکتا۔"

"جب وہ پڑھ کر آئے گا تو اتنی اچھی جاب ملے گی اسے کہ چند سال میں سب بنا لے گا۔ پھر میں بھی تو کماتی ہوں۔" وہ بہت سکون سے کہہ رہی تھی۔

"لعنت ہے مجھ پہ، اگر میں اپنی بیٹی کو پیسہ کمانے کے لیے ضائع کردوں۔"

"اور اگر یوں تا ضائع کر دیا تو؟" وہ لمحے بھر کو چپ ہوئے مگر دلائل ختم نہیں ہوئے تھے۔

"وہ پاکستان میں بھی تو پڑھ سکتا ہے۔" زمر بہت بے زار ہوئی۔

"ابا! یہ بات مت کہیے گا دوبارہ، کسی لوکل یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف لیڈز سے پڑھنے میں کتنا فرق ہے ہم دونوں جانتے ہیں۔"

"وہ پیسہ ہماری سیکیورٹی ہے۔"

"سعدی ہماری سیکیورٹی ہے۔"

بڑے ابا نے جھنجلاہٹ سے اسے دیکھا، اب کے ان کی آنکھوں میں گہرا رنج تھا۔

"زمر! مت کرو اپنے ساتھ ایسا۔ وہ پیسہ تمہارا حق ہے۔ میں تمہاری خوشیوں کا راستہ خراب کر کے سعدی کا کیریئر نہیں بنا سکتا۔"

"دولت کسی شادی کی ضمانت ہوتی تو سب سے زیادہ خوش بادشاہوں کی بیٹیاں ہوتیں اور پتا ہے ابا سب سے زیادہ ناخوش شاہزادیاں ہی رہتی ہیں۔"

بڑے ابا نے تھک کر کپ اٹھایا۔ ان کی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ الائچی، دارچینی کی مہک سب زائل ہو چکا تھا۔

"میں نہیں چاہتا۔ تم کل کو اس بات پہ پچھتاؤ۔"

"کیا آپ بھی مجھ پہ خرچ کر کے پچھتائے ہیں۔"

وہ اداسی سے مسکرائی۔ انہوں نے نفی میں گردن کو جنبش دی۔

"کبھی بھی نہیں، مگر میرا دل نہیں مانتا اور سعدی بھی تو نہیں مانے گا۔"

"اسے کون بتائے گا؟ میں نے میم رمشہ سے بات کرلی ہے، وہ یہی سمجھے گا کہ وہ اسکالرشپ پہ جارہا ہے [illegible] پیسے آپ دے رہے ہیں تو وہ کبھی نہیں لے گا۔"

"میں نہیں دے رہا، تم دینا چاہ رہی ہو، مگر میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا بالکل بھی نہیں۔" وہ پھر سے مزاحمت کرنے لگے تھے۔ زمر نے آخری گھونٹ بھرا، کپ میز پہ رکھا، ہاتھ گویا جھاڑ کر کھڑی ہوئی۔

"ایسا ہے یور آنر کہ بات شروع کرنے سے پہلے میں نے پوچھا تھا کہ آپ کے پاس کاغذات ہیں یا نہیں تو جناب، وہ کاغذات اب آپ کے سیف میں نہیں ہیں۔ وہ میرے پاس ہیں، اور میں پراپرٹی ڈیلر سے پہلے ہی بات کر چکی ہوں اس لیے اگر آپ نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں آپ پہ مقدمہ کر سکتی ہوں اور کم از کم میرے حلقہ احباب میں تو کوئی اچھا وکیل میرے خلاف آپ کا کیس لڑے گا نہیں اور اگر کوئی مل بھی گیا آپ کو تو کم از کم اگلے سات سال تو میں آپ کو کورٹ کے چکر ضرور لگواؤں گی اس لیے فی الحال آپ کے پاس میری بات ماننے کے سوا کوئی آپشن نہیں ہے۔"

اور بہت ملال میں گھرے بڑے ابا ہولے سے ہنس دیے، مگر پھر ملال لوٹ آیا، وہ چائے کے برتن اٹھا کر واپس جارہی تھی۔ انہوں نے اسے پکارا۔

"اس سے اتنی محبت نہ کیا کرو، اللہ ورنہ بہت آزمائشیں ڈال دیتا ہے۔"

زمر گہری سانس لے کر پلٹی اور ان کو دیکھتے ہوئے رسان سے بولی۔

"عمر بن خطاب نے فرمایا تھا، محبت پہ انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔" "یہ میرے بس میں نہیں ہے، ابا۔" وہ آزردگی سے مسکرا کر کہتی وہاں سے چلی گئی۔

وہ فکرمند اور پریشان بیٹھے رہ گئے۔ ان کو آج احساس ہو رہا تھا کہ اس کی شادی میں غیر ضروری دیر کر کے انہوں نے غلطی کر دی۔ ان کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔

☆ ☆ ☆

اسپتال کی مرمریں راہداری میں ہیل سے بھاگتے

قدموں کی آواز پہ سعدی نے سر اٹھایا۔ جواہرات' اپنے شوہر کے آگے تیز تیز آرہی تھی' اپنے سارے میک اپ اور تیاری کے باوجود اس کا سفید پڑا پریشان چہرہ کسی سے چھپا نہیں تھا۔ سعدی کے پاس وہ رکی' متوحش نظروں سے بند دروازے کو دیکھا اور پھر اسے۔

"شیرو کیسا ہے؟"

"وہ ٹھیک ہے۔"

"ہاشم کہاں ہے؟" اورنگ زیب قریب آگئے۔

سعدی نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ اندر ہیں' آپ کے چھوٹے بیٹے کو ہوش آگیا ہے' اس کو فوڈ پوائزنگ ہو گئی تھی۔"

اورنگ زیب آگے بڑھ گئے' مگر جواہرات وہیں کھڑی مضطرب' سلگتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا تھا شیرو کو؟"

سعدی نے ایک نظر اورنگ زیب پہ ڈالی جو کمرے کا دروازہ کھول رہے تھے۔

"میرے سوال نظر انداز نہیں کیے جاتے جو بھی نام ہے تمہارا۔" وہ دبی دبی سی غرائی تھی۔ "میں اپنا اکیلا گھر تمہارے اوپر چھوڑ کر گئی تھی' اگر میرے بیٹے کی اس حالت کے ذمہ دار تم ہو تو تم بھگتو گے۔"

"مسز کاردار! آپ کے اکیلے گھر کے ڈھائی درجن ملازمین اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کے بیٹے کی طبیعت خراب تھی اور میں اسے صرف اسپتال لانے کا قصور وار ہوں۔" وہ شام میں اسے ملنے والے لڑکے سے زیادہ سنجیدہ اور سمجھ دار لگ رہا تھا' مگر جواہرات کے تنے تاثرات ہنوز ویسے تھے۔

"کس قسم کی چیز سے فوڈ پوائزنگ ہوئی اسے؟" وہ مشتبہ' غصے بھری نظروں سے اسے دیکھتے بھرے غرائی۔ "اس نے دوپہر کو وہی کھایا جو ہم سب نے کھایا تھا۔"

"اسے فوڈ پوائزنگ نہیں ہوئی۔"

جواہرات کی آنکھیں تحیر سے پھیلیں۔ "کیا مطلب؟ تم نے ابھی کہا۔"

"میں نہیں چاہتا تھا کہ کاردار صاحب کو یہ بات اس سے پہلی دفعہ ملنے سے پہلے پتا چلے۔" جیب سے ایک پیکٹ نکال کر اس کے سامنے کیا۔ "یہ ڈرگز مجھے اس کے پاس سے ملی تھیں اور خالی سگریٹ بھی۔ آپ کے بیٹے نے منشیات کی اوور ڈوز لے لی تھی' جس سے اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔"

جواہرات کی حالت یوں ہو گئی جیسے سانپ نے ڈنک مار دیا ہو۔ سفید چہرے اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس نے سعدی کے چہرے سے ہاتھ میں پکڑے پیکٹ تک کا سفر کیا۔

"تم۔ تم یہ کہہ رہے ہو کہ میرا بیٹا سب ایڈکٹ ہے؟"

"صرف میں نہیں' ڈاکٹر نے بھی یہی بتایا ہے۔ یقیناً" وہ کچھ عرصے سے ڈرگز لے رہا تھا۔"

جواہرات نے بولنے کی کوشش کی' مگر سارے الفاظ حلق میں کانٹے بن کر اٹک گئے۔ اس کا اندر باہر زخمی ہو گیا' آنکھوں میں نمی اتری' مگر وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"میرا بیٹا۔ وہ چوبیس گھنٹے میرے سامنے رہتا ہے' مجھے کبھی کیوں نہیں لگا کہ وہ ڈرگز لیتا ہے؟"

"آج کل کے لڑکوں کو پتا ہوتا ہے کہ انہیں کتنی مقدار لینی ہے اور بہت مہارت سے وہ یہ فن سیکھ جاتے ہیں کہ انہیں لوگوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی خود کو نارمل کیسے ظاہر کرنا ہے اور پھر ساتھ بیٹھے شخص کو بھی علم نہیں ہو سکتا کہ یہ لڑکا منشیات کے زیر اثر بیٹھا ہے۔ یہ بھی ڈاکٹر نے کہا ہے۔"

جواہرات نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا۔ تنے تاثرات ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ کندھے بھی ڈھلک چکے تھے۔

"مگر وہ زندہ ہے مسز کاردار! اور زندگی سے اہم کوئی نعمت نہیں ہوتی۔ اس کو محبت سے سمجھائے گا' وہ پلٹ آئے گا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ amor vincit omnia (محبت فاتح عالم ہے)۔ مجھے گھر جانا ہے' چلتا ہوں۔" وہ کہہ کر مڑنے لگا

تو جواہرات تیزی سے اس کی طرف مڑی۔

"کیا تم ... اس سے ملو گے نہیں؟"

"اس کی فیملی اس کے پاس ہے اور میری فیملی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔"

وہ ذرا سا مسکرا کر کہتا پلٹ گیا۔ جواہرات یک ٹک کھڑی اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے غائب ہو گیا تو وہ تیزی سے پرائیویٹ روم کے دروازے تک آئی۔

☆ ☆ ☆

شام کا آسمان ہلکا سرمئی تھا۔ سورج نے بادلوں کے نارنجی کناروں کو دہکا رکھا تھا اور لائبریری کی کھڑکی اس منظر کو واضح دکھا رہی تھی' اندر ایک کونے میں لمبی میز بچھی تھی۔ ایک سرے پہ تین لڑکیاں اپنی کتابوں میں مگن تھیں دوسرے سرے پہ متصل کرسیوں پہ وہ دونوں بیٹھے تھے۔ زمر سر جھکائے گردن ترچھی کیے کاغذ پہ کچھ لکھ رہی تھی اور فارس قریب بیٹھا ذرا سا ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"چلیں' یہ ٹاپک تو ختم ہوا۔ سب کلیئر تھا نا؟" آخری لفظ لکھ کر صفحہ اس کے سامنے کرتے ادھر زمر نے سر اٹھایا' ادھر فارس نے فوراً" سنجیدہ (اور سیدھے) ہوتے بہت توجہ سے اس کاغذ کو پڑھا۔

"جی' بالکل۔"

"او کے۔ اب آگے چلتے ہیں۔" وہ نوٹس کے صفحے پلٹ کر اگلے موضوع پہ آئی پھر قلم والے ہاتھ کو ذرا ہلاتی' روانی سے سمجھانے لگی۔ فارس نوٹس کو دیکھتا ذرا ذرا دیر بعد سر اثبات میں ہلا دیتا۔ براہ راست اس کے چہرے پہ صرف وہ ایک بار نگاہ ڈال سکا پھر سر جھکا لیا۔

زمر کا فون بجا تو وہ رکی' نمبر دیکھا اور موبائل کان سے لگایا۔

"جی سر! میں نے ہی وہ شیٹ آپ کو بھجوائی تھی۔" وہ رک کر سننے لگی۔ "جی بالکل' میں نے تمام اسٹوڈنٹس کی حاضری درج کی ہے سوائے حبیبہ وقار کے۔ میں نے دانستہ طور پہ اس کا خانہ خالی چھوڑا ہے' وہ ... پہ دلیل کرتی کہہ رہی تھی۔ فارس نے ترچھی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

"سر! صاف بات ہے' امتحان میں بیٹھنے کے لیے ساٹھ فیصد حاضری ضروری ہے اور اس بچی کی حاضری چالیس فیصد ہے' مگر چونکہ وہ ڈاکٹر طاہر اکرم کی بھانجی ہے' اس لیے ڈاکٹر صاحب نے مجھے کال کر کے اس چالیس کو ساٹھ بنانے کا کہا ہے سو میں نے یہ خانہ خالی چھوڑ دیا ہے کیونکہ میرا قلم تو اس کو ساٹھ نہیں کرے گا۔ آگے آپ کی مرضی' آپ اس کو ساٹھ کریں یا نوے۔ میں بری الذمہ ہوں۔"

سادگی سے ساری بات کہہ کر وہ ان کی سننے لگی۔ پھر الوداعی کلمات کہہ کر فون رکھا اور کتاب کی طرف متوجہ ہوئی۔

"خیریت میم؟"

زمر نے جھکے چہرے کے ساتھ ذرا مسکرا کر سر جھٹکا۔ "ہوں۔ یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔ کوئی بھی نوکری پھولوں کی سیج نہیں ہوتی۔" وہ کتاب دوبارہ کھولنے لگی۔ فارس نے اب کے ذرا غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"ایک بات پوچھوں؟" زمر نے سوالیہ نظریں اٹھائیں تو وہ کندھے ذرا اچکا کر ٹھوڑی سے شیو اکی اور انگوٹھے میں بناوٹ" ذرا ذرا رک کر پوچھتا بولا۔

"یونہی خیال آ گیا۔ اس دن جو آپ نے کیا سعدی کے گھر ... جان کر چابیاں بھولنا ..."

زمر کے لیے یہ جملہ غیر متوقع تھا۔ وہ لمحہ بھر کو بالکل دھک سے رہ گئی' پھر چہرے پہ سرخی سمٹ آئی۔ سر جھٹک کر اس نے کچھ کہنا چاہا پھر خود ہی رک گئی۔ چند ثانیے خاموشی میں گزر گئے۔ اگر وہ جان چکا تھا تو یہ زمر کی عادت نہیں تھی کہ وہ انکار کرتی۔

"مجھے نہیں پتا آپ کو سعدی کتنا عزیز ہے' مگر ہمارے لیے وہ خاندان کا پہلا بچہ تھا اور سب بچے برابر پیارے ہوتے ہیں' مگر جو توجہ پہلے کو ملتی ہے وہ دوسروں کے آنے تک ہم اس مقدار میں دینے سے

فاصر ہو چکے ہوتے ہیں۔ اسامہ چھوٹا ہے، فکر نہیں ہے...

وہ میرے ہر وقت صرف 'ہمارا سعدی' 'ہمارا سعدی' کرتے رہنے سے مجھ سے کافی Shy (شرمائی) رہنے لگی ہے۔ عرصہ پہلے میں واقعی کچھ بھول گئی تھی ایک دو دفعہ، لیکن بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ ہر دفعہ کھڑکی میں میرا انتظار کرنے لگی ہے۔ وہ بہت ذہین ہے اور دنیا ذہین لوگوں کو تنہا کر دیتی ہے۔ اسے ہمیشہ مجھ سے امید ہوتی ہے کہ میں اسے تنہا نہیں چھوڑوں گی' سو میں خود اسے ہر دفعہ یہ امید دینے میرے سے تنہا آتی ہوں۔"

قدرے توقف سے وہ سنجیدگی سے بولی۔

"ہو سکتا ہے آپ کو یہ غلط لگے مگر میرے نزدیک کسی عزیز شخص کو اپنے قریب رکھنے کے لیے کوئی بہانا کرنے میں کوئی برائی نہیں۔"

فارس نے بے اختیار ان تازہ فوٹو کاپی شدہ نوٹس کو دیکھا اور پھر زمر کو۔ "بالکل' میرے نزدیک بھی نہیں۔"

وہ اسی سنجیدگی سے ادھورا چھوڑا موضوع واپس کھولنے لگی۔ قدرے توقف کے بعد فارس ذرا کھنکھارا۔

"بتانے کا شکریہ۔ حنین کو نہیں بتاؤں گا۔ سیریسلی۔"

زمر نے صرف ایک کڑی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مجھے اس بات کی بالکل فکر نہیں' کیونکہ اتنا تو آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ میرا اعتبار توڑ کر آپ کبھی بھی بچ نہیں سکتے۔" پھر نوٹس اس کے سامنے رکھے اور سلسلہ کلام وہیں سے جوڑ لیا جہاں سے توڑا تھا۔

فارس اپنے چہرے پہ زمانے بھر کی بوریت سجائے خاموشی سے سنتا رہا۔

☆ ☆ ☆

مسز رشدہ کے آفس میں ایک دفعہ پھر چائے کے دو کپ میز کے مخالف کناروں پہ رکھے تھے۔ اس دفعہ سعدی کی طرف والا کپ آدھا خالی تھا اور مسز رشدہ کا ان چھوا۔ وہ ساری بات سعدی کو بتا کر اب بالکل خاموشی سے اس کا ردعمل دیکھ رہی تھیں۔

وہ ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "آپ یہ کہہ رہی ہیں میم! کہ آپ نے میرے ڈاکومنٹس ایک پرائیویٹ اسپانسر کو بھجوائے ہیں اور انہوں نے مجھے اسپانسر کرنے کی ہامی بھری ہے؟ اور وہ ہر سال میری فیس جمع کرواتے رہیں گے؟" وہ واقعی بے یقین تھا۔

"نہیں' تمام اخراجات جتنی رقم ہم دے رہے تھے وہی رقم وہ دیں گے۔"

"آ... ٹھیک ہے۔ مجھے نہیں پتا مجھے کیا کہنا چاہیے۔" وہ خوش تھا اور خوشی اتنی تھی کہ اس میں ٹھیک سے کوئی تاثر بھی نہیں دے پا رہا تھا۔ "مگر وہ ہیں کون؟"

میڈم نے خاموشی سے سامنے رکھے ڈیکور باسکٹ میں سے ایک کرسٹل بال نکالی اور اسے انگلیوں میں گھماتے ہوئے' نظریں سعدی کے چہرے سے ہٹائے بنا بولیں۔

"ہے کوئی جس کا دل بہت امیر ہے اور آپ پہ خرچ کرنے کو پیسہ بھی بہت ہے۔" پھر ذرا سنبھل کر گویا ہوئیں۔ "ایک چیریٹی بزنس مین ہیں' بہت سے اسٹوڈنٹس کو پرائیویٹ طور پر اسپانسر کرتے ہیں' آپ کے کوائف ان کو اچھے لگے اور سب سے اچھی یہ بات لگی کہ آپ نے ترجیحات میں اپنے خاندان کو پہلے نمبر پہ رکھا۔"

"جی مگر کیا میں ان کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟ مطلب اگر میں ان سے ملنا چاہوں تو...؟"

کرسٹل بال گھماتے ان کے ہاتھ رکے' وہ نفی میں سر ہلاتی پیچھے ہو کر بیٹھیں۔

"بالکل بھی نہیں سعدی! میرے کچھ اصول ہیں' میں اسپانسر کی کوئی تفصیل آپ کو فراہم نہیں کر سکتی۔"

"اگر میں اصرار کروں تو بھی نہیں؟ میں صرف ان کا شکریہ..."

"کچھ سوالوں کے جواب جاننا ضروری نہیں ہوتا ان کو سوال ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ میں آپ کا شکریہ

پینچوڑوں کی ان تک۔

"اچھا۔" وہ اداس ہوا۔ "کاش میں ان سے مل سکتا۔" پھر ذرا چونکا۔ "آپ میری زمر پھوپھو کو جانتی ہیں نا؟ آپ نے اُن کو بتایا یہ سب؟"

ذرا پرجوش ہو کر وہ آگے ہوا۔ میڈم نے جواب دینے سے پہلے بہت دیر تک اس کا تمتماتا چہرہ دیکھا۔

"کیا آپ چاہتے ہو کہ میں ان کو ابھی خبر کردوں؟"

"نہیں نہیں' پلیز آپ مت بتایئے گا' میں خود ان کو سرپرائز دوں گا۔ ٹھیک ہو سوچ۔ میں چلتا ہوں۔" جلدی جلدی اجازت مانگتا' شکریہ کرتا' دوبارہ آنے کا کہتا وہ دروازے کی طرف لپکا۔

"سعدی! آپ کی پھوپھو آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ ان کے لیے کبھی کوئی قربانی دینی پڑے تو پیچھے مت ہٹنا۔" وہ جاتے جاتے مڑا۔

"جی' بالکل۔ اچھا آپ مت بتایئے گا' میں خود بتاؤں گا۔" اور وہ باہر تھا۔ میڈم نے سر جھٹک کر گہری سانس اندر اتاری اور سوچا محبت ایک بہت سادہ اور بہت پیچیدہ شے ہے۔

☼ ☼ ☼

حنین' سعدی کے ساتھ آئی تھی اور جتنی دیر وہ مسلسل جوش سے بولتا' دادی اور پھوپھو کو اپنے اسکالر شپ کی تفصیل بتاتا رہا' حنین اس کیک کے تین ٹکڑے کھا چکی تھی جو سعدی نے راستے سے لیا تھا۔

"یعنی کہ تمہاری ساری پڑھائی مفت؟ اور اخراجات بھی؟ واہ بھئی یہ تو کمال ہو گیا۔"

بڑی امی بہت خوش تھیں' بار بار سعدی کے سر اور کندھے پہ ہاتھ پھیر کر کہتیں' پھر فوراً" اضافہ کرتیں۔

"ندرت سے امید نہیں تھی کہ بچوں کو پڑھا پائے گی' اصل میں تمہارا باپ بہت لائق تھا' تم اور حنہ اسی پہ گئے ہو۔"

(اور سعدی' حنہ کے لیے یہ باتیں بے اثر تھیں۔ بڑی امی کے پاس ایک پوری فہرست تھی کہ فلاں صدی میں' فلاں کے گھر ندرت نے مجھے یوں اور یوں

تا' اور ندرت کے پاس بھی ایسی ہی ایک چارج شیٹ ہمہ وقت تیار رہتی تھی اور ان دونوں کی غیر موجودگی میں سعدی کہا کرتا تھا۔

"ہر شخص کو اپنا کام کرنا چاہیے۔ اللہ نے مرد کو دو کان اس لیے دیے تاکہ ایک سے سن کر دوسرے سے نکال دے اور عورتوں کو دو اس لیے دیے تاکہ دونوں سے سن کر منہ سے نکالیں۔"

اور زمر خاموشی سے مسکراتی ٹیک لگا کر بیٹھی اسے سن رہی تھی جو تب سے بولے جا رہا تھا۔

"میم نے مجھے ان کا نام تک نہیں بتایا' میرا بہت دل تھا کہ میں ان سے ایک دفعہ مل کر ان کا شکریہ ہی ادا کرسکوں۔" وہ یاد کرکے پھر سے اداس ہوا۔ حنین نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا' اس نے آگے ہو کر چوتھا ٹکڑا نکالا' پیچھے ہوئی اور پوری دل جمعی سے کھانے لگی۔

"زمر!" سعدی لحظہ بھر کو چونکا۔ "آپ تو میڈم کو جانتی ہیں نا' آپ ان سے پتا کروا دیں تاکہ مجھے اسپانسر کس نے کیا ہے؟"

زمر ہنوز مسکرا رہی تھی۔ مطمئن اور پرسکون۔ سعدی کی بات پہ چند لمحے کے وقفے سے وہ بولی۔

"ٹھیک ہے' میں پتا کروا دوں گی' اگر انہوں نے بتایا' تو میرے اتنے ذرائع ہیں کہ میں وہ نام ڈھونڈ لوں گی' لیکن۔" وہ لحظہ بھر کو رکی۔ "سعدی! احسان کا بدلہ کیا احسان کے سوا بھی کچھ ہو سکتا ہے؟ اگر تم جاننا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے' مگر تمہیں نہیں لگتا کہ اگر کوئی تم پہ پیسہ لگا رہا ہے اور بدلے میں صرف اس کی اتنی خواہش ہے کہ وہ بے شناخت رہے تو تمہیں اس خواہش کا احترام کرنا چاہیے؟"

سعدی کے لب "اوہ" میں سکڑے۔ حنین نے اب پانچواں ٹکڑا اٹھایا۔

"یہ تو... میں نے سوچا ہی نہیں۔"

"ہاں زمر ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس آدمی کے پاس ہوگا فالتو کا پیسہ' یہ نہ ہو کہ تمہارے ایسے قدم سے ناراض ہو کر فیس دینے سے انکار کردے۔" بڑی امی

بہت سمجھ داری سے [illegible] ہنوز برقرار تھی۔ سعدی نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ پھر یاد آنے پہ پوچھا۔

"امی! جب ہم داخل ہوئے تو وہ کھوکھر صاحب باہر نکل رہے تھے' یہ وہ پراپرٹی ڈیلر ہیں نا جن کے پاس آپ نے مجھے بھیجا تھا جب ہم گھر بدلنے کا سوچ رہے تھے۔"

زمر کی مسکراہٹ صرف لمحے بھر کو ہلکی ہوئی' پھر وہ دوبارہ مسکرا دی۔ بڑی امی نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں' ان کی جائیداد کا کیس میں ڈیل کر رہی تھی' اصل میں ان کی بہو کی اپنی ساس سے بالکل نہیں بنتی' تب ہی بیٹا حصہ مانگ رہا ہے۔ میرا تو خیال ہے وہ بہو کافی سمجھ دار لڑکی ہے اور سارا قصور ساس کا ہی ہو گا مگر۔۔۔" کن انکھیوں سے ماں کو دیکھتے وہ سانس لینے کو رکی کہ بڑی امی کافی جوش میں آگے ہو کر کہنے لگیں۔

"کیوں؟ تمہیں کیا پتا' وہ ساس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے تب۔۔۔"

"چھوڑیں نا' ہمیں کیا بڑی امی! آئیے کیک کھاتے ہیں۔" سعدی جلدی جلدی کہتا میز کی طرف رخ موڑ کر بیٹھا تو۔۔۔

کیک نفاست سے کٹا ہوا رکھا تھا اور دوسری طرف صوفے پہ حنین یوسف بالکل سپاٹ ہاتھ منہ کے ساتھ' ہتھیلی پہ تھوڑی جمائے بیٹھی علامہ اقبال کی طرح خلا میں گھور رہی تھی۔ سعدی نے اسے گھورا اور زمر نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ وہ سعدی کو نظرانداز کر کے زمر کو دیکھ کر شرمیلا سا مسکرائی۔

"میرا اندازہ تھا کہ آج تم لوگ آؤ گے' اس لیے میں نے بہاری کباب بھی منگوا لیے تھے' پہلے وہ کھاتے ہیں پھر کیک۔"

زمر کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ حنین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ سعدی بس سر جھٹک کر رہ گیا۔ وہ اس نامعلوم دل کے اسیر شخص کی وجہ سے اتنا خوش تھا کہ گھر جا کر امی کو حنین کا بتانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اور بوکھلاہٹ میں [illegible] کھڑے بڑے ابا نے تاسف اور فکرمندی سے زمر کے چہرے کو دیکھا جو بہت طمانیت سے مسکرائی: وہ کچن کی طرف جا رہی تھی' وہاں کوئی پچھتاوا' کوئی ملال نہیں تھا۔ ملال تو ان کے دل میں بھی نہیں تھا مگر ذہن میں پریشانی ضرور تھی۔

سعدی اب بڑی امی سے پوچھ رہا تھا کہ وہ اس کے ماموں کے کزن کی شادی میں آئیں گی یا نہیں؟ اور بڑے ابا گہری سانس لیتے اندر چلے آئے۔ ابھی انہیں سعدی کا سرِ راز نیلی رقعہ سن کر اس پہ پہلا تاثر دینا تھا۔

☼ ☼ ☼

کاردار خاندان کا قصر' موسم گرما میں بھی بہار کے پھولوں سے سجا تھا۔ ولیمہ کی دعوت کا تھیم "پھول" تھے اور وہ جگہ جگہ بکھیرے گئے تھے۔ لان میں مستطیل میزوں کے گرد صوفے تھے اور مہمان کہیں بیٹھے' کہیں چل پھر رہے تھے۔ ان سب میں مرکز نگاہ وہ جوڑا تھا جس کے اعزاز میں وہ سب جمع تھے۔ ہاشم کا سوٹ سیاہ تھا اور شہرین کا گاؤن موتی جیسا سفید۔ سر پہ باریک کام دار دوپٹا کندھوں کے پیچھے گرتا تھا اور وہ ہاشم کی کہنی کو تھامے ہنستی ہوئی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ کافی دیر سے وہ دونوں آگے پیچھے مہمانوں میں گھوم رہے تھے۔ ان کو دیکھتی نگاہوں میں حسد' رقابت' خوشی' خلوص' غرض ہر طرح کے لوگوں کا ہر طرح کا جذبہ موجود تھا۔ صرف ایک شخص کی نگاہ مختلف تھی۔

سعدی اور حنین کی میز پہ موجود وارث بہت خاموش اور تیکھی نظروں سے ہاشم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خود فارس سے ذرا بڑا صاف رنگت اور گلاسز والا خوش شکل سا مرد تھا۔ اس کے انداز میں اس خاندان کے لیے قدرے ناپسندیدگی تھی اور وہ شاید صرف فارس کے مدعو کرنے پہ آیا تھا۔

"خالہ اور بچوں کے بغیر کیسی گزر رہی ہے' ماموں؟" ساتھ بیٹھے سعدی نے مخاطب کیا تو وارث

نے ہاشم سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا۔ سعدی اپنے اکاؤنٹ کے دوست میں جو اس پر ذرا کھلا تھا بیٹھا ہوا لگ رہا تھا۔

"بس اب تو صرف تین سال رہ گئے ہیں۔" وہ دھیما سا مسکرایا۔

"آپ ہماری پارٹی میں کیوں نہیں آئے؟" سامنے ہتھیلی پہ تھوڑی گرائے ادھر ہی بیٹھی حنین نے ناراضی سے پوچھا۔

"کیا ان کو بیگم کو کھانے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا سعدی؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" انگریزی فلموں کے سارے با اعتماد اور ذہنت جواب حنین کو یاد تھے۔

"میں مصروف تھا اور پھر جس پارٹی پہ تم لوگ اپنی پھپھو کو بلاتے ہو اس پہ میرا آنا نہیں بنتا۔ اچھا نہیں لگتا۔"

"اچھا۔" حنین چپ ہو گئی پھر بور سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تب ہی وہ اپنی دلہن کے ہمراہ ان کی میز تک آیا۔ وہ تینوں اس کے لیے کھڑے ہو گئے۔

"بس۔۔۔ باقی سب کہاں ہیں؟" ہاشم نے شہرین سے تعارف کروا کر حیرت سے سعدی کو دیکھ کر پوچھا۔

"سیم کو بخار تھا تو امی اس کے پاس رک گئیں۔ بڑے ابا کی فیملی کو کہیں اور جانا تھا اور فارس ماموں۔۔۔" کہتے ہوئے سعدی نے لان کے داخلی چیک پوائنٹ کو دیکھا۔ "تو وہ دعوت کے شروع میں تھے مگر پھر وہ ایوننگ کلاس کے لیے چلے گئے۔"

(جبکہ فارس نے بس سرسری سا پوچھا تھا "تمہارے دادا کی فیملی نہیں آئے گی؟" سعدی نے بتایا نہیں تو وہ بس دس منٹ رکا اور پھر اٹھ گیا۔ وارث بھی زیادہ دیر نہیں بیٹھنا چاہتا تھا مگر سعدی اور حنین کی وجہ سے وہ پابند ہو کر رہ گیا تھا۔)

"اس دن کے لیے دوبارہ شکریہ۔" اس نے پھر سے سعدی کا کندھا تھپک کر کہا تو وہ شرمندہ ہو گیا اور بات بدلنے کو ماموں کی طرف مڑا۔

"میں اس دن ان کو سارہ خالہ کے بارے میں بتا رہا تھا وہ ان کی واقف ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" ہاشم نے مسکرا کر سر ہلایا۔ شہرین پلٹ کر کسی اور سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔

"اور وارث! کیا کر رہے ہو آج کل؟"

جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے وارث نے ذرا سے کندھے اچکائے۔

"کچھ گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

ہاشم نے مسکراتے ہوئے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ "میری مدد کی ضرورت ہو تو بتانا۔"

"ہوں۔۔۔ ضرور بتاؤں گا۔"

ہاشم مسکرا کر جانے کو مڑا، پھر حنین کو دیکھ کر رکا۔

"میں نے اتنا sharky کیرا اور کبھی آج تک نہیں دیکھا۔" اس کی تعریف کر کے وہ پلٹ گیا تو حنین نے شانے جھٹکے۔

"پتا نہیں پہلی دفعہ میں کوئی میرا یقین کیوں نہیں کرتا۔"

"کیا شاندار بندے ہیں یہ ہاشم بھائی۔" واپس بیٹھتے ہوئے سعدی نے بہت فخر سے کہا تو وارث نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تمہیں معلوم بھی ہے کہ یہ کون ہے؟"

"جی یہ بہت اچھے وکیل ہیں۔"

"بہت اچھے دفاعی وکیل ہیں وہ بھی کرمنلز کے اور کرمنل کے دفاعی شخص کو میں کرمنل سے الگ نہیں سمجھتا۔"

"ماموں!" سعدی بہت سنجیدگی سے اس کی طرف مڑا۔ "ہو سکتا ہے آپ ان کو پسند نہ کرتے ہوں اور شاید ان کی عزت بھی نہ کرتے ہوں اور ہو سکتا ہے کہ ان کی فیملی کرپشن میں بھی ملوث ہو مگر اس سب کے باوجود ہم ان کو کرمنل نہیں کہہ سکتے۔ میں ان کو جانتا ہوں، وہ بہت اچھے ہیں۔"

وارث چپ ہو گیا۔ اگر سعدی کو پتا چل جائے کہ وہ ہاشم کو کتنا نہیں جانتا تو۔۔۔؟

مسکراتے ہوئے آئی اور سعدی کے کان کے قریب جھکی۔

"مسز کاردار آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

وہ چونکا' بجران سب سے معذرت کرتا اٹھ آیا۔

باہر نیلی شام میں سیاہی گھلنے لگی تھی مگر اندر روشنیوں کا سورج جوبن پہ تھا۔ پھول ہی پھول' روشنی ہی روشنی۔ لاؤنج میں رک کر سعدی نے گردن اٹھائی۔ سیڑھیوں سے اوپر ہاشم کے کمرے کے سامنے ریلنگ پہ کہنی ٹکائے دوسرے ہاتھ میں نیکلس کا سوتی تھمائی وہ کسی ملکہ کی شان سے کھڑی تھی۔ سرخ لمبا گاؤن' سرخ لپ اسٹک کے ساتھ آنکھوں میں گہرا کاجل اور گہرا اضطراب تھا۔

سعدی قدم قدم چڑھتا اوپر آیا۔ بالکل جواہرات کے مقابل۔

"آپ کا چھوٹا بیٹا کیسا ہے؟" سعدی نے کھنکھار کر بات کا آغاز کیا۔ جواہرات مضطرب سی مسکرانے کی سعی کی مگر آنکھوں میں نمی ابھر آئی۔

"وہ تیار ہے۔ کمرے میں ہے۔ بھائی کے لیے دعوت میں شامل ہو بھی جائے گا مگر... خوش نہیں ہوگا۔" مسکراتے ہوئے سر جھٹکنے کی سعی میں ضبط سے آنکھیں گلابی ہوتی گئیں۔ سعدی نے پلکیں سکیڑ کر غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"یعنی... کاردار صاحب کو علم ہو گیا؟" جواہرات نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"اور نگ زیب نے اسے بہت جھڑکا ہے۔ وہ اب اپ سیٹ ہے۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں مسز کاردار؟" وہ نرمی سے بولا۔

"ہر پریشانی میں ایک ہی خیال ہوتا ہے ہاشم سنبھال لے گا' مگر آج ہاشم کا بڑا دن خراب نہیں کر سکتی' ورنہ سنبھال تو وہ اب بھی لیتا۔" اس نے نرمی سے سعدی کی کہنی پہ ہاتھ رکھا۔ "کیا تم کچھ کر سکتے ہو؟"

سعدی نے گردن موڑ کر شیرو کے کمرے کو دیکھا۔

"مجھے کوشش کرنے دیں۔" اس نے دروازے پہ دستک دی۔ جواہرات ایک طرف ہٹ گئی۔ سعدی نے دروازہ دھکیلا۔

بیڈ کے کنارے وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سوٹ' جوتے' ٹائی' سب تیار تھا مگر خود بجھا بجھا سا تھا۔ سعدی کو دیکھ کر وہ پھیکا سا مسکرایا۔

"میں' سعدی... فارس کا..."

"آئی نو... بھائی نے بتایا تھا۔ آؤ۔"

سعدی چند قدم اندر آیا' دروازہ واپس دھکیلا' تو وہ چوکھٹ سے تین انچ کے فاصلے پہ جا ٹھہرا۔ باہر کھڑی جواہرات کی مضطرب سماعتیں وہیں لگی تھیں۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" وہ سامنے کھڑے کھڑے احتیاط سے پوچھنے لگا۔ شیرو نے سر جھکا۔

"بتایا تھا ممی نے کہ تم نے مجھے بچانے کو کوشش کی تھی' تھینکس۔ مگر کاردار صاحب کو علم ہو گیا۔"

"میں نے تمہیں بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ وہ فکر مند تھے' میں نے ان کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہا تھا۔"

جواہرات نے چونک کر دروازے کو دیکھا۔ شیرو بھی چونکا تھا۔

"وہ میرے لیے... کبھی پریشان نہیں ہو سکتے۔" پھر رکا۔ "کیا وہ واقعی پریشان تھے؟"

"بہت زیادہ... اس لیے تمہیں نیچے جا کر ان کو ان کے بیٹے کی شادی کی مبارک باد دینی چاہیے۔"

نوشیرواں کے ماتھے پہ بل پڑے۔ آنکھوں میں خفگی در آئی۔ "کیا تمہیں لگتا ہے وہ مجھے معاف کر دیں گے؟" آواز بلند ہونے لگی۔ "میں ہارورڈ نہیں جا سکا' کولمبیا نہیں جا سکا' میں ان کے آفس میں دلچسپی بھی نہیں رکھتا' میں ڈرگز لینے لگ گیا تھا اور اس اوورڈوز کے باعث میں نے خود کو اسپتال پہنچا دیا۔ ان کو اتنا مایوس کیا خود سے۔ اس سب کے بعد وہ مجھے کیا سمجھتے ہوں گے؟"

"صرف اپنا بیٹا۔"

وہ جو غصے سے بولے جا رہا تھا' جھٹکا کھا کر رکا۔ سخت تاثر ڈھیلے پڑے۔ یک ٹک سعدی کو دیکھے گیا۔

"اور معافی' شکریہ اور اظہار محبت' ان تین چیزوں

کی خون کے رشتوں میں بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف رویہ درست کرنا ہوتا ہے اور سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"اور... اور اگر انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا؟" وہ اندر سے ڈرا ہوا تھا۔

"میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں نوشیرواں!" سعدی نے سر جھکائے، جوتے سے لکڑی کا فرش مسلنے کرنا شروع کیا۔

"میں ایک لڑکے کو جانتا ہوں جس کا باپ اسکول ٹیچر تھا۔ تنخواہ کم تھی اور گزارہ مشکل سے ہوتا، مگر وہ لڑکا کبھی بھی اپنے باپ کے سامنے خواہشات کی فہرست نہیں رکھتا تھا۔ اسکول لے جانے کو پیسے بھی نہ مانگتا، مگر جب وہ تیرہ سال کا تھا تو اسکول فنکشن کے لیے اسے نئے جوتوں کی ضرورت پڑی بلکہ ضرورت نہیں، صرف خواہش تھی کیونکہ اس کے دوستوں نے نئے جوتوں کی نمائش کی تھی، وہ جن میں رنگ برنگی لائٹیں لگی ہوتی ہیں۔ اس روز اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اسے بھی وہی جوتے چاہئیں۔ باپ کچھ دیر کو چپ ہوا تو وہ سمجھا کہ باپ نہیں لے کر دے گا، وہ باپ سے ناراض ہو گیا، اس نے باپ سے بات کرنا بھی ترک کر دی۔ رات اس کے سرہانے اس کا باپ آیا اور کہا کہ وہ اسے کل جوتے لا دے گا، بالکل وہی جوتے، مگر وہ لڑکا ناراض رہا اور آنکھیں بند کر کے سوتا بن گیا۔

صبح اس کا باپ اسکول سے جلدی چھٹی لے کر جوتوں کی اس مہنگی دکان پہ گیا۔ جانے کہاں سے پیسے جوڑ کر اس نے وہ جوتے خریدے اور جب وہ سڑک عبور کر رہا تھا تو ایک بس نے اسے ٹکر مار دی۔" لمحے بھر کو چپ رہ کر سعدی خاموش ہوا۔

"جب لوگ اس کے باپ کی لاش کو گھر لائے تو ساتھ خون میں نہایا جوتوں کا ڈبا بھی تھا۔ جوتے آ گئے نوشیرواں! باپ چلا گیا۔ اگر تم اس لڑکے سے کہو کہ اس شرط پہ کہ اس کی زندگی پانچ منٹ بعد لے لی جائے گی، اس کا باپ اس کے سامنے آ جائے اور ان پانچ منٹ میں صرف اس کو ڈانٹے، اور وہ ساری ڈانٹ سن کر صرف معافی مانگ سکے تو اس لڑکے کو وہ پانچ منٹ کی زندگی بھی قبول ہو گی، کیونکہ اپنی زندگی کے اگلے پانچ سال میں اس نے یہ بات اچھی طرح جان لی تھی کہ باپ کا کوئی replacemnet نہیں ہوتا۔"

نوشیرواں کی رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ وہ ایک دم اٹھا اور باہر نکل گیا۔ جواہرات پیچھے ہوئی، مسکرا کے دیکھے بغیر وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ نیچے لاؤنج میں اورنگ زیب کھڑے کسی ملازم کو ہدایات جاری کر رہے تھے۔ شیرواں کے قریب رکا، جھجکا، پھر ان کو کچھ کہتے ہوئے ان کے گلے لگا۔ شاید وہ ہاشم کی شادی کی مبارک باد دے رہا تھا۔

اورنگ زیب نے سن کر اسے خود سے الگ کیا۔ خفگی سے کچھ کہتے کوٹ کا بازو جھاڑا جیسے شکن نہ پڑنی ہو، مگر اب ان کے چہرے پہ وہ سختی نہ تھی اور شیرو کا چہرہ دمک رہا تھا۔ جواہرات نے آنکھیں بند کیں۔ ساری نمی اندر اتاری اور پھر پلٹ کر کمرے میں آئی۔

سعدی یونہی سر جھکائے کھڑا تھا۔ آہٹ پہ سنتے ہوئے چہرے کے ساتھ ہلکا سا مسکرایا۔

"تھینکس!" وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"کیا واقعی... اورنگ زیب اس دن شیرو کے لیے پریشان ہوا تھا؟"

"اور کیسے پریشان ہوا جاتا ہے؟" اسے الٹا تعجب ہوا۔ جواہرات نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"شاید میں بھی شیرو کی طرح کبھی بھی اس کو سمجھ نہیں پائی۔ وہ ایک سخت گیر باپ ہے بلکہ... اسے صرف ہاشم سنبھال سکتا ہے۔ خیر، کبھی کبھی آ جایا کرو۔ تم سے بات کر کے اچھا لگتا ہے۔"

"میں لیڈز چلا جاؤں گا جلد، مجھے اسکالر شپ مل گیا ہے۔ کیمیکل انجینئرنگ۔"

"شیرو بھی... انجینئرنگ پڑھے گا۔"

"مگر وہ تو مانچسٹر جائے گا، ہاشم بھائی نے بتایا تھا۔"

جواہرات نے ایک نظر سعدی پہ ڈالی اور ایک شیرو کے کمرے پہ۔

"نہیں اس نے ابھی فیصلہ نہیں کیا۔"

(اچھا؟ سعدی کو حیرت ہوئی۔ ہاشم بھائی تو بالکل سنجیدہ تھے۔)

"کیا تم مجھے اپنی فیملی سے نہیں ملواؤ گے۔" وہ مسکرا کر خود کو کمپوز کرتی اس کے ساتھ باہر آئی۔ سعدی نے بھی مسکرا کر سر ہلایا۔

وہ دونوں ہمراہ چلتے جب سیڑھیوں کے وسط میں تھے تو جواہرات نے رک کر اسے دیکھا۔

"اگر اس لڑکے کے والد آج زندہ ہوتے تو اس پہ بہت فخر کرتے۔"

سعدی نے جواب نہیں دیا' بس اداسی سے مسکرا کر زینے اترنے لگا۔

☼ ☼ ☼

شام مغرب میں ڈھل چکی تھی اور فارس لائبریری کے کونے والی میز پہ بیٹھا بے چین سا ہو کر بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ سامنے نوٹس اور کتابیں بھی منتظر سی پڑی تھیں۔

دفعتاً وہ آتی دکھائی دی۔ کندھے پہ بیگ' ہاتھوں میں کتابیں' بال جوڑے میں بندھے۔ تھکے تھکے انداز میں کرسی کھینچی' بیگ رکھا۔ فارس فوراً سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"مجھے نماز میں دیر ہو گئی۔" اس کو دیکھے بنا وہ بیٹھ کر کتاب کھول رہی تھی۔ فارس نے سر کو خم دیا' پھر لگا کوئی اور بھی سامنے کھڑا ہے' چونک کر چہرہ اٹھایا تو ساتھ والی کرسی کھینچ کر جمشید افضل بیٹھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ فارس ناگواری سے اسے روکتا کہ بھائی تم کدھر؟ زمر نے کہا۔

"جمشید کو بھی یہی ٹاپک سمجھانا تھا۔ بیٹھے جمشید۔ آج ہم اور کرلیں گے۔" کتاب کے صفحے پلٹتے اشارہ کرتی وہ بہت مصروف لگ رہی تھی۔ تھکی ہوئی بھی۔

عینک لگانے والا وہ دبلا پتلا نہیں اسٹوڈنٹ تابعداری سے سامنے بیٹھا۔ فارس نے تند نگاہوں سے اسے گھورا اور ضبط سے رخ پھیر لیا۔ وہ شدید برا

ہوا تھا۔ خود اسے بھی معلوم نہیں کہ کیوں۔

زمر اب ان چین ہاتھ میں پکڑے باری باری دونوں کو دیکھتی سمجھا رہی تھی۔ جمشید جلدی جلدی رجسٹر پہ نوٹس لینے میں مگن تھا اور فارس گاہے بگاہے ایک اکھڑی اکھڑی سی نظر اس پہ ڈال لیتا۔ "ہونہہ۔ یہ بنیں گے وکیل۔ جج نے ایک پھونک ماری ہے اور اس نے اڑ جانا ہے۔"

دس منٹ بعد وہ لڑکا اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ وہ کچھ پوچھ رہا تھا اور زمر دوبارہ اسے وہی بات سمجھا رہی تھی۔ فارس کی بے زاری بڑھنے لگی۔ تب ہی زمر کا فون بجا۔ کال ضروری تھی' وہ معذرت کرتی اٹھ کر باہر چلی گئی۔

اس نے اب بہت فرصت سے ہتھیلیاں سکیڑ کر اس جمشید کو دیکھا پھر اس کے سامنے میز انگلی سے بجائی۔ رجسٹر پہ لکھتے لڑکے نے چونک کر اسے دیکھا۔

"وہ کتاب پکڑانا۔" تحکم سے میز کے دوسرے سرے پہ رکھی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تابعداری سے سر ہلا کے جیسے ہی اٹھا فارس نے اس کی کتابوں کے ساتھ رکھا اس کا موبائل اچک کر اپنی جیب میں رکھا۔ لڑکا واپس آیا' کتاب سامنے رکھی اور رجسٹر پھر سے کھول لیا۔ فارس نے ہتھیلی اس کے سامنے کی۔

"ذرا فون دینا اپنا۔ میرا کریڈٹ نہیں ہے۔ ایک کال کرنی ہے۔"

لڑکے نے مسکرا کر اپنی کتاب ہٹائی' پھر رجسٹر ہٹایا' پھر نوٹس ایک طرف کیے۔ مسکراہٹ غائب ہوئی۔ وہ پریشان سا چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ پھر جب جھنجھلا کے

"یہیں ہی رکھا تو تھا۔" وہ گھبرا کے مڑ کے بولا۔

"نہیں' ابھی تو میرے پاس تھا۔ آپ بیل دیں گے ذرا؟"

"تو۔ میرا کریڈٹ ہوتا تو تم سے کیوں مانگتا۔" اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔ "ویسے آخری دفعہ کہاں استعمال کیا تھا فون؟"

"وہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ ڈاکٹر عبدالباری کے آفس کے

بہانے۔"

"وہ تو وہ بلا کسی وجہ سے راستے میں گرا ہوگا۔ اب تک تو کوئی لے اڑا ہوگا۔ یوں کرو واپس جاؤ اور رات کا ایک ایک پتھر اٹھا کر دیکھو۔ شاباش۔" ساتھ ہی اس کا شانہ تھپتھپایا۔ وہ مشکل پہلی بار گر رہ گیا' پھر جلدی جلدی چیزیں سمیٹتا وہاں سے بھاگا۔

زمر جب آئی تو جیو گم جیا فارس اکیلا وہاں بیٹھا تھا۔ اس نے تعجب سے خالی کرسی کو دیکھا۔

"یہ کہاں گیا؟"

"پتا نہیں۔ کچھ کھو بیٹھا تھا۔ اتنی جلدی میں بھاگا کہ موبائل بھی چھوڑ گیا۔" لاپروائی سے میز پہ رکھے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔ جس کو وہ آف کر چکا تھا۔ زمر ناگواری سے سر جھٹکتے واپس بیٹھی۔

"یہ نان سیریس اسٹوڈنٹس بھی نا۔"

"نہیں! آپ اصرار کرتی ہیں تو اس کا انتظار کر لیتے ہیں۔ آدھا ہی گھنٹہ ہی لگے گا۔" بہت ہی خیر خواہی سے پوچھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ درشتی سے کہتی کتاب کھولنے لگی۔ وہ سر ہلا کر بہت انہماک سے اسے سننے لگا۔ اب وہ بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس اونچے اور شیس لاؤنج میں خوب چہل پہل تھی نہ اس دن کی رونق۔ ایک کنارے پہ قد آور کھڑکی کے ساتھ دو کرسیاں ساتھ ساتھ رکھی تھیں۔ ان کے درمیان چھوٹی میز رکھی تھی۔ ایک کرسی پہ جواہرات ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی گردن دراز اونچی کر کے بائیں ہاتھ پہ بیٹھے سعدی کو مسکرا کر سن رہی تھی جو آگے کو ہو کر بیٹھا اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا تھا۔

"پھر ابا کے ایکسیڈنٹ کے بعد امی نے ٹیچنگ شروع کر دی۔ اب تو وہ ریٹائر ہونے والی ہیں۔ صحت بہت اچھی نہیں ہے ان کی۔" وہ کافی دیر سے بول اب خاموش ہوا۔

جواہرات نے مسکرا کر ابرو اچکائے۔ "اچھا لگا

تمہیں سن کر۔ اس سے بھی زیادہ اچھا ہے کہ تم میری ایک کال پہ چلے آیئے۔ آتے جاتے رہا کرو۔"

"اب اگلے سال چھٹیوں پہ ہی آؤں گا۔ ہاں کوشش کروں گا کہ کبھی شیرو سے مانچسٹر میں ملاقات ہو جائے۔"

"کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا کہ وہ بھی تمہاری ہی یونیورسٹی میں جا رہا ہے۔" سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

"ٹھیک۔" وہ چپ ہو گیا۔

"میں جس سعدی یوسف کو جانتی ہوں۔ وہ کافی صاف گو ہے تو تم بتا کیوں نہیں دیتے کہ تمہیں کیا برا لگا ہے؟؟"

"آئی ایم سوری... مگر... آپ نے اسے اپنا فیصلہ بدلنے پہ کیوں مجبور کیا ہے؟؟"

"میں نے صرف خواہش کی اور وہ مان گیا۔"

"مگر... کیوں؟"

"تم درست سوچ رہے ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میرے بیٹے کے ساتھ رہو۔"

سعدی نے الجھ کر اسے دیکھا۔ "مسز کاردار! اگر آپ چاہتی ہیں کہ اس کا خیال رکھوں تو میں بے بی سٹر نہیں ہوں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ اس کو ہر وقت نصیحتیں کرتا رہوں تو میں مبلغ بھی نہیں ہوں اور اگر یہ چاہتی ہیں آپ کہ میں اس کے پل پل کی خبر آپ کو دوں تو میں جاسوس بھی نہیں ہوں۔"

"میں یہ سب چاہتی ہوں مگر بے بی سٹر، مبلغ یا جاسوس کی حیثیت سے نہیں۔ ایک دوست بن کر۔"

"ہماری پہلے ہی اچھی دوستی ہو چکی ہے اور دوست بن کر میں یہ سب کر سکتا ہوں لیکن بتا میں آپ کے بیٹے کو سمجھا ہوں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"اگر اسے یہ علم ہوا کہ آپ نے میری وجہ سے... اونہوں... وہ بہت خفا ہو گا۔"

"سعدی! میرا بیٹا ڈر گیا تھا باپ سے' ناراض تھا' اب وہ وعدہ کر چکا ہے خود کو بدلنے کا' مگر کیا مجھے اس کا یقین کر لینا چاہیے؟ اس کی فکر کرنی چاہیے؟ مجھے اس کی صحت کی فکر اس کی یونیورسٹی سے زیادہ ہے اور مجھے لگا کہ میں تم پہ بھروسا کر سکتی ہوں۔ کیا تم میرے اچھے دوست نہیں ہو۔"

سعدی نے گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا۔

"اوکے مگر میں اس کی پشت پہ کبھی بھی کچھ ایسا نہیں کروں گا جس پہ وہ مجھ سے خفا ہو۔ خیر! آپ بتائیں ہاشم بھائی کیسے ہیں؟ ان کے انڈیا جانے کے بعد آپ تو ان کو بہت مس کر رہی ہوں گی۔"

جواہرات نے شانے اچکائے۔ "اس کی غیر موجودگی میں تو یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔"

"وہ اپنی بیوی کے ساتھ واپس آئیں گے تو پھر رونق ہو جائے گی۔"

"محبت اندھی ہوتی ہے مگر امید ہے کہ شادی آنکھیں کھول دے گی۔ اسے جلد علم ہو جائے گا کہ اس لڑکی نے صرف اس کے اسٹیٹس کی وجہ سے اس سے شادی کی ہے۔"

سعدی کو اس بات کی امید نہیں تھی۔

"اگر... ایسا تھا تو آپ نے ان کو روکا کیوں نہیں؟"

"میں روکتی تو وہ نہ رکتا۔ زیادہ بہتر ہے کہ وہ تجربہ کر کے سیکھے۔" پھر ہاتھ اٹھا کر پانچ انگلیاں اسے دکھائیں۔ "پانچ سال بھی نہیں چلے گی اس کی یہ شادی۔ تم یہ بات کسی ڈائری میں لکھ کر رکھ لینا۔"

"اچھا۔ مجھے تو وہ اچھی لگ رہی تھی ان کے ساتھ۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"وہ اس لیے کہ تم اچھے ہو اور تمہیں ایک بات کہوں؟" چونکہ وہ اس کے بائیں طرف بیٹھا تھا تو جواہرات نرمی سے اس کی طرف مڑی۔ "سعدی کا مطلب ہوتا ہے خوش قسمت' اور بہت اچھے لوگ کبھی بھی خوش قسمت نہیں ہوتے۔"

"یہ منحصر ہے کہ آپ خوش قسمتی کسے کہتی ہیں۔ غم کا ملنا بدقسمتی نہیں ہے' خوشی کا ملنا خوش قسمتی نہیں ہے۔"

جواہرات نے مسکرا کر گلاس اٹھایا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

وہ جب اور شیرو کے کمرے میں آیا تو وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا کوئی گیم کھیل رہا تھا۔

"آؤ بیٹھو۔" اس نے اسکرین پہ نظریں مرکوز کیے اپنے پیچھے سے ایک کشن نکال کر سعدی کی طرف اچھالا۔ سعدی نے کشن اس کے قریب رکھا اور وہیں بیٹھ گیا۔

"تمھاری ممی نے بتایا کہ تم بھی ایبڈز جا رہے ہو۔"

"ہاں! انھوں نے بتایا تھا کہ تمھارا ابھی وہیں داخلہ ہوا ہے۔" وہ بہت انہماک سے گیم کی طرف متوجہ تھا۔ ایک دم بُرا سا منہ بنا کر کچھ کیز زور سے دبائیں اور پھر "اف" کر کے میز پہ مکا مارا۔ گیم اوور۔

"تم ابھی اس کے چالیس ویں راؤنڈ پہ ہو؟" سعدی نے تعجب سے اسکرین کو دیکھا۔ "میری بہن تو ایک سو دس راؤنڈز کر چکی ہے۔"

شیرو بے یقینی سے اس کی طرف مڑا۔ "میں مان ہی نہیں سکتا۔ سو سے اوپر پوری دنیا میں صرف تین لوگ گئے ہیں اور ان کا نام ہائی اسکورر کی فہرست میں ہے۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔" اسے جیسے سعدی کی اس بڑھک کو جلد سے جلد غلط ثابت کرنا تھا۔ فوراً "بٹن" دبا کر صفحے کھولتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک فہرست سامنے آئی۔ سعدی خاموشی سے دیکھتا رہا۔

"یہ دیکھو! اس گیم میں آج تک صرف یہی لوگ ہے۔" نوشیرواں بولتے بولتے ہکلا گیا۔

فہرست کا دوسرا نام جگمگاتے ہوئے اس کے سامنے تھا۔ حنین یوسف۔

"یہ میری بہن ہے۔" سعدی نے بنا کچھ جتائے اشارہ کیا۔ نوشیرواں بالکل پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس دس افراد کی فہرست کو دیکھ رہا تھا۔ باقی بہت سے لوگوں نے اپنے ناموں کی جگہ نک نیمز بھی رکھے ہوئے تھے۔ اگر حنین کا کوئی اور نک ہوتا تو وہ سعدی کو جھوٹا قرار دیتا۔ مگر

"نمبر ایک پہ تو وہ پھر بھی نہیں ہے۔" شیرو نے بظاہر لاپروائی سے ناک سے مکھی اڑائی۔ سعدی کی نظریں فہرست کے سب سے اوپر والے نام تک اٹھ گئیں۔

اس نے ذرا آگے ہو کر پڑھا۔ وہ نک نیم تھا۔

"Ants Everafter"

"یہ کون ہے؟" بہت دفعہ حنین نے اسے یہ فہرست دکھائی تھی مگر بھی اس نے نوٹ شاید اب کیا تھا۔ شیرو نے مذکورہ شخص کی پروفائل پہ کلک کیا۔

"کوئی امریکن لڑکی ہے۔ اس سے زیادہ معلومات نہیں اوپن کر رکھیں۔ کیا تم میرے سامنے کھیلنا چاہو گے؟" وہ نئی گیم شروع کرنے لگا تھا۔

"نہیں۔" سعدی پورا سا ہو کر پیچھے ہوا۔

"میں ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں نوشیرواں! کہ میں کوئی بھی گیم نہیں جیت سکتا۔ میرے پاس پھوپھو حنین یا اسامہ بھائی جیسا دماغ نہیں ہے۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عفت سحر طاہر

من مانگی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز، زار اور ایزد۔ صالحہ امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہوسکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ الھڑسی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں مگر صالحہ ان کی شرافت پسندی، نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی ہے۔ نتیجتاً صالحہ نے امتیاز احمد سے نسبت کے باوجود کراچی کی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہوکر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کردیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہوکر سفینہ سے نکاح کرکے صالحہ کا راستہ صاف کردیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا کہ ابھی بھی صالحہ امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بچی ایبہا کی وجہ سے مجبور ہوجاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کرلیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کرلیتی ہے۔ ایبہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہوکر آجاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کردیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ایبہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہوکر امتیاز احمد کو فون کرلیتی ہے۔ وہ فوراً آجاتے ہیں اور ایبہا سے نکاح کرکے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد ایبہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کردیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی

دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔

معیز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب ابیہا کی کلاس فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے ان سے پیسے بٹور کر بہا لگا کر رکھنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔ ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس گم ہو جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کر پاتی ہے، نہ اکیڈمی کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور اکیڈمی چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماں جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں، زور زبردستی کرکے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سر پٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ، گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار مقرر کر جاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید تپ جاتی ہیں۔ معیز ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منگیتر ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔

میم ابیہا کو سیفی کے حوالے کر دیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے، جہاں معیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں

ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بار بار بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً" سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہو کر اس سے رابطہ کرتی ہے مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنا پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد وہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد، ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا پہلا راز کھولنا پڑتا ہے۔

وہ بتاتا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے۔ اگرچہ وہ پہلے اس نکاح پر راضی نہ تھا مگر اب۔ پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معیز احمد سے طے کر دیتی ہے مگر معیز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہو پاتی کیونکہ وہ زارا کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملتے ہی ابیہا ثانیہ کو فون

کرتی ہے۔ ثانیہ یونی بار رنج جاتی ہے۔ دوسری طرف ماثر ارشد پر میڈم احتا کو یونی ورسٹی بار بار بھیج رہی ہے مگر ثانیہ ابیہا کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیز اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر مفیتہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں مگر معیز سمیت زارا اور ابرہا انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیز احمد اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ابیہا کو گھر لے تو آتا ہے مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کر کے شرمندہ کرتی ہے۔ عون نادم ہو کر کچھ اشیائے خورد و نوش لے آتا ہے۔ معیز احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

۱۲

بارہویں قسط

معیز تو آنے والے کو دیکھ کر ابھی حیران ہی ہوا تھا۔ یہ حیرانی اگلے ہی لمحے ناگواری اور ہلکے سے غصے میں بدل گئی۔

مگر رباب تو ہلک سے اڑی تھی۔

وہ سفیان مہدی تھا۔ عرف عام میں سیفی۔ رباب کی زبان گنگ تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر بے تکلفی سے بیٹھ رہا تھا۔

"بہت خوشی ہوئی آپ کو یہاں دیکھ کر مسٹر معیز۔" اس بار روئے سخن معیز کی جانب ہوا جس کی رنگت بارے ضبط کے سرخ پڑ رہی تھی۔

"مگر میرے جذبات تم سے بالکل مختلف ہیں۔" وہ پھنکارا۔

"رائے تو تمہارے متعلق پہلے بھی اچھی نہیں تھی مگر اس طرح میرے پرسنلز میں گھس کر تم اتنی گراوٹ کا مظاہرہ کرو گے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔"

معیز نے کوئی تکلف یا مروت نبھائے بغیر مروہ خشک لہجے میں اس کی بدتمیزی کا احساس دلایا تھا۔ رباب ابھی تک یوں سادھے بیٹھی تھی۔ ایسے لگتا تھا ابھی سیفی اس سے مخاطب ہوا کے ہوا۔

"ارے یار! ہم جیسے تنہائی کے مارے تو تم جیسوں کی محفلیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ ہم پہ کیا ناراضی۔"

وہ ایک اچٹتی نگاہ کرسٹل کا مجسمہ بنی رباب پر ڈالتے ہوئے بے تکلفی سے یوں بولا جیسے معیز سے ماضی میں جانے کتنے اچھے تعلقات رہ چکے ہوں۔

"لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے درمیان ایسے تعلقات ہیں کہ تم اتنی ڈھٹائی سے آکر میری ٹیبل پہ بیٹھ جاؤ۔ یو بے لیبولز۔"

معیز کے انداز میں سرد مہری کے ساتھ قطعیت بھی تھی۔ رباب کی رنگت معمول سے زیادہ سفید نظر آ رہی تھی۔

"اوکے۔" سیفی نے ایک جھٹکے سے کرسی چھوڑی۔ رباب پہ ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور مخاطب جانے معیز کو کیا یا رباب کو۔

"لیکن تم سے بعد میں بات ضرور ہو گی۔" اس کے انداز میں تنی تھی۔ وہ چلا گیا۔ رباب نے ہلکی سی جھرجھری لی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ قیامت ٹل گئی تھی۔

"بہت برا ہوا ہے بد شخص سے ذرا جو تمیز آتے ہوں۔" معیز سلگ رہا تھا۔

"او کے، دفع کرو اسے۔ پبلک پلیسز پہ ایسے لوگ ملتے ہی رہتے ہیں۔" دفعتاً رباب نے مسکراتے ہوئے ٹیبل پہ دھرے معیز کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"سارا موڈ خراب کر دیا خبیث نے۔ بزنس سرکل میں تو تھرڈ کلاس ہے ہی' ذاتی زندگی میں بھی آج ثابت ہو گیا۔" معیز نے سر جھٹکا۔

اسے رہ رہ کر سیفی کی جسارت پہ غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ تھا اور سیفی اتنے آرام سے اس کی ٹیبل پہ یوں آ بیٹھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

"چلو چھوڑو۔ جانے دو۔ اس بدتمیز شخص کے لیے تم اپنا موڈ کیوں خراب کر رہے ہو اور ہمارا ڈنر بھی۔"

رباب کی تو جیسے سانسیں بحال ہوئی تھیں اور اعتماد بھی۔

سیفی یقیناً "اسی کو دیکھ کر کھنچا چلا آیا تھا" مگر صد شکر کہ اس نے رباب کو مخاطب کرنے اور شناسائی ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"اس کو اپنی اس بدتمیزی کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑے گا۔" معیز کا غصہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آ رہا تھا۔

اسے رہ رہ کر یاد آ رہا تھا کہ پچھلا کچھ عرصہ اس بدقماش شخص کی وجہ سے اس پر کیسے قیامت بن کے ٹوٹا تھا' جب ایمن اس کے قبضے میں تھی۔

اسے دفعتاً "اپنے ہاتھ پر ہلکی سی ملائمت کا احساس ہوا تو وہ چونکا۔

رباب کا اس کی دی ہوئی انگوٹھی سے سجا ہاتھ اس کے ہاتھ کو نرمی سے سہلا رہا تھا۔ معیز ہلکے سے مسکرا دیا۔

رباب کے انداز میں ادا بھی' دلکشی بھی۔ وہ دوسروں کو مسحور کرنے کا ہنر رکھتی تھی۔

"اب جلدی سے کھانا منگواؤ' بہت بھوک لگ رہی ہے۔" وہ ناز سے بولی۔

اور جب تک وہ ویٹر کو اپنی اور رباب کی پسند کی چیزیں نوٹ کرواتا رہا' رباب دل ہی دل میں تلملاتے ہوئے پورے ہال میں سیفی کی تلاش میں نظریں گھماتی رہی۔

اسے درحقیقت سیفی پر اب غصہ آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز ابھی وہ آفس پہنچ کر سیٹ پر بیٹھا اپنے پی اے کو کچھ ہدایات دے ہی رہا تھا کہ عون دندناتا ہوا اس کے آفس میں داخل ہوا۔ معیز نے اسے دیکھ کر مختصراً" بات کے بعد ریسیور رکھ دیا۔ وہ کرسی کی پشت پر ہاتھ جمائے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"میرا نہیں خیال کہ میں نے تمہارا کوئی بہت بڑا قرض دینا ہے جو تم یوں دشمنوں کی طرح مجھے گھور رہے ہو۔" اسے ہاتھ سے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے معیز نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ یونہی منہ پھلائے بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا ہے' ثانیہ سے جھگڑا ہوا ہے؟"

"ہاں' اور اس بار وجہ تم ہو۔" وہ ترخ کر بولا۔

"میں؟"

ہاتھ سے اپنی طرف اشارہ کرتا معیز بے حد حیرت کی زد میں آیا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟ بلکہ میرا تو اس سے کسی بھی قسم کا رابطہ نہیں ہے۔" وہ بے اختیار بولا۔

"تمہارا تو شاید ان دنوں رباب کے علاوہ کسی بھی ذی روح سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔" عون کا طنز کڑا تھا۔
معیز نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ یوں اس کی ذاتیات میں دخل نہیں دیا کرتا تھا' چہ جائیکہ یوں رباب اور اس کے تعلق کو پوائنٹ آؤٹ کرنا۔
"کم ٹو دی پوائنٹ عون! کیا مسئلہ ہوا ہے؟" وہ سنجیدہ تھا اور عون اس سے بھی زیادہ۔
"تمہیں یاد ہونا چاہیے معیز! تمہارا کسی اور سے بھی بہت "قریبی" رشتہ ہے اور اسے تم گھر میں ڈال کے بھول چکے ہو۔" معیز کے اعصاب چوکنا ہوئے۔
وہ فوراً "معاملے کی تہہ تک پہنچا۔
"یار تو ایسا ہے کہ ہر وقت سر پہ سوار رہتا ہے کم بخت۔" اس نے دانت پیسے۔ پھر دونوں ہاتھ ٹیبل کی سطح پر مارتے ہوئے بولا۔
"میں اسے بھولنا چاہتا ہوں۔"
"لیکن تم یہ مت بھولو کہ وہ ایک انسان بھی ہے۔ جسے کھانے پینے اوڑھنے پہننے کی حاجت بھی ہے۔" اس کی بات کاٹ کر عون نے اونچی آواز میں کہا۔ معیز چپ ہو گیا۔ اسے یکلخت ہی اپنی بے حسی کا احساس ہوا۔
"جانتے ہو جب نانی نے مجھے وہاں بلایا تو اس کے پاس کھانے اور پینے کے لیے پانی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔" عون کے اعصاب واقعی ابیہا کی حالت کا اندازہ کر کے متاثر ہوئے تھے۔
"میں نے کچھ چیزیں اس کے فریج میں رکھوائی تو تھیں۔" معیز نے کہنا چاہا۔
"ہاں۔ انڈے' دودھ اور بریڈ۔" عون نے تلخی سے کہا پھر طنزاً "پوچھنے لگا۔
"ویسے تمہیں اگر ان تین چیزوں پر زندہ رہنا پڑے تو صبح' دوپہر' شام کتنی بار کھا سکتے ہو اور کتنے دنوں تک؟"
"تو تمہیں اس نے اپنا وکیل بنا کر بھیجا ہے۔" معیز نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔
"بالکل نہیں۔" عون نے قطعیت سے کہا۔ پھر بولا۔
"لیکن اگر بھیجتی بھی تو بالکل درست کرتی۔ میں تو نانی کے سامنے شرمندہ ہو رہا۔ ایسا بے حس دوست ہے میرا۔"
"اس زبردستی کے رشتے نے ہی مجھے بے حس بنایا ہے عون! اس سے کہہ دو اور تم بھی جان لو کہ مجھے اس میں زیرو پرسنٹ بھی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ بے اعتنائی سے بولا۔
"ویری ویل اور وہ جو انکل نے اس کا خرچا باندھا تھا اس کا کیا کیا تم نے؟" عون نے بھی بالکل اسی کا سا انداز اپنانے ہوئے پوچھا تو لمحہ بھر کو وہ اپنی یادداشت کو کوس کر رہ گیا۔ اصولاً تو ابیہا کو گھر لاتے ہی اس ماہ کا بلکہ پچھلے کئی ماہ کا خرچا اس کے ہاتھ میں تھمانا چاہیے تھا۔
"جب سے انکل کی وصیت قابل عمل ہوئی ہے' تب سے اس کا خرچا بھی اسٹارٹ ہو چکا ہے مگر افسوس۔" عون واقعی متاسف تھا۔
"او کے۔ مانتا ہوں مجھ سے غلطی ہو گئی ہے' میں آج اس کو رقم پہنچا دوں گا اور سرونٹ سے کہہ کر کچن کا سامان بھی۔ کام کی مصروفیت میں دھیان نہیں گیا میرا۔" معیز نے گویا جان چھڑانا چاہی۔
"تم صرف رقم بھجوا دینا۔ باقی کا سامان میں اور نانی لے آئے تھے۔" عون نے بغیر جتائے اسے بتایا۔
"اس پہ کتنا خرچ آیا...؟" معیز نے یوں پوچھا جیسے ابھی چکانا چاہتا ہو مگر عون نظرانداز کر گیا۔

"بیسوں کو دفع کرو معیز! یہ ایک جیتی جاگتی زندگی کا سوال ہے۔ وہ پہلے بھی تکلیف میں تھی اب بھی قابل رحم زندگی گزار رہی ہے۔"

"تو کس نے کہا ہے گزارنے کو۔؟" وہ برودرانداز میں بولا انداز میں تجاہل عارفانہ تھا۔

"میں نے اسے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جو چاہے فیصلہ کرلے۔ میں طلاق دینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

معیز کے انداز پر عون چپ سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ کئی ثانیوں کے بعد وہ بول پایا۔

"میں نے تمہارا یہ سفاک روپ پہلے کبھی نہیں دیکھا معیز! اور نہ ہی تمہیں کبھی اس خانے میں فٹ کر کے سوچا تھا۔"

"فار گاڈ سیک عون۔ میرے گھریلو مسائل کو ہماری دوستی کے درمیان مت لاؤ۔" معیز نے تیز لہجے میں کہا۔ مگر عون کا دل خدا نے کسی اور مٹی سے بنایا تھا۔ اس نے غلطی کی تو تلافی سے معافی مانگنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں کی اور اب اگر وہ بے سزاوے رہی تھی تو وہ خندہ پیشانی سے بھگتنے کو تیار تھا۔

مگر معیز۔

وہ انا پرست دل کا مالک تھا۔ غلطی پہ غلطی کیے جانے والا۔ ایمہا سے شادی کرنا اگر ایک غلطی تھی۔ اول تو وہ یہ غلطی ہی نہ کرتا اور اگر کر ہی لی تھی تو اب اسے سنوارنے کے بجائے بگاڑ رہا تھا۔

"اور اگر وہ اپنی مرضی کا فیصلہ کرلے اور تمہارے گھر سے نہ جائے تو۔؟" عون نے اسے ایک ٹک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اسے جانا ہی پڑے گا۔ ہر جگہ ہر کسی کے لیے نہیں ہوتی۔" معیز کا انداز بے حد پرسکون تھا۔ جیسے وہ پہلے سے ہی بہت کچھ سوچ کر فیصلہ کر چکا ہو۔ عون کا دل بوجھل ہو گیا اور وہ معیز کے آواز دینے پر بھی نہیں رکا۔

☼ ☼ ☼

اور شام کو وہ دانت پیستا تلملاتا ہوا ایمہا کے سامنے موجود تھا۔

وہ ایک معصومانہ سے احساس سے لبریز ہوتے اہتمام سے اپنے لیے شام کی چائے کے ساتھ دو سینڈوچز بنا کے ٹی وی کے سامنے جمی بیٹھی تھی۔ آج پہلی بار اس اکیلی میں اس کے ہاتھ سے ٹی وی کے ریموٹ کو چھوا تو وی لاؤنج جیسے زندگی کی آواز سے گونج اٹھا۔ جس کے احساس کو کم کرنے کے لیے اس نے بیرونی دروازہ کھول دیا تھا۔ مگر اسے قطعاً امید نہ تھی کہ معیز احمد یوں دندناتے ہوئے سر پہ آن کھڑا ہو جائے گا۔

"بہت خوب! میری زندگی برباد کرنے کے بعد یہاں جشن منایا جا رہا ہے۔" اس نے گرم چائے کا کپ چھلکتے چھلکتے بچا۔

ایمہا کی رنگت فق ہو گئی۔ اس نے بمشکل کپ کو میز پر رکھا۔ وہ عین اس کے سر پہ کھڑا ہوا تھا۔

"میری زندگی تو بربادی کے دہانے پہ ڈال ہی دیا ہے تم نے۔ اب اور کیا چاہتی ہو۔" وہ جیسے بڑے ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر اس کے لب و لہجے کی تلخی کو ایمہا نے اپنی رگ رگ میں اترتا محسوس کیا۔

"م۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے۔؟"

"زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" معیز نے دانت پیسے۔ "مانتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں تمہاری ضروریات کا خیال نہیں رکھ پایا! مگر میں اس روز آیا تھا۔ تم سے پوچھا بھی تھا کہ کچھ چاہیے تو نہیں پھر تم

نے اس معاملے میں عون اور ثانیہ کو کیوں انوالو کیا۔ ان سے مدد مانگ سکتی ہو مجھ سے نہیں۔" اس کا لب و لہجہ شعلہ بار تھا۔

ایبہا نے معیز کو واسطہ پڑنے کے بعد سے ہمیشہ اسی طرح دیکھا تھا۔

شدید ترغصہ ناک تیوریاں اور لب و لہجہ شعلہ بار۔ وہ خود کو بد قسمت سمجھتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں مرد کا اتنا روپ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اب بھی اس کا دل بچے کی طرح کانپنے لگا۔ ہاتھوں پیروں سے گویا جان نکلنے لگی۔

چند لمحوں تک خاموش رہ کر معیز نے جیسے اپنے آپ کو ٹھنڈا کیا۔

"اگر میں تمہارا برا چاہتا تو کبھی تمہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کے یہاں نہ لاتا اگر میں اپنے مرتے ہوئے باپ کی آخری وصیت کو پورا کرنا چاہتا تھا۔"

معیز نے ہاتھ میں تھامی نوٹوں کی گڈی صوفے پر پھینکی تو وہ یوں بدک کر اٹھی جیسے اس کے پاس سانپ آگرا ہو۔

"تمہیں گھر بیٹھے اپنا حق ملتا رہے گا فکر میں یہ کبھی پسند نہیں کروں گا کہ تم میرے رشتوں کو خراب کرو۔" انگلی اٹھا کر غصیلے انداز میں کہتا وہ جیسے دندناتا ہوا آیا تھا ویسے ہی چلا گیا۔

"یا اللہ...." نوٹوں کی گڈی صوفے پہ پڑی اس کا منہ چڑا رہی تھی اور اس گڈی کے ساتھ ربڑ بینڈ میں جکڑی ایک چیک بک۔ اس نے بے اختیار جھپٹتے ہوئے چیک بک کو نوٹوں سے الگ کیا۔

یہ اس کے اسی پرانے بینک اکاؤنٹ کی نئی چیک بک تھی جو اغیاز احمد نے اس کے نام پہ کھلوایا تھا اور جس میں سے ہاسٹل اور کالج کی فیس ادا کرنے کے لیے وہ ساری رقم نکلوا چکی اور... جہاں سے اس کی بدقسمتی کا آغاز ہوا تھا۔

اس نے گہری سانس بھری اور چیک بک کھول کر دیکھنے لگی۔

اسے ایک جھٹکا لگا۔

پچاس لاکھ۔

شاید اسے صفر گننے میں غلطی ہو رہی تھی۔

ایبہا نے انگلی ڈبالی کر کے بچوں کی طرح ان ہندسوں کو بار بار گنا مگر ہر بار وہ چھ صفر ہی تھے۔

اس کے ہاتھوں پیروں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس نے بے اختیار چیک بک بند کر کے باہر سے دیکھی۔ وہ اسی کے نام پہ تھی۔

"یا اللہ...." اس نے چیک بک نوٹوں کے پاس ڈال دی۔

اتنی رقم پا کر اس کا دل دوبارہ سے دھڑکنا ہی بھول گیا تھا وہ تیزی سے اٹھی اور موبائل اٹھا کر ثانیہ کو کال کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

شام کی چائے پر خالہ نے اسے پھر سے عون کے حق میں کنونس کرنا شروع کیا تو ثانیہ نے گہری سانس بھری۔

"آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں خالہ جان! سب ٹھیک جا رہا ہے۔" اس نے لپٹا لپٹایا جواب دیا مگر خالہ بھی بڑی صاف گو تھیں۔ تنک کر بولیں۔

"یہ تو جب تم خود ماں بنو گی تب پتا چلے گا کہ جب بچے ایک جائز بات نہ مانیں تو ماں باپ پہ کیا بیتتی ہے۔"

"لاحول ولا...." ثانیہ کانوں تک لال پڑ گئی۔

"ارے میں کہوں۔ اس معصوم بچے سے غلطی ہو گئی ہے تو کیا اب اس سے ناک کی لکیریں نکلواؤ گی۔"

"معصوم بچہ.... عون....؟"

ثانیہ کا دل چاہا زور سے ہنسے مگر خالہ آج جس طمطراق کے عالم میں تھیں۔ اس میں مسکراہٹ بھی شاید انہیں سیخ پا کردیتی۔ ہنسنا تو ممنوع ہی تھا۔

"ہم بات کررہے ہیں خالہ! اور پھر ابھی تو میری جاب شروع ہوئی ہے۔" وہی تفصیل سے بھاگنے والا انداز۔

"ارے جاب کو ڈالو بھاڑ میں' میں کہتی ہوں رخصتی کرو اور جا کے اپنا گھر بار سنبھالو' پھر ساری عمر یا نیں کرتی رہنا۔" خالہ نے اسے گھورا۔

"خالہ جان پلیز! جب عون کو کوئی اعتراض نہیں تو پھر آپ لوگ کیوں خوامخواہ ایشو بنارہے ہیں۔" وہ ناراضی دکھانے لگی۔

"یہ تو اس کی محبت ہے' جو وہ کوئی اعتراض نہیں کررہا۔ اپنی غلطی مان رہا ہے۔ اس کے بندھے ہاتھوں کو پیار سے اپنے ہاتھوں میں لے لو گی تو وہ ساری عمر تم سے محبت کرے گا۔ یوں چھان پھٹک کے کاروبار ہوا کرتے ہیں بی بی! محبت نہیں.... اور میری ایک بات یاد رکھنا! مرد اگر محبت سے جھکے تو اسے کانچو کا الو بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ پچھتانا پڑتا ہے پھر۔"

وہ چائے کا کپ اٹھا کے اپنے کمرے کی طرف بھاگ آئی مگر خالہ کے تمام جملے کانوں میں پڑ ہی گئے۔

وہ تھکی ہی دیر تک چائے پیتے سوچتے کڑھتی رہی اور کڑھتے کڑھتے سوچتی رہی۔

"اور جو ایک لڑکی کی انا کو ٹھیس پہنچی وہ....؟"

وہ چھٹیوں میں گھر گئی تو اس کا والہانہ استقبال ہوا مگر وادی....

انہیں ہمیشہ یہی فکر لاحق رہتی کہ پڑھائی میں جتے رہنے سے کہیں وہ گھر کے کام کاج نہ بھول جائے۔

وسیع و عریض نئے طرز کے بنے گھر کا صحن محض وادی کی فرمائش پہ کچا رکھا گیا تھا۔ اطراف میں رنگا رنگ پھولوں کی کیاریوں کا اہتمام تھا تو شام ہوتے ہی کچے صحن پہ پانی چھڑک کر اس پر چارپائیاں لگا دیے جاتے اور سفید چادروں سے بچی چارپائیاں بچھ جاتیں اور یہ ثانیہ کا امتحان ہی ہوا کرتا تھا کہ وادی اسی سے ہر بار صحن میں مٹی اور بھوسے کی لپائی کروایا کرتی تھیں۔

ثانیہ کو اچھی طرح یاد تھا اور وہ بھول بھی کیسے سکتی تھی۔

جس روز عون نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا۔

مٹی سے لتھڑے ہاتھوں اور چہرے پہ مٹی کی چھینٹوں کے ساتھ فرش کی لپائی کرتی ثانیہ نے اسے یوں منہ اٹھائے صحن میں قدم رکھتے اور پھر اسکیٹرز کی طرح سلپ ہو کر عین صحن کے وسط میں خود کو سنبھالتے دیکھا تو ہنسی آنے کے بجائے اسے غصہ آیا۔ اس نے سارا صحن ہی کھود ڈالا تھا۔

وہ خوب چیخی چلائی۔

"وادی.... دیکھ لیں آپ۔ میں اپنا کام کرچکی اور اب دوبارہ ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔ اتنی محنت پہ آکے موصوف نے "پاؤں" پھیر دیا۔"

یہ ثانیہ تھی اور عون کو جب پتا چلا کہ "یہ" ثانیہ تھی۔ تو وہ وہاں محض ایک رات ہی رکا۔ اگلی صبح وہ وہاں سے نکل بھاگا اور پھر اس نے اس شادی کو نبھانے سے انکار کردیا۔

بچپن کا وہ نکاح جس نے ثانیہ کو ایک ان دیکھی ڈوری سے باندھ رکھا تھا۔ یکلخت ہی جیسے کچا دھاگا بن گیا۔

بچپن سے لے کر اب تک ثانیہ کے رشتے کے طلب گار رشتہ داروں نے عون کے اس انکار کو خوب اچھالا۔

ثانیہ کے گھر پہ آکے وادی' امی اور ابا کو پڑ سے رہے اور ساتھ ہی عون اور ارم کی پسندیدگی کا قصہ زبان زد عام ہوا۔

اور اب۔۔۔

ثانیہ نے گہری سانس بھری۔

وہ لمحوں میں برسوں کا فاصلہ طے کر آئی تھی۔ کیا وہ عون جیسے جلد باز اور عجلت پسند شخص پہ اعتبار کر سکتی تھی! وہ عون کو اسی انکار کی کسوٹی پر پرکھتی تو جواب ہمیشہ نفی میں آتا تھا۔

ثانیہ نے بلا ارادہ اپنا موبائل فون اٹھایا۔ ان باکس عون کے گڈ مارننگ اور گڈ نائٹ میسجز سے بھرا ہوا تھا۔ اور دن میں جب بھی بقول اس کے "تم یاد آتی ہو تو میسج کر دیتا ہوں۔"

تیز اسکرین پہ حرکت کرتا اس کا انگوٹھا ایک میسج پر ٹھہرا۔

"بھی تم ہو نہیں سکتے

مجھ سے تم کو نفرت ہے

تمہیں تقسیم کرتا ہوں

ضرب سی دل پہ لگتی ہے!"

"ہنہ۔۔۔ جمع ہونے کے لائق تم نے چھوڑا ہی کہاں ہے ہم دونوں کو عون عباس!" وہ سلگی۔

اسے اپنا دل راکھ کا ڈھیر لگتا تھا مگر یہ سلگتا؟ وہ ٹھٹک جاتی۔ تو کیا کوئی چنگاری ابھی باقی تھی۔ مگر وہ کھوج نہیں کرتی تھی یا شاید کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بے دلی سے موبائل ایک طرف ڈالا ہی تھا کہ وہ بج اٹھا۔

ثانیہ نے چونک کر موبائل اٹھایا اور ابیہا کا نمبر دیکھ کر فوراً "کال اٹینڈ کرلی۔

"کیسی ہو دوست؟"

سلام دعا کے بعد ثانیہ نے خوشی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔۔۔ آپ کیسی ہیں آپی؟"

اس کا لہجہ مدھم تھا۔ ثانیہ کی مسکراہٹ سکڑی۔

"ہوں۔ میں بھی ٹھیک ہوں۔ تم بتاؤ۔ کیسے حالات جا رہے ہیں؟"

"پتا نہیں۔ آج معیز آئے تھے۔ بہت غصہ کیا۔" وہ اٹکی۔ ثانیہ چونکتا ہوئی۔

"کیوں۔ کس بات پہ غصہ کیا انہوں نے؟"

"یہی کہ میں نے اس معاملے میں آپ لوگوں کو کیوں انوالو کیا اور یہ جو گھر کی چیزیں منگوائیں ان پر۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"ہاں۔ تو تم انہیں سو دفعہ منگواؤ گی۔ ان کا کیا خیال ہے کہ تمہیں یوں بھوکا پیاسا مار کے اپنا راستہ صاف کرلیں گے۔"

ثانیہ نے تیز لہجے میں کہا تو وہ گڑبڑا گئی۔

"نہیں نہیں۔ وہ تو مجھے ڈھیر سارے روپے دے کر گئے ہیں اور ساتھ میں میرے اکاؤنٹ کی چیک بک بھی۔ اس میں پچاس لاکھ روپے ہیں میرے نام۔"

"تو کون سا احسان کیا ہے تم پر۔" وہ متاثر ہونے کے بجائے بے اعتنائی سے بولی۔

"یہ پچاس لاکھ وہی ہیں جو انکل نے تمہارے لیے وصیت کیے تھے اور باقی تمہارا ماہانہ دس ہزار کے حساب سے خرچا ہے۔ وہ بھی انکل کی وصیت کے مطابق۔ ورنہ یہ موصوف تو نان نفقے کی ذمہ داری سے مبرا ہیں۔"

"مگر میں اتنے پیسوں کا کیا کروں گی ثانیہ۔؟" وہ اتنی لاچاری سے بولی کہ ثانیہ کو ہنسی آگئی۔

"اپنے گھر کو سنوارو۔۔۔ شاپنگ کرو، بیوٹی سیلون کے چکر لگاؤ۔ پتا بھی نہیں چلے گا کہاں گئے۔"

"مجھے ان روپوں کی کوئی خوشی نہیں ہے ثانیہ! غم ہے تو یہ کہ کہیں وہ مجھے ٹھکرا نہ دیں۔" اس کی آواز بھیگنے لگی۔

ثانیہ سنجیدہ ہو گئی۔ "کسی سے یک طرفہ محبت کرنا اور اس کے ساتھ زبردستی تپنے رہنا ذلت کے سوا اور کچھ نہیں دیتا ایبہا!"

"محبت۔۔۔ تو نہیں ہے۔۔۔ وہ میرے شوہر ہیں۔" ایبہا لڑکھڑائی۔

"میں تمہیں یہ بھی سمجھانا چاہتی تھی پیا! ابھی محبت کا کوئی چکر نہیں ہے۔ معیز کا رویہ اور حالات تم دیکھ ہی رہی ہو۔ میری مانو تو وقت پہ کوئی اچھا سا فیصلہ کر لو۔" ثانیہ نے بڑی محبت سے اسے سمجھایا۔

"جن کی شادیاں ہوتی ہیں۔ وہ کون سا پہلے سے آپس میں محبت کررہے ہوتے ہیں۔ یہ تو وقت گزرنے کے ساتھ کا عمل ہے۔" ایبہا نے سادگی سے اپنا مطمع نظر پیش کیا۔ وہی۔۔۔ کسی ایک ہی کا ہو کر رہنے کی چاہت۔

"لیکن ان کے درمیان نفرت کا بھی رشتہ نہیں ہوتا ایبہا۔" وہ کہے بغیر رہ نہ سکی تھی۔

ایبہا خاموش ہو گئی۔

"اچھا۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔"

لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا تو ثانیہ کو افسوس ہوا۔

ابھی شاید اتنی گہری باتوں کا وقت نہیں آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سفینہ بڑی بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔ جب سے ایبہا اس گھر میں آئی تھی ان کا بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا تھا۔

زارا ان کے لیے چائے لائی تو وہ خشمگیں۔

"میں نے آپ سے کہا تھا آرام کریں اور آپ واک کیے جا رہی ہیں۔"

زارا نے سائیڈ ٹیبل پہ چائے کا کپ رکھتے ہوئے خفگی دکھائی تو وہ اپنے بیڈ کے کنارے بیٹھتے ہوئے تلخی سے بولیں۔

"آرام اب رہا ہی کہاں ہے زندگی میں۔ بھلا ہو تمہارے باپ کا۔ عدت بھی سکون سے گزارنے نہیں دی تھی۔"

"لاحول ولا۔۔۔" ماں کی بنا سوچے بولنے والی عادت نے زارا کو گڑبڑا دیا۔ "کیا کیا سوچتی رہتی ہیں آپ۔"

"میں نے بہت کچھ سوچ لیا ہے۔ پہلے تو اس سے اس گھر کا حصہ واپس ہتھیانا ہے۔ اس کے بعد اسے دھکے دے کر یہاں سے نکالنا ہے۔" ان کی آنکھیں چمکیں۔

"مگر وہ یہ حصہ واپس دے گی کیوں؟"

زارا نے محض ماں کا دل رکھنے کی خاطر موضوع میں دلچسپی لی۔ ورنہ اتنے دنوں سے وہ لڑکی انیکسی میں رہ رہی تھی اور کسی کو پتا بھی نہ تھا۔ ساری عمر بھی رہتی تو شاید اس گھر کے اندر اس کی آواز تک داخل نہ ہو سکتی۔

مگر یہ تو سفینہ جانتی تھیں کہ وہ کن انگاروں پہ لوٹ رہی تھیں۔ ان دیکھے مناظر کو یہ وہ ذہن پر جما جما کر دیکھتی نہ تڑپتی رہتیں تو انتیاز احمد کو خوب کوسنے دیتیں۔

"اقبال احمد کی ملکہ کو اس گھر کی ماسی نہ بنایا تو نام بدل دینا میرا۔"
وہ پُراسرار انداز میں بولیں تو زارا نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ عون کے ساتھ ڈنر کے لیے آ تو گئی مگر شدید جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔
وہ بس ڈرتے ڈرتے اسے لینے گیا۔ کیا پتا اب کی بار وہ جیلی کون سا روپ بنائے ساتھ چل پڑتی۔ مگر کاٹن کے دیدہ زیب کڑھائی والے سوٹ میں ملبوس وہ سرتاپا ایک بے لطفی کے حصار میں تھی۔
منہ پھلائے وہ فرنٹ سیٹ پہ آ بیٹھی۔ بنا عون عباس کی جگمگاتی نگاہوں کا احساس کیے۔
وہ ہلکا پھلکا سا مسکراتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھا۔ نازک سا کلچ گود میں رکھے۔ سینے پہ دونوں بازو لپیٹے وہ ونڈ اسکرین کو گھور رہی تھی۔ عون ہنس دیا۔
"کیا ہوا یہ غبارہ کیوں ساتھ لے آئی ہو؟"
"کون سا غبارہ؟" وہ چونک کر بولی۔ مسکراہٹ دباتے ہوئے عون نے بیک ویو مرر کا رخ اس کی طرف کیا تو اسے غصہ آگیا۔
عون ہنستے ہوئے مرر سیٹ کرنے لگا۔
"بالکل غبارے کی طرح منہ پھلا کے بیٹھی ہوئی ہو۔"
"خاموشی سے گاڑی چلاؤ اور جہاں مجھے لے جانا ہے لے جاؤ۔ ورنہ خوامخواہ موڈ خراب ہوں گے۔" وہ تنک کر بولی۔
عون نے گہری سانس بھرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ وہ ہوٹل میں بھی جھنجلائی ہوئی تھی۔

"دماغ خراب ہوگیا ہے سب کا۔ کوئی بھی نہیں جا رہا تو ہم دونوں کو کیوں بھیجا جا رہا ہے۔"
"اوف" عون معاملے کی تہ تک پہنچا۔ یہ نادیہ موٹو کی شادی کا معاملہ تھا۔ جس کے لیے طے پایا تھا کہ عون اور ثانیہ کو بھیجا جائے تاکہ خیرسگالی کے طور پر دونوں گھروں میں سے نمائندگی ہو جائے۔
"کم آن یار۔ مزا آئے گا۔ میں تو سوچ کر ہی ایکسائیٹڈ ہو رہا ہوں۔"
وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس نگاہ کا احساس اسے شرما دیتا۔ یا کم از کم وہ بھی جذبات کی اس انتہا پر آ جاتی جہاں اس پل عون عباس کھڑا تھا۔
مگر یہ ثانیہ تھی۔ لفظوں کی ٹھوکروں سے سب کچھ اڑا دینے والی۔
"ہاں۔ تم ہو سکتے ہو۔ تمہارا تو نواسا بھی ہے۔ مگر میرے لیے وہاں کیا ایکسائٹمنٹ ہوگی۔"
وہی سید حارم والا تیر۔ بظاہر ثانیہ نے اچکا کر سادگی سے کہا۔
"میری ایکسائٹمنٹ یہ ہے کہ ہم دونوں باضابطہ ایک حیثیت سے اس شادی میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔"
عون نے اسے جتایا تو وہ بدبدائی۔
"وہ حیثیت جس کا تعین ہونا باقی ہے۔"
عون نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا اور آرام سے بولا۔ "تمہارے لیے ہوگا۔ میں جانتا ہوں تم میری کیا ہو اور میرے لیے کیا ہو۔"
وہ ترکی بہ ترکی زبان چلانے والی بد ساتھی تھی۔ بڑھی لکھی ہی سہی مگر عون کے لفظوں کے چناؤ نے اس کی پلکوں

کو لمحہ بھر کے لیے بوجھل کر دیا۔
رخساروں کی لالی وہ چھپا نہ سکی تھی۔
"پھر بوری...." اس کے لب لرزے اور اوپری ہونٹ کے خوب صورت خم نے بے اختیار عون کی نگاہ کو جکڑا۔
اس کے ہونٹوں پہ پیاری سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"سو آو مائی بیسٹ فرینڈ۔ اور دوستوں کے ساتھ ٹرپ کی انجوائے منٹ تو تم بھی جانتی ہو گی۔" ایک پل میں وہ بات گھما کر اس کا اثر زائل کر گیا تھا۔
"مگر یہ ایک ہفتے کا ٹرپ ہے عون! میں کسی کے گھر جا کے اتنے دن نہیں رہ سکتی۔ اوپر سے بڑی ممانی کی طرف گفتگو۔" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
"کانٹے کی ٹکر ہو گی۔" وہ بے اختیار بولا۔ پھر ثانیہ کے گھورنے پر جلدی سے کہا۔
"تمہیں بھی تو اس "علم" پر عبور حاصل ہے نانی جان کی طرح۔"
"تم پلیز.... کسی طرح مجھے ساتھ لے جانے سے انکار کر دو۔" وہ ملتجیانہ انداز میں بولی۔
"میں کسی بھی طرح تمہیں ساتھ لے جانے سے انکار نہیں کر سکتا۔ تم میرے ابا کو میرے جتنا نہیں جانتیں۔" عون نے بھر جھری لے کر خوف زدہ ہونے کی اداکاری کی۔
"یہ سب تمہارا ہی بنایا ہوا ڈراما لگتا ہے مجھے۔" ثانیہ نے کانٹا اٹھا کر عون کے بازو میں چبھویا اور جواباً" اس نے اتنی زور سے "آہ" بلند کی کہ ثانیہ نے کانٹا ٹیبل پر رکھ کر بے اختیار لبوں کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔
کئی گردنیں ان کی طرف مڑی تھیں اور اب عون کے ہنسنے پر ثانیہ کو غصہ آرہا تھا۔
"کانٹا تھا' تلوار تو نہیں تھی' ذلیل' بےحس' "
"اتنی زور سے جو چبھویا بلکہ گھونپا تھا تم نے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔
"غلطی ہو گئی۔ مجھے یہ چھری استعمال کرنا چاہیے تھی۔" ثانیہ نے چھری اٹھا کر اسے دھمکایا تو وہ مسکرا دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے انداز سے بولا۔
"تم چھری اٹھاتیں' میں اپنا دل نکال کے پیش کرتا۔"
اس کی نگاہوں نے لمحہ بھر ہی ثانیہ کی نگاہ کو جکڑنے کی گستاخی کی مگر ثانیہ کا دل گویا کسی نے زور سے مٹھی میں دبوچ کے پھر آہستہ آہستہ چھوڑا تھا۔ وہ نگاہ پھیر گئی۔
"یہ ایک چھوٹا سا تحفہ میری بیسٹ فرینڈ کے لیے۔" گہرے سبز رنگ کا مخملی ڈبا ثانیہ کی طرف دھکیلتے ہوئے مسکرایا۔
"مجھے دوستوں سے گفٹ لینے کی عادت نہیں ہے عون! پلیز مائنڈ مت کرنا۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔
"تمہیں مجھ جیسا دوست ملا ہی کہاں تھا پہلے۔ مجھے بہت عادت ہے دوستوں کو گفٹ دینے کی۔" عون نے اس کی معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔
وہ گہری سانس بھر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے یوں ہی ڈائننگ ہال میں لوگوں کو دیکھنے لگی۔
وہ بڑے سکون سے اسے دیکھتا اس کی توجہ کا منتظر تھا۔ پھر وہ جھنجلا کر آگے ہوئی اور ہاتھ بڑھا کر وہ کیس اٹھا لیا۔
"مجھے یہ سب پسند نہیں ہے عون! ٹین ایجرز جیسی حرکتیں۔" وہ اتنا دھیرے کی بڑبڑائی تھی۔
"شکر ہے تم نے "چیپ" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ کھول کے دیکھو' یہ ڈبا گفٹ نہیں کیا میں نے۔ اس کے اندر

بھی پتا ہو جب۔"

وہ من سوچ تھا۔ لمحہ بھر میں اس کی باتوں کو نظر انداز کر کے پھر سے شاداب ہو جاتا۔

ثانیہ نے وہ کیس کھولا تو اس میں میرون اور سی گرین نگوں سے جڑی نفیس سی معنے کی چوڑی اور اس چوڑی سے منسلک باریک چین سے جڑی ایک نازک سی انگوٹھی۔ جس کا ایک نگ میرون تھا اور ایک سی گرین۔ وہ واقعی ایک نفیس گفٹ تھا۔

خود ثانیہ بھی اسے جیولر شاپ پہ دیکھتی تو خریدنا چاہتی۔

"یہ بہت قیمتی گفٹ ہے عون!" اس نے کیس واپس ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔

"گفٹ کو قیمت کی نہیں جذبات کی بنیاد پہ رکھنا چاہیے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"اور انسانوں کو؟" ثانیہ نے طنز کیا۔ مگر وہ نظر انداز کر گیا۔

"اب تم یہ پہن رہی ہو یا میں خود اٹھ کے یہ کام انجام دے لوں۔"

"میں رنگ وغیرہ نہیں پہنتی۔" وہ آنا کانی کر رہی تھی۔ شاید عون سے اتنا قیمتی گفٹ لینے میں ہچکچاہٹ مانع تھی۔

"تو پھر میں دے رہا ہوں تو پہننی چاہیے۔"

وہ ویٹر کو اشارہ کرتے ہوئے بولا تو ثانیہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے وہ چوڑی اٹھائی اور کلائی میں ڈالنے لگی۔ انگوٹھی پہن کر جیسے اس کا سنگھار مکمل ہو گیا تھا۔

"ہوں۔ ونڈر فل۔" عون نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے توصیفی انداز میں کہا۔

"اچھا۔ اب اصل بات پہ آؤ عون! میں اس شادی میں شرکت نہیں کرنا چاہتی۔" ثانیہ نے اس کی توجہ خود پر سے ہٹانے کے لیے کہا۔

"شادی میں شرکت بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ابا کہہ چکے ہیں اب میں تمہارے لیے منع کروں گا تو زیر عتاب آجاؤں گا۔"

ویٹر آگیا تھا۔

عون اسے اپنی اور ثانیہ کی پسند کی ڈشز نوٹ کرانے لگا۔ ایک بہترین ڈنر کے بعد وہ دونوں لانگ ڈرائیو پہ نکل گئے۔ گاڑی میں چلتا رومینٹک سا میوزک اور عون کی معنی خیز سی خاموشی ثانیہ کو اپنا دھیان کسی اور طرف لگانا دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔

"عون! اب گھر چلو۔" اس نے کہا اور عون نے شرافت سے گاڑی واپس موڑ لی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

ثانیہ نے گیٹ کے سامنے اتر کر پرس میں سے چابی نکالی۔ عون بھی نیچے اتر آیا۔

"میرے ساتھ اتنا خوب صورت وقت گزارنے کا شکریہ۔"

"مگر آئندہ کبھی میں اتنے لمبے ٹائم کے لیے نہیں جاؤں گی۔ گیارہ بج رہے ہیں۔ صبح میرا آفس ہے۔" وہ اسے واوین کر رہی تھی۔

"اور یہ کہ آج تم بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔" عون کی جسارت۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ثانیہ کے بالوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے کیا تھا۔ ثانیہ کی تو جیسے سانس تک رک گئی۔

"اچھا۔ اب گھر جانا سیدھے۔ ماموں جان سے ڈانٹ مت کھانا۔"

اسے اس پل عون کے سامنے کھڑے ہونا دنیا کا مشکل ترین کام لگا۔ پلٹ کر جالی لگا کر دروازہ کھولنے لگی۔ پھر پلٹ کر اسے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور اندر چلی گئی۔
عون کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بہت سرشار سا پلٹ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆

رباب نے اس روز کے بعد سفیان حمیدی کی کوئی کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔ اسے درحقیقت سیفی پر بہت غصہ تھا۔ مگر آج پانچویں روز وہ اسے اچھی طرح تڑپانے کے بعد نک سک سے تیار اس کے آفس آپہنچی۔
وہ اسے دیکھ کر بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔
"واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز۔ میں تو تم سے رابطے کی امید ہی کھو بیٹھا تھا۔" اس نے گرمجوشی سے رباب سے ہاتھ ملایا۔ وہ من گلاسز بالوں پہ اٹکاتی اس کے عین سامنے بیٹھ گئی۔
"تمہیں امید کھو ہی دینی چاہیے تھی۔ یہ تو میری مہربانی ہے کہ پھر سے تمہیں لفٹ کروا دی۔" ٹانگ پہ ٹانگ جمائے وہ تن کے بیٹھی بہت مغرور دکھ رہی تھی۔
سیفی کا دل پہلو میں لوٹ کر رہ گیا۔
(ایک دفعہ یہ میڈم کے "آستانہ" میں داخل ہو جائے تو بس۔۔۔)
"ناراض ہو گیا؟" وہ دلبری سے پوچھنے لگا۔
"کیا نہیں ہونا چاہیے؟" رباب نے تیکھے انداز میں ابرو اچکایا۔
"ناراض تو شاید مجھے ہونا چاہیے۔ تمہارے سامنے اس شخص نے میری اتنی انسلٹ کی۔ مجھے ٹیبل سے اٹھا دیا اور تم خاموشی سے دیکھتی رہیں۔" وہ شکوہ کناں انداز میں بولا۔
"کسی کی بھی فیملی کے درمیان یوں گھس کے بیٹھ جانا مینرز کے خلاف ہے سیفی! اگر وہ تمہاری فیملی میں یوں گھس کے بیٹھتا تو تم بھی یہی کرتے۔" رباب نے بے اعتنائی سے کہا تو وہ چونکا۔
"فیملی۔۔۔"
"کزن ہے میرا اور بہت اچھا دوست بھی۔۔۔ مگر شاید وہ تم سے میری دوستی کو پسند نہیں کرتا۔" رباب نے بے نیازی سے شانے جھٹکے۔
"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔" سیفی نے اتفاق کیا۔ "ہمارے بزنس ٹرمز بھی کچھ خاص اچھے نہیں ہیں۔"
"لیکن آئندہ تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" رباب نے انگلی اٹھاتے ہوئے اسے وارن کیا۔
"تم پر نظر پڑتے ہی میرا دل بے قابو ہو گیا تھا سویٹ ہارٹ! میں خود کو روک ہی نہیں پایا۔" وہ اٹھ کر چلتا ہوا اس کی کرسی کی پشت پر آگیا۔
اور اس سے پہلے کہ رباب کچھ سمجھ پاتی سیفی نے جھک کر اسے اپنے بازو کی گرفت میں لیا۔ رباب نے اس کا چہرہ اپنے رخسار سے مس ہوتا محسوس کیا تو وہ جیسے کرنٹ کھا گئی۔
"یو نو۔۔۔ آئی لو یو سو مچ۔" وہ مخمور انداز میں بولا مگر رباب کے وجود میں تو جیسے ایک بھونچال سا آگیا۔ ایک جھٹکے سے اس نے سیفی کا بازو پیچھے دھکیلا۔
"واٹ دا ہیل۔۔۔ کیا بکواس ہے یہ۔۔۔" وہ غصے سے چیخ پڑی تھی۔
"کم آن ڈیئر!" وہ اسی رو میں تھا۔ رباب اٹھ کھڑی ہوئی۔
"اسٹاپ اٹ سیفی! تم جانتے ہو مجھے ایسی حرکتیں پسند نہیں، پھر بھی تم نے۔۔۔" وہ شدید غصے اور اشتعال کی

کیفیت میں تھی۔ چہرہ تمتما اٹھا تھا۔
"دونوں کی دوستی نہیں ہے ہماری دوبارہ۔"
وہ مزید بحث وقت کے موڈ میں تھا۔ رباب کا دل گھبرانے لگا۔ ایسی صورت حال کے متعلق تو اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ وہ یہاں آنے کی غلطی پر پچھتانے لگی۔
"سیفی پلیز۔ مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔ جب تک کہ ہمارے درمیان کوئی مضبوط رشتہ نہیں بن جاتا۔"
وہ اسے طریقے سے ہینڈل کرنا چاہتی تھی۔ سو اپنے غصے کو پس پشت ڈال کر قدرے نرمی سے بولی تو وہ معنی خیزی سے کہنے لگا۔
"مضبوط رشتہ بنانے کی شروعات ہی تو کر رہا ہوں۔ اتنے دنوں کے گیپ کے بعد ملو گی تو جذبات میں ایسا ابال تو فطری بات ہے۔"
"اوفوہ اچھا۔ چلو آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔ تمہارا دماغ بھی کچھ ٹھنڈا ہو اور جذبات بھی۔"
وہ فورا" دروازے کی طرف بڑھی۔
ادھر تو یہ حال تھا کہ نماز بخشوانے آئی تھی اور روزے گلے پڑ گئے۔ مگر رباب نے بہر حال یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اب سیفی سے پیچھا چھڑا ہی لے گی۔

☆ ☆ ☆

معیز نے جب جب اپنی لاپروائی کے متعلق سوچا اسے خود پر افسوس ہی ہوا۔
اس قدر بے حسی ان کی سرشت میں شامل نہیں تھی مگر حالات اسے اس نہج پر لے آئے تھے کہ دل ایمہا سے ہمدردی پر آمادہ ہوتا بھی تو دماغ اسے رد کر دیتا تھا۔
اس کا جی چاہتا تھا کہ اسے کہیں سے جادو کی چھڑی مل جائے جسے گھما کر وہ وقت کو پھر سے پیچھے لے جائے جہاں وہ ایک مکمل بے فکر اور خوش باش انسان تھا۔
اب تو ذہن پہ دھرا بوجھ کسی پل کھل کے خوش ہونے ہی نہیں دیتا تھا۔
اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایمہا والا معاملہ کس طور پار لگے گا۔ اس نے ایمہا سے کہہ تو دیا تھا مگر وہ اکیسی میں بیٹھے بیٹھے تو کسی کو پسند نہیں کر سکتی تھی۔۔ اور وہ خود۔ تو کیا تو جیسہ پیش کرے گا لڑکے والوں کو؟
وہ سوچتا تو الجھتا ہی چلا جاتا۔ اس کی ذہنی پراگندگی بڑھنے لگتی۔
اسے سراسر ایمہا قصور وار دکھائی دیتی۔ اسی کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کھل کر جی نہیں پا رہا تھا۔
اور رباب۔
ہاں۔ رباب ایک ایسا روزن تھی جس سے زندگی کی تازہ ہوا آنا شروع ہوئی تھی۔ وہ شدت پسند تھی۔ جذبوں کے اظہار میں لگی لپٹی رکھنے کی قائل نہ تھی۔
اور اتنا ہی صاف گو کبھی معیز احمد بھی ہوا کرتا تھا۔ مگر اب جانے کیا قفل لگا تھا اس کے ہونٹوں پر۔ رباب کے لیے دل میں بہت خاص جذبات رکھنے کے باوجود وہ کھل کر اس سے اظہار نہیں کر پایا تھا۔
اور اس سب کی قصوروار ایمہا مراد تھی۔ وہ طے کر چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اچھا۔ اپنا دھیان رکھنا اور ہاں۔۔ کسی کے ساتھ زیادہ مدارات کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی کچھ بولے بھی

تو پتا تو جواب دینا۔"

باہر آتے ہوئے بھی خالہ جان کی نصیحتیں اور فہمائشیں جاری و ساری تھیں۔

"وہاں جا کر اپنے آپ ہی میں مگن نہ رہنا۔ عون کا بھی دھیان رکھنا۔"

وہ جو شاید قسم کھا چکی تھی کہ ان نصیحتوں کے جواب میں کچھ نہیں بولنا۔ چیخ گئی۔

"آپ بے فکر رہیں۔ آپ کے بھتیجے کا خیال رکھنے والے وہاں بہت ہیں۔"

"خبردار۔" خالہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ "تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے ہو۔ کوئی تیسرا نہ سنوں میں۔"

وہ منہ پھلائے باہر آئی۔ عون اس کا سامان گاڑی کی ڈگی میں رکھنے لگا۔

"اللہ کی امان میں میرے بچے۔ ہم سب کی طرف سے بہت مبارک باد پہنچانا اور اس سرپھری کا دھیان رکھنا۔"

خالہ جان نے عون کی بلائیں لیتے ہوئے آخر میں کہا تو ثانیہ کے منہ کے زاویے بگڑتے دیکھ کر اسے ہنسی آگئی۔

انہیں ایئرپورٹ جانا تھا۔ عون نے ایئرپورٹ تک رینٹ اے کار لی تھی۔ ڈرائیور ساتھ ہونے کی وجہ سے ثانیہ کو اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ مگر ایئرپورٹ پہنچ کر ابل گیا۔

"میں نے کہا تھا تم سے میں نہیں جاؤں گی۔"

"اوفوہ۔ بس چپ۔ ابھی گڑیا کو جہاز کی سیر کرائیں گے۔"

عون نے جیسے چند سالہ بچی کو پچکارا تھا۔ ثانیہ نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔ عون نے دل پہ ہاتھ رکھا۔

"اف... بہت قاتلانہ انداز تھا۔ بندہ جان سے بھی جا سکتا تھا۔ خیال کیا کرو تھوڑا۔"

"بہت لفنگے..." بے اختیار غصے سے کہتے وہ بتا نہیں کیا خیال آنے پر زبان دانتوں تلے دبا گئی۔

"لف... یعنی لفنگے...؟"

وہ مزے سے پوچھ رہا تھا۔ ثانیہ نے پاؤں پٹخے اور میگزین میں منہ دے لیا۔

"میں کسی طور وہاں نہیں جانا چاہتی تھی عون!" جہاز اپنی پوری بلندی پر تھا جب آنکھیں موندے عون نے ثانیہ کی مدھم آواز سنی۔

"میں اس ذلت کو وہاں دہراتے ہوئے نہیں سننا چاہتی جو تم نے مجھے ریجیکٹ کر کے لوگوں کے لبوں کو بخش دی تھی۔" عون نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں اور چہرہ موڑ کر ثانیہ کو دیکھا۔

وہ بہت دل گرفتہ اور شکستہ لگی۔

"مگر میں تمہارے ساتھ وہاں ضرور جانا چاہتا تھا... ان سب کو تمہارا اصل مقام بتانے کے لیے۔" عون کا لہجہ بہت نرم تھا۔

ثانیہ لب کچلتی کھڑکی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"اب بس بھی کرو۔ تمہارا تو بار سنگھار ہی مکمل نہیں ہو پا رہا۔"

نیلم نے ارم کے ہاتھ سے لپ گلوز چھینتے ہوئے طنز کیا تو وہ لہرا کر بڑے انداز سے بولی۔

خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہیں
موج ہوا کے ہاتھ میں ان کا سراغ ہے

"ان کا۔ یعنی ان دونوں کا۔۔۔" نیلم نے اپنا میک اپ کا سامان سمیٹنا شروع کیا۔
"جی نہیں۔۔۔ مجھے تو صرف عون کا انتظار ہے۔ باقی سب گند بلا ہے۔ اس سے مجھے کیا سروکار۔" ارم نے ہونٹوں کو سکیڑ کر آئینے میں دیکھتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔
"منکوحہ ہے وہ عون بھائی کی۔ جیسے بیوی بھی کہہ سکتی ہو تم۔" نیلم اس سے دو سال چھوٹی تھی مگر دونوں یوں لڑتی جھگڑتی تھیں جیسے ہم عمر ہوں۔ یوں بھی ارم کی خود پسند طبیعت کی وجہ سے نیلم کی اس سے کم ہی بنتی تھی۔
اب بھی طنزاً" اسے یاد دہانی کرائی۔
"ہنہ۔۔۔ مگر وہ صرف مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یاد ہے نا تم سب کو۔۔۔" وہ بڑے غرور سے سر اٹھا کے بولی۔
وہ بہت خوب صورت نہ تھی مگر ہر تین ماہ بعد نیا ہیر اسٹائل ، ڈیزائنر کے کپڑے اور پارلر کے چکر اس کی دلکشی کو کسی حسینہ کی طرح برقرار رکھے ہوئے تھے۔
"خدا جانے کیا بات تھی اور ہمارے ہاں کس انداز میں پہنچی۔ تم اب اس چکر سے نکل آؤ۔" نیلم نے اسے آئینہ دکھایا۔
"چھ سال بعد مل رہے ہیں۔ تم دیکھنا! عون عباس میرے قدموں میں ڈھیر ہو جائے گا۔" ارم اترائی۔
"جی۔۔۔" نیلم کا دل بے زار ہوا۔ "اچھا سوچو گی تو ہی اچھا ہو گا اور ویسے بھی وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے آرہے ہیں محترمہ!"
"مجھے پکی خبر ملی ہے۔ ثانیہ اس شادی کے لیے بالکل بھی راضی نہیں ہے۔ عون کے انکار اور مجھ سے شادی کے اعلان نے اسے عون کی نظروں میں اس کی حقیقت اور حیثیت بتادی ہے۔"
وہ دوپٹے کو لہرا کر گھومی۔
نیلم کا سر چکرانے لگا۔
"پتا نہیں خوش فہمیوں کے کون سے پہاڑ کھڑے کر رکھے ہیں تم نے۔ بلکہ غلط فہمیوں کے۔ نیچے آؤ گی تو ہی حقیقت پتے گی تمہیں۔"
"حقیقت تو اب سارا زمانہ دیکھے گا۔" وہ کسی ان دیکھے منظر کا تصور کر کے گدگداہٹ محسوس کرتے ہوئے کھلکھلائی تھی۔
اسی وقت ڈور بیل بجی۔
"عون آگیا۔۔۔" وہ جوش سے بولی۔ نیلم اس کا مسرت سے گلابی پڑتا رنگ دیکھ کر رہ گئی۔ وہ دروازہ کھول کر ہوا کے جھونکے کی مانند باہر کو بھاگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"وہ سب ماضی کی باتیں تھیں۔ اب کون عون اور کہاں کا عون۔" عون نے آنے سے پہلے ثانیہ کو باور کرایا تھا۔
مگر جب کھٹاک سے گیٹ کھلا تو پھولی سانسوں اور گلابی پڑتی رنگت کے ساتھ وہ ارم فراست علی ہی تھی۔ جو صاف لگ رہا تھا کہ بھاگتے ہوئے دروازہ کھولنے آئی ہے۔
"السلام علیکم۔۔۔" اس کا انداز پر مسرت تھا۔ ثانیہ نے معنی خیز نظروں کے ساتھ عون کو دیکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا تو وہ خفیف سا منہ بنا کر جھکتے ہوئے سامان اٹھانے لگا۔

"آپ بیٹھیں۔ میں ملازم کو بلاتی ہوں۔"

"تو گیٹ کھولنے کو کوئی ملازم نہیں تھا؟" عون نے ثانیہ کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے سادگی سے پوچھا۔

"چوکیدار ہے نا۔ میں نے ہی اسے روکا تھا۔ اتنے سالوں کے بعد آنے والے مہمان کو تو خود ریسیو کرکے پروٹوکول دینا چاہیے نا۔" وہ پہلے سے زیادہ صاف گو ہو گئی تھی یا پھر منہ پھٹ۔

خوب صورت تناظر سے سجی روش کے دونوں اطراف سرسبز لان کو مسرت سے دیکھتی ثانیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"مہمان نہیں 'مہمانوں کو۔" عون نے سنجیدگی سے اسے ٹوکتے ہوئے ثانیہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"جی بالکل۔"

وہ لاپروائی سے کہہ کر ملازم کو سامان اٹھانے کا اشارہ کرنے لگی۔

اندر سب نے دونوں کا تپاک استقبال کیا۔ تایا جان اور فاران تو آفس میں تھے، جبکہ کاشان سے ملاقات ہو گئی۔ باقی نازیہ، نیلم اور تائی جان بھی بہت اچھے طریقے سے ملیں۔

"اوہو.... نازی سولی؟" عون نے امارت اور خوش شکل سی نازیہ کو دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں تو وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

عون کے بے تکلفانہ انداز پر ثانیہ نے گہری سانس بھر کے تائی جان کی طرف رخ موڑا جو اس سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

بیڈ روم کا اے سی جانے کب سے کام نہیں کر رہا تھا۔ انیکسی شاید زیادہ استعمال میں نہیں رہتی تھی۔ اسی لیے کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

ان حبس کے دنوں میں اسہانے یہی حل نکالا کہ دھوپ جانے کے بعد لاؤنج کا بیرونی دروازہ کھول دیتی۔ بیڈ روم کی کھڑکی کھول کر پنکھے چلا دیتی۔ نہانے کے بعد ابھی بھی وہ گرمی سے گھبرا کر کچن میں گئی اور ٹھنڈا انار جوس بنا کر ابھی لاؤنج تک پہنچی ہی تھی کہ لائٹ چلی گئی۔ یو پی ایس کا انتظام تو تھا نہیں البتہ جب کوٹھی کا جنریٹر آن ہوتا تو انیکسی کی لائٹ کی فراہمی شروع ہو جاتی، جبکہ کوٹھی میں یو پی ایس کی سہولت بھی موجود تھی۔ وہ تحمل سے وہیں کھڑی جنریٹر آن ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ جو اے سی چلانے کے لیے انہیں آن کرنا ہی پڑتا تھا۔

ایک، دو، تین۔

اس نے سیکنڈ گننے شروع کیے۔

اسی وقت اسے محسوس ہوا جیسے اس کی پنڈلی کو کسی نے چھوا ہو۔

وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ ٹھنڈا جوس اس کے کپڑوں پر چھلکا۔

اسی وقت ایک غراہٹ کی آواز آئی اور ایک زندہ وجود اس سے آ ٹکرایا۔ گرم اور نرم سا لمس۔

وہ زوردار آواز میں چیخی۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا اور وہ یوں ہی چیختے ہوئے باہر کی طرف بھاگی۔ اس کا دل مارے خوف کے جیسے پھٹنے کو تھا۔ گاڑی کا دروازہ لاک کرکے اندر بڑھتے معیز کے کانوں سے اس کے چیخنے کی آواز ٹکرائی تو وہ بے اختیار اسی جانب لپکا۔ کھلے بکھرے بال اور ایک شانے سے لٹکتا دوپٹا جو اس کے قدموں کے ساتھ گھسٹتا آ رہا تھا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟"

معیز نے پریشانی سے پوچھا تو وہ روتے ہوئے بے اختیار ہی جیسے سہارا پا کر اس کے شانے سے آلگی۔

"وہ۔۔۔ وہاں اندر۔۔۔ کوئی ہے۔ کوئی اندھیرے میں ٹکرایا تھا مجھ سے۔"

وہ خوف زدہ و سراسیمہ تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو معیز ہرگز اسے یوں قریب نہ آنے دیتا مگر اس وقت تو اس کی بات سن کر معیز کے اعصاب تن گئے تھے۔

"کوئی ملازم۔۔۔؟"

اس نے نرمی سے ایہا کو پیچھے کیا۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں۔"

جنریٹر آن ہو چکا تھا۔ ایکسی روشن تھی۔ وہ محتاط سا اندر داخل ہوا۔ لاؤنج میں پنکھا چل رہا تھا مگر وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ وہ بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ اسی وقت دو بلیاں ایک دوسرے کے پیچھے غراتے ہوئے باہر کی طرف بھاگیں تو وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔

اگلے روز نہ صرف معیز نے اے سی ٹھیک کرایا بلکہ یو پی ایس کا کنکشن بھی کروا دیا۔

"اب باہر کا دروازہ بند رکھنا۔"

وہ اسے جاتے ہوئے کہہ گیا تو ایہا اس سے نظر بھی نہیں ملا پائی۔ اپنی بے اختیاری وہ بھول نہیں پائی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اور بھئی۔ تمہاری شادی کب ہو رہی ہے؟"

تائی جان نے متجسس انداز میں عون سے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔ مگر اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ثانیہ نے بے اختیار کہا۔

"فی الحال تو نہیں۔ میں جاب کر رہی ہوں۔"

عون کو اس کا اس طرح بولنا اچھا نہیں لگا۔ مگر وہاں موجود ارم کے دل کو سکون ضرور ملا۔

یعنی خبر درست ہے۔ ثانیہ راضی نہیں رخصتی پر۔

"آئیں۔ آپ کو آپ کا کمرا دکھا دوں۔" ارم نے بطور خاص عون کو مخاطب کیا تھا۔

"ہاں بیٹا! سفر سے آئے ہو آرام کرلو۔ یہاں تو کل سے فنکشن اسٹارٹ ہو جائے گا۔"

تائی جان نے لگاوٹ سے کہا۔

"اور میں کا آرام۔۔۔" ثانیہ کے دل میں کلبلاہٹ ہوئی۔ اسے اپنا خیال آیا تھا۔

"چلو تائی۔۔۔!" عون نے اٹھتے ہوئے ثانیہ سے کہا تو اس کا دل سکون سے بھر گیا۔

"ہیں۔ تم دونوں کیا ایک ہی کمرے میں رہو گے؟"

تائی جان نے جس طرح تھوڑی پہ ہاتھ رکھ کے حیرت سے پوچھا' ثانیہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گئی۔ اپنے چہرے سے نکلنے والی تپش کی لپٹیں وہ اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی۔

اوپر سے تینوں بہنوں اور ان کی دو خالہ زاد کی ہنسی مگر عون کا انداز بہت سنجیدہ اور عام سا تھا۔

"ثانیہ بھی میرے ساتھ ہی سفر سے آئی ہے۔ اس کا کمرا بھی ارم نے ریڈی کروایا ہوگا۔ یہ بھی جا کے ریسٹ کرلے گی۔"

"ہوں۔۔۔ہاں بیٹا۔" تائی جان نے گڑبڑا کر بیٹیوں کی طرف دیکھا۔

"یہ میرے ساتھ روم شیئر کرلے گی۔ چلو ثانیہ تمہیں بھی کمرا دکھاتی ہوں۔"

ارم نے بڑی نزاکت سے جواب دیا تو ثانیہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا پڑا۔

اس کے دل کی کیفیت کو اس کے چہرے سے محسن عون ہی جان پایا تھا۔ ارم کے ساتھ ایک کمرے میں رہنا ثانیہ کے لیے جتنے صبر کا امتحان تھا۔

وہ گہری سانس بھرتا ان دونوں کے پیچھے چل پڑا۔

☆ ☆ ☆

وہ خوف زدہ تھی۔

بہت خوف زدہ۔ تب ہی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ ایمہا نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔

دروازے پر معیز احمد کھڑا تھا۔

وہ مسکرایا تو ایمہا کی مشام جاں معطر ہو گئی۔

"آج پھر ڈر گئی ہو۔۔۔؟"

اس کا انداز معنی خیز تھا۔ ایمہا شرما سی گئی اور واپس پلٹی۔

مگر اس کے دوپٹے کا کونا معیز کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہلکے سے جھٹکے سے رکی مگر مڑ کر نہیں دیکھا۔

"میرے ہوتے ہوئے کس بات کا ڈر۔۔۔؟" وہ اس کے بالکل قریب تھا۔

اتنا قریب۔۔۔ جتنا کہ دو دن پہلے۔۔۔

معیز کی سانسوں کی تپش اس نے اپنے رخساروں پر محسوس کی تو ہڑبڑا سی گئی۔

وہ جھٹکے سے اٹھی تو پسینے میں شرابور تھی۔

خواب۔۔۔ وہ کئی لمحوں تک بیٹھی بے یقینی سے غور کرتی رہی۔

اسی وقت دروازہ زور سے بجا اور اس کے بعد بیل بھی بجادی گئی۔

وہ تیزی سے اٹھ کر بھاگی۔ دروازے تک پہنچتے تک اس کا تنفس تیز تر ہو گیا تھا اور دوپٹا پیروں میں ایک طرف سے لٹک رہا تھا۔

اس کے ذہن میں وہ خواب تروتازہ تھا۔

اس نے لاک کھول کر جھجکتے ہوئے آہستہ سے ناب گھما کر دروازہ کھولا تو سامنے موجود شخصیت کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کی رنگت پل بھر میں زرد پڑ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عتیقہ ایوب

"زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے تم نے۔ بائیس سال گزر گئے تم جیسی عورت کے ساتھ نبھا کرتے ہوئے مگر ایک دن بھی سکون کا نہ گزرا۔"

تایا ابا کی غصے سے لرزتی زبان پر اس کے اندر کی جانب تیزی سے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ تائی امی ہمیشہ ہی ان کے زیرِ عتاب رہا کرتی تھیں۔ "یقیناً" آج بھی ان کی کسی چھوٹی سی غلطی پر تایا ابا نے بکھیڑا ڈال دیا ہوگا۔ اس نے سوچا اور باہر چل دی۔

چھوٹے تایا ابا کو اس نے ہمیشہ ایسے ہی دیکھا تھا

ناولٹ

بجنے' چلاتے اور اپنی بیوی بچوں پر رعب جھاڑتے ہوئے۔ نانی امی جو اس کی خالہ بھی تھیں 'ہمیشہ اللہ میاں کی گائے ہی بنی رہتیں۔ نانا ابا کا یہ رویہ صرف اپنے بیوی بچوں کے ساتھ تھا۔ باقی لوگوں کے ساتھ وہ بے حد شفیق اور نرم برتاؤ رکھنے والے انسان تھے۔ خاص طور پر اس کے ساتھ تو ان کا رویہ کچھ زیادہ ہی نرم تھا۔ وجہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ البتہ اپنی خالہ نانی کی حالت دیکھ کر وہ کڑھ کر رہ جاتی۔ اب بھی وہ ان سے یہی پوچھنے جارہی تھی کہ وہ اور اسریٰ بازار چلی جائیں؟ مگر نانا ابا کا غصہ دیکھ کر وہیں سے لوٹ آئی۔

"کیا ہوا۔ امی نے اجازت نہیں دی کیا؟" اسریٰ نے اس کے تاثرات جانچے۔ چہرے پہ موجود اداسی کو وہ بھی کرن ناکام ہوئی تھی۔

"نہیں وہ... وہ" اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"اوہ! یقیناً" امی اور ابو کی لڑائی ہو رہی ہوگی اور ابو امی پر برس رہے ہوں گے 'جس کی وجہ سے تمہاری ہمت ہی نہیں ہوتی ہوگی اندر جانے کی۔ ہے ناں؟" اسریٰ نے تلخ لہجے میں بالکل ٹھیک۔ اپنے باپ کی فطرت سے وہ بخوبی آگاہ تھی۔

"تو والی ڈیئر کزن فاطمہ! اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ تو روز کا تماشا ہے اور تم تو بالکل مت ڈرا کرو۔ تمہیں تو وہ ویسے بھی بہت پیار کرتے ہیں۔ نفرت تو بس انہیں ہمارے وجود سے ہے۔" اسریٰ نے کہا اور جھٹکے سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

اس کے لہجے کی تلخی اور طنز پر وہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔ نانا ابا کے رویے نے ان کے دونوں بچوں ریحان اور اسریٰ پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ دونوں کی شخصیت ادھوری رہ گئی تھی۔ ان کی سختی نے ریحان کو بے حد سنجیدہ اور اسریٰ کو بے حد خود سر بنا ڈالا تھا۔ وہ ایسے کیوں تھے؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں وہ اکثر ناکام ہو جاتی تھی لیکن خالہ کو دیکھ دیکھ کر اسے بہت رونا آتا۔ اپنی امی کی وفات کے بعد اس نے خالہ کی گود کو ہی

ٹھکانہ سمجھا تھا اور خالہ نے بھی اسے بہت پیار سے پالا تھا۔ ورنہ بابا کی تو جاب ایسی تھی کہ وہ ایک ماہ کسی شہر میں اور دوسرے ماہ کسی اور شہر میں ہوتے تھے۔ ایسے میں خالہ' بڑے نانا اور بڑی نانی نے ہی اسے پوری توجہ سے محبت سے اور پیار سے پالا تھا۔

"دو کپ چائے تو بنا دو فاطمہ! ایک دوست آیا ہے۔ ڈرائنگ روم میں بھجوا دینا۔" شہریار کی آواز پر وہ سوچوں کے سمندر سے باہر آئی اور کچن کی طرف چل دی۔ شہریار حسن اس کے بڑے نانا کا بیٹا تھا۔ بڑے نانا کے ہاں بھی دو ہی اولادیں تھیں۔ عمیر حسن اور شہریار حسن۔ عمیر حسن اپنی بیوی روبانہ اور بیٹے امجد کے ساتھ ایک خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔

اور شہریار حسن... تین سال پہلے جب اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا تب وہ سول انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اسی سال دادا ابو نے اس کا نکاح شہریار سے کروا دیا تھا۔

پھر دادا ابو کی تو وفات ہو گئی مگر یہ رشتہ اس کے لیے ایک پہیلی بن کر رہ گیا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اس نے شہریار کا جھکاؤ اپنی پھپھو کی بیٹی رانمہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کی پسند نہیں ہے اور نہ کبھی ہوگی۔ مگر سوائے چپ رہنے کے اس کے پاس کوئی دوسرا آسرا نہیں تھا۔

کبھی کبھی خالہ یعنی چھوٹی نانی امی کو دیکھ کر اسے خوف آتا کہ کہیں اس کی زندگی بھی تو ان کی طرح نہیں گزرے گی۔ زیادہ تو نہیں البتہ اتنا وہ بھی جانتی تھی کہ خالہ چھوٹے نانا کی پسند نہ تھیں۔

وہ بھی تو شہریار کی پسند نہ تھی۔

گو کہ شہریار نے کبھی اپنی ناپسندیدگی ظاہر نہیں کی تھی۔ وہ اب بھی ایک دوسرے سے اچھے کزنز کی طرح بات کرتے تھے بالکل دوستانہ ماحول میں۔ لیکن کب تک؟ اس نے اگر ناپسندیدگی ظاہر نہیں کی تھی تو پسندیدگی بھی کبھی ظاہر نہیں کی۔ فاطمہ نے کبھی اس کی آنکھوں میں اپنے لیے کوئی خاص رنگ نہیں دیکھے

تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بھی محتاط رہتی تھی۔ اگر شہریار نے کبھی ناپسندیدگی نہیں دکھائی تھی تو اس نے بھی اپنے جذبات سینت سینت کر رکھے تھے۔ شہریار حسن کے سامنے وہ بھی یونہی ظاہر کرتی کہ اسے اس کے رائٹر کے ساتھ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"فاطمہ! جلدی کرو۔" کوریڈور سے آتی آواز پر وہ ایک بار پھر اپنے حواسوں میں لوٹ آئی اور چائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"ایک تو فواد خان بھی نا۔ کیا ضرورت تھی ٹی وی میں آنے کی۔ تو می دنیا کو پاگل کر دیا ہے۔ ویسے اللہ میاں کو بھی چاہیے کہ کسی لڑکے کو اتنا پارا نہ بنائیں۔ بیچاری لڑکیوں کے دل تو ویسے ہی نازک ہوتے ہیں۔ ایک آدھ فواد خان جیسا نظر آجائے تو بس ساری کی ساری اس ایک دل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔" عزہ نے ایک ہی ٹھنڈی آہ بھر کر اسکرین پہ اپوارڈ لے کر مسکراتے ہوئے فواد خان کو دیکھا اور لمبی تقریر کر ڈالی۔ یہ اور بات کہ وہاں موجود اماں' ابا اور سارہ نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"ایک تو اس گھر میں سارے بدذوق بستے ہیں۔" عزہ نے ان کی لاتعلقی دیکھی اور کڑھ کر باہر آگئی۔ موسم بہت خوش گوار ہو رہا تھا۔ صحن میں آتے ہی اس نے دونوں بازو ہوا میں پھیلا کر تازہ ہوا اپنے اندر اتاری۔

ایک ہفتہ پہلے ہی اس کالونی میں شفٹ ہوئے

تھے۔ ابھی کسی سے کوئی خاص جان پہچان نہیں ہوئی تھی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکی۔

"ارے یہ کون آگیا۔" اس نے کہا اور گیٹ کی طرف بڑھی۔ گیٹ کھولتے ہی اسے جھٹکا لگا تھا۔ سامنے بیس اکیس سالہ لڑکی ہاتھ میں ڈونگا پکڑے کھڑی تھی۔ عزہ کو دیکھتے ہی وہ مسکرائی۔

"السلام علیکم! میرا نام فاطمہ ہے۔ ساتھ والے گھر سے آئی ہوں۔ آج حلیم بنا تھا سوچا نئے پڑوسیوں کو چکھا کے آؤں۔" فاطمہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

"وعلیکم السلام! آؤ اندر آجاؤ۔" اس نے اسے راستہ دیا۔ اندر سب ہی اس سے بہت اچھے طریقے سے ملے۔ کچھ ہی دیر میں وہ سارہ اور عزہ کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ دو منٹ میں سب کو اپنا بنانے والی۔ گھر واپس آتے ہوئے اس نے ان دونوں کو بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دی' جسے ان دونوں نے قبول کر لیا۔

☼ ☼ ☼

"انسان کا انسان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں انسانی اوصاف موجود ہوں۔ تکبر' فخر' غرور اور بڑائی' یہ انسانی نہیں رحمانی اوصاف ہیں' جو صرف خدائے بزرگ ذات کے لیے مخصوص ہیں۔ انسان کی انسانیت تو عاجزی' عفو و درگزر' نرم خوئی اور محبت میں پنہاں ہے تاکہ۔" ٹی وی پر شاید کوئی اسلامک چینل لگا تھا۔ بولنے والے کی آواز سے زیادہ الفاظ نے اسے متوجہ کیا تھا۔

اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ خالہ میر چھیلتے ہوئے بغور ٹی وی پر آنے والی نشریات سن رہی تھیں۔ خالہ کو بھلا کیا ضرورت تھی یہ سب سننے کی۔ وہ تو پہلے ہی سراپا عاجزی تھیں۔

اس نے چوری چوری خالہ کے تاثرات جانچے مگر وہاں ہمیشہ کا سکون تھا۔ صبر عظیم۔ یہ لفظ اکثر بڑی امی' خالہ کے لیے استعمال کیا کرتی تھیں اور کہتی

تھیں کہ صبر عظیم کا اجر بھی عظیم ہے' جو دینا انسانوں کے اختیار میں نہیں۔ شاید اسی لیے خالہ اپنی کسی خدمت' کسی صبر اور ریاضت کا تقاضا چھوٹے تایا سے نہیں کرتی تھیں۔

"فاطمہ! تمہارے فون میں میسج پیکج ہے؟" اسریٰ نے اندر آکر اسے خیالات کی دنیا سے باہر نکالا۔

شکر ہے اس گھر میں اسے مخاطب کر کے حال میں واپس لانے والے لوگ موجود تھے ورنہ تو وہ اپنی خود ساختہ سوچوں کے سمندر میں بیٹھے بیٹھے غرق ہو جاتی۔

"ہاں ہے۔ کیوں؟" اس نے چونک کر کہا۔ کچھ دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ اسریٰ بہت زیادہ فون استعمال کرنے لگی تھی۔

"ہاں وہ مجھے چاہیے۔ اپنی فرینڈ سے بات کرنی ہے۔ میرے سیل فون میں پیکیج ختم ہو گیا ہے اور بیلنس بھی نہیں ہے۔" اسریٰ نے جلدی جلدی کہا۔ خالہ نے مڑ کر ایک نظر بیٹی پر ڈالی اور دوبارہ کام کرنے لگیں۔ البتہ فاطمہ نے کچھ بھی کہے بنا فون اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ پتا نہیں کون سی دوست اسے اتنی عزیز ہو گئی تھی جس سے وہ سارا دن اور ساری ساری رات میسجز پہ باتیں کرتی رہتی تھی۔ فاطمہ کے مطابق تو کالج میں اس کی کوئی بھی ایسی دوست نہ تھی۔ وہ دوست بناتی ہی کہاں تھی۔ ایک دن دوستی کرتی اور اگلے دن لڑائی۔ البتہ فاطمہ کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ اس کا اپنا کوئی بہن بھائی نہیں تھا تو وہ باہر دوست بنا کر یہ کمی پوری کر لیتی۔

"کیا بات ہے۔ بہت چپ چپ ہو۔ طبیعت ٹھیک ہے۔" خالہ سے اس کی زیادہ خاموشی برداشت نہیں ہوئی تو انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

"جی ٹھیک ہے۔ بس ویسے ہی دل نہیں کر رہا بولنے کا اور بولوں بھی کس سے؟ اسریٰ بزی ہے' رومانہ بھابھی پتا نہیں میکے سے کب آئیں گی۔" اس نے منہ بسورا۔ وہ واقعی بور ہو گئی تھی۔

"پڑوس میں چلی جاؤ۔ تم کہہ رہی تھیں نا ان کی بیٹیوں سے تمہاری دوستی ہو گئی ہے؟" خالہ نے مشورہ دیا۔

"نہیں۔ پہ سوں گئی تھی۔ اب جب تک وہ ہمارے گھر نہیں آتیں۔ میں بھی نہیں جاؤں گی۔" اس نے جھٹ انکار کیا۔ وہ کیوں بلاوجہ ان کے سر پہ سوار ہو۔ خالہ نے کوئی جواب دیے بغیر ٹوکری اٹھائی اور کچن کی طرف چل دیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے آ گئی۔

"آپ اسریٰ سے بات کیوں نہیں کرتیں؟" اس نے صاف ستھرے شیلف پہ ہاتھ پھیرا اور پھر اس پہ چڑھ کر بیٹھ گئی۔ خالہ اب چھلکے ہوئے مٹر دھو رہی تھیں۔

"وہ مجھ سے بات نہیں کرتی۔" خالہ نے اس کے فقرے کی تصحیح کی۔ پچھلے دو ہفتوں سے دونوں ماں بیٹی میں بول چال بند تھی۔ باپ پر تو زور نہیں چلتا تھا چنانچہ دونوں بہن بھائی ماں پر ہی سارا غصہ نکالتے تھے۔

"مجھے پتا ہے۔ وہ نہیں کرتی تو آپ کر لیں۔ آپ ماں ہیں۔ آپ ہی بلا لیں اسے۔" اس نے کہا۔

"کہاں لکھا ہے کہ سارے امتحان ماں ہی دے۔" خالہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ نہ شوہر اپنا تھا نہ اولاد۔ شکوہ کرنے کی انہیں عادت نہ تھی لیکن فاطمہ جوان کی سگی بھانجی تھی اس کے سامنے کبھی کبھار وہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے رو پڑتیں۔ انسان جو تھیں۔ انسانوں کی بے وفائی پر رونا آ ہی جاتا تھا۔

"نہیں نہیں خالہ! میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ میں تو بس۔" وہ بے اختیار شرمندہ ہو گئی۔ انہیں دکھی کرنا تو مقصد نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی بڑی نانی وہیں آ نکلیں۔ خالہ نے رخ موڑ کر تیزی سے آنکھیں صاف کیں۔

"ارے فاطمہ بیٹا! ذرا اپنے تایا کا نمبر تو ملاؤ۔ مجھے تو ٹھیک سے نظر ہی نہیں آتا۔ کہا بھی تھا شہریار سے کہ چشمہ بنوا دے مگر اسے یاد ہی کہاں رہتا ہے۔" انہوں نے فون اسے تھمایا۔

"چشمے سے یاد آیا۔ مجھے بھی چشمہ لگوانا ہے۔ مجھے کالج میں وائٹ بورڈ دور سے نظر نہیں آتا۔ لگتا ہے میری بھی دور کی نظر کمزور ہے۔" اس نے آنکھیں جھپکائیں۔

"چلو جی۔ یہاں تو سارے ہی کمزور نظر والے ناظرین اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اگر مجھے اندازہ ہوتا کہ گھر سے ہی مریضوں کی اتنی تعداد نکل آئے گی تو میں انجینئر

کے بجائے آئی اسپیشلسٹ ہی بن جانا۔" شہریار نے
دروازے سے جھانکا، وہ نا جانے کب آگیا تھا۔
"اور تم؟" اس نے فاطمہ کو دیکھا جو شہادت پر فون
ہاتھ میں لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
"تمہیں رات کو چاند نظر آتا ہے؟" وہ بولا تو ایک
لمحے کے لیے وہ گڑبڑا سی گئی۔
"ہاں آتا ہے۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "چاند نظر
آجاتا ہے پھر بھی نظر کمزور ہے۔ اس سے زیادہ دور تم نے
فرشتے دیکھنے ہیں؟" وہ شرارت سے بولا تو نانی اور خالہ
کے ساتھ وہ بھی ہنس پڑی۔
"جن بھی تو روزانہ دیکھتی ہوں اتنے لمبے لمبے۔
فرشتے دیکھ لوں گی تو کیا ہو جائے گا۔" اس نے بھی
شہریار کے لمبے قد پر چوٹ کی۔ جواباً وہ اسے گھور کر رہ
گیا۔ مگر اس نے پروا کیے بنا بڑے بابا کا نمبر ملا کر تائی
کے حوالے کیا لیکن نمبر بند جا رہا تھا۔
"رائمہ نہیں آئی کافی دنوں سے۔" تائی نے آکر
فون رکھا اور شہریار سے پوچھا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔
رائمہ آفندی کے متعلق تمام معلومات اسی کے پاس
ہوا کرتی تھیں۔
"پتا نہیں کیوں نہیں آئی۔ آفس تو روز آتی ہے۔
فون پہ بات کرا دیتا ہوں۔ پھپھو کا حال احوال بھی جان
لیجیے گا۔" وہ اب جیب سے فون نکال رہا تھا۔ جبکہ وہ
بالکل غیر محسوس انداز میں وہاں سے کھسک گئی تھی۔
رائمہ آفندی ان کے خاندان کی ذہین ترین اور
خوبصورت لڑکی' چھا جانے والی شخصیت کی مالک۔
جہاں وہ ہوتی تھی۔ وہاں کسی اور کی دال نہیں گلتی
تھی۔ ایک کامیاب سول انجینئر۔ ایسے میں اگر شہریار کا
جھکاؤ اس کی طرف تھا بھی تو یہ ایک قدرتی بات تھی مگر
اس دل کا وہ کیا کرتی جو اس قدرتی بات کا منکر تھا اور کسی
معجزے' کسی انہونی کا منتظر رہتا تھا۔ اس معجزے کا جس
کے ظہور پذیر ہونے کے بعد رائمہ شہریار حسن کی
زندگی کے پردہ اسکرین سے نکل جاتی اور فاطمہ احمد
وارد ہو جاتی۔

"بھلا ایسے بھی ہو سکتا ہے؟" اس نے سر جھٹکا۔
کہاں فاطمہ احمد جیسی عام ذہن کی حامل بی ایس سی کی
اسٹوڈنٹ جس کا زیادہ وقت دوست بنانے میں گزرتا
تھا اور جو بے حد حساس ہونے کے ساتھ بے حد جذباتی
بھی تھی۔ اور کہاں رائمہ آفندی جیسی پراعتماد اور قابل
لڑکی جو ایک لمحہ بھی ضائع کرنا مناسب خیال نہیں کرتی
تھی۔
"مجھے پریکٹیکل لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔" بہت پہلے
کہا گیا شہریار کا فقرہ اس کے کانوں میں گونجا۔ سینے میں
اٹھتے درد کو دباتی وہ تیزی سے اندر آگئی تھی۔
"کاش امی آپ زندہ ہوتیں۔" دل سے بے آواز
شکوہ نکلا اور ساتھ ہی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں
لگ گئیں۔ بابا بھی تو بہت کم گھر آتے تھے۔ وہ کس کو
اپنا دکھ بتاتی۔
"تو کیا میں بھی امی کی طرح ایسے ہی گھٹ
گھٹ کے۔" اس نے ایک بار پھر سوچا اور ایک بار
پھر رو دی تھی۔

☆ ☆ ☆

"فاطمہ کی طرف چلیں۔" لائٹ گئی تو اس نے
سارہ کو کہا' جس پر سارہ نے زبردست گھوریوں
سے نوازا۔
"کیا ہے؟" اس کے یوں گھورنے پر وہ تلملائی۔
"کچھ نہیں۔" سارہ نے کہہ کر بے نیازی سے رخ
موڑ لیا۔ وہ کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی مگر کوئی
رسپانس نہ ملنے پر تین حرف سارا اور اس کی کتابوں پر
بھیج کر باہر آگئی۔
"امی میں فاطمہ کی طرف جا رہی ہوں۔" صحن میں
کھڑے ہو کر اس نے با آواز بلند کچن میں کام کرتی امی
کو اپنی نئی مہم سے مطلع کیا اور باہر نکل گئی۔ دو ہی منٹ
بعد وہ کالے گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ سرمئی اور سفید
ٹائلوں سے مزین شاندار عمارت اس کے سامنے تھی۔
اس نے بیل دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر پھر روک

لیا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ ویسے ہی بے دھڑک اندر داخل ہوگئی لیکن اندر داخل ہوتے ہی ساکت ہوگئی تھی۔ سامنے کھڑا شخص اس کے حواس مختل کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ وہی تھا۔ وہ لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ مارے حیرت کے اس کا پورا منہ کھل گیا تھا۔ البتہ لان میں پائپ لگا کر پودوں کو پانی دیتے اس شخص پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے تو اب تک عزہ طاہر کو دیکھا بھی نہیں تھا۔

اپنی بصارت پر یقین کرنے کے لیے وہ تھوڑا آگے بڑھی اور ساتھ ہی دھڑام سے نیچے گری۔ گیراج کی پھسلنی سطح پر کھڑے پانی سے اس کا پیر پھسل گیا تھا۔ دھپ کی آواز پر لان میں کھڑا شخص بھی زور سے اچھلا اور مڑا۔ پھر تیزی سے اس کے پاس آیا۔ جبکہ وہ گرنے کے بعد فوراً" کھڑی ہوگئی تھی۔ آدھے سے زیادہ کپڑے خراب ہوگئے تھے۔ خفت شرمندگی اور ذلت سے وہ ہونٹ چبائے تھی۔

"آپ سے کس نے کہہ دیا تھا کہ یہ سلائیڈ ہے اور یہاں مزے سے سلپ کریں گی تو کچھ نہیں ہوگا۔" وہ اس کے حلیے کو دیکھ کر بولا۔

اف خدایا! آواز بھی وہی تھی۔ وہ واقعی فواد خان تھا یا نظر کا دھوکا۔ کیا انجانے میں وہ فواد خان کے گھر آگئی تھی؟ کیا یہ فاطمہ فواد خان کی بہن لگتی ہو۔ اس نے پل بھر میں ہزاروں باتیں سوچ ڈالی تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ یہ سب سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں پوری کھل گئی تھیں اور وہ عجیب مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

"آپ پاگل خانے سے تو نہیں بھاگ کے آئیں۔" سامنے والے نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔ یوں جیسے اسے پورا یقین ہو کہ وہ وہیں سے آئی ہے۔ البتہ اس کے سوال پر وہ گڑبڑا گئی تھی۔

"نن نہیں میں میں تو..." الفاظ کھونے لگے تھے۔ سامنے کھڑا فواد خان اور اس کی آنکھیں اف...

"ارے ارے تھمیے۔ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھ گیا' آپ کون ہیں؟" اب کے وہ شرارت سے مسکرایا۔ دائیں گال میں ایک لمحے کے لیے گڑھا سا ابھرا اور مسکراہٹ کے ساتھ ہی غائب ہوگیا۔ وہ ایک بار پھر مسحور ہوچکی تھی مگر اگلے ہی لمحے گڑبڑا گئی۔

"ک ک۔ کون ہوں میں؟"

"آپ فاطمہ کی کوئی نئی دوست ہیں۔ ہے ناں؟" اندازہ لگایا گیا۔

"جی۔ جی ہاں۔" اندازہ درست ہوا تھا لیکن پرجوش وہ ہوگئی تھی۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" اب کے اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر پوچھا۔ اگر قدرت نے فواد خان سے بات کرنے کا موقع دے ہی دیا تھا تو گنوائے کیوں۔

"آپ کی حرکتوں سے" برجستہ جواب آیا تھا۔

"جی؟؟؟" اس کے منہ سے لمبا سا جی نکل گیا۔

"جی" شہریار نے سر ہلا کر کہا۔

"دراصل فاطمہ کی ساری دوستیں ایسی ہیں۔ الٹی سیدھی حرکتیں کرنے والی۔ کبھی کوئی آتی ہے تو ہمارا گملا توڑ جاتی ہے کبھی کوئی آتی ہے تو ہمارے لان کے پھول توڑ کر لے جاتی ہے اور آپ نے تو ماشاء اللہ گر کر ہمارا گیراج کا فرش ہی توڑ دیا۔ وہ دیکھیں ٹائلز بھی اکھڑ گئی ہیں وہاں سے اور..."

اس نے بے ساختہ اس طرف دیکھا' جہاں وہ کچھ دیر قبل پھسل کر گری تھی۔ اس نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

"سوری' مذاق کر رہا تھا۔ فاطمہ اندر ہے" وہ تیزی سے اندر بڑھی مگر پھر مڑی۔

"آپ... آپ فواد خان ہیں؟" اس نے پوچھ ہی لیا۔

"نہیں... وہ کون ہے؟ میں شہریار حسن ہوں۔" اس نے آنکھیں سکیڑیں۔ اور وہ بغیر کچھ کہے اندر بڑھ گئی۔ "حیرت ہے اتنی مشابہت۔" وہ سوچتی گئی۔

ڈرائنگ روم میں اسے فاطمہ مل گئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی۔ فاطمہ اور اس کے گھر والے اسے بہت

اچھے لگے۔ خاص طور پر فاطمہ کی خالہ۔ البتہ فاطمہ کی کزن اسریٰ اسے تھوڑی مغرور لگی تھی۔ لطف ہی نہیں رہا تھا اس سے۔ شہریار حسن فاطمہ کا کیا لگتا ہے۔ وہ چاہ کر بھی نہ پوچھ سکی۔

واپسی پر فاطمہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ اس نے چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔

وہ گھر آگئی۔ مگر گھر آکر بھی بے چین روح کی طرح ادھر ادھر پھرتی رہی۔ سارہ بغور اس کی حرکات دیکھ رہی تھی۔ آج تو محترمہ نے ٹی وی بھی نہیں چلایا تھا۔ یقیناً کچھ ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھ لیا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے صاف جواب دیا۔ ابھی وہ اپنی یہ کیفیت کسی سے بھی شیئر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دل تو کہیں اور ہی رہ گیا تھا۔ خالی وجود لیے گھر آئی تھی۔ ذہن کے بند کواڑوں پر چمکتی شرارتی آنکھیں پوری قوت سے دستک دے رہی تھیں اور وہ ہار رہی تھی۔

"شہریار حسن" اس نے آہستہ سے کہا اور پھر مسکرا دی۔ اس لمحے تو فواد خان بھی یاد نہیں تھا۔ یاد تھیں تو وہ شرارتی بولتی آنکھیں۔

* * *

"یہ فواد خان کون ہے؟" رات کے نو بجے وہ اور اسریٰ ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ جب اس نے اندر آکر پوچھا۔

"تمہارا بھائی۔" جواب اسریٰ نے دیا۔

"کیا؟" شہریار کو اچنبھا ہوا۔

"ہاں قسم سے بہت شکل ملتی ہے اس کی تم سے۔ ویسے ایکٹر ہے ایک۔ حیرت ہے تم نے نہیں دیکھا۔" اسریٰ حیرت سے بولی۔ البتہ فاطمہ لاتعلق سی پوری طرح ڈرامے میں مگن تھی۔

"نہیں میں نے نہیں دیکھا۔ میں بے حد بزنس مین بندہ ہوں میڈم۔ اتنا ٹائم ہی کہاں ہوتا ہے یہ سب دیکھنے کا۔ یہ تو فارغ لوگوں کا کام ہے۔" اس نے ان پر چوٹ کی اور اندر چلا گیا۔ تب ہی فاطمہ کے فون کی بیل بج اٹھی۔ اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا۔

"ہیلو" فاطمہ نے کہا۔

"کون اسریٰ؟" دوسری طرف سے مردانہ آواز سن کر وہ زور سے اچھلی۔ آواز شہریار بھائی کی نہیں تھی۔ پھر کون؟

"آپ کون؟" اس نے رزیدہ نگاہوں سے ڈرامے میں مگن اسریٰ کو دیکھ کر دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"ارے اتنی جلدی بھول گئیں۔ ابھی تو محبت کا آغاز ہے جان اور آپ بھول بھی گئیں۔ ادھر ہم پاگل ہو چکے ہیں۔ یار دوست بھی چھیڑنے لگے ہیں کہ حمزہ خان کو عشق ہو گیا ہے اور آپ ہیں کہ ہمیں بھول ہی گئیں۔" بھرپور مردانہ آواز اور اس قدر کھلے الفاظ۔ وہ سرخ ہو گئی تھی۔ مارے گھبراہٹ کے اس نے فون ہی بند کر دیا۔ ہتھیلیاں تر ہو گئی تھیں پسینے سے۔

کچھ لمحے وہ اپنے تپتے چہرے کو نارمل کرتی رہی پھر صوفے پر نیم دراز لیٹی اسریٰ کو بغور دیکھا۔ کچھ دنوں سے اس کا بے حد موبائل استعمال کرنا پھر فاطمہ سے موبائل مانگنا۔ کیا وہ واقعی کسی لڑکے میں انوالو ہو چکی تھی۔ فاطمہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی پھر اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔

"اسریٰ!" اس نے پکارا۔

"ہوں!" جواب بے توجہی سے دیا گیا تھا۔ اس کی نگاہیں اسکرین پر جمی تھیں۔

"یہ حمزہ خان کون ہے؟" اس نے ڈائریکٹ کہا۔ ریموٹ اسریٰ کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔

فق ہوتے چہرے کے ساتھ وہ فاطمہ کو دیکھ رہی تھی اور اس کا پیلا پڑتا رنگ دیکھ کر فاطمہ نے بے اختیار اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہو چکے تھے۔ کچھ لمحے ایک معنی خیز خاموشی کی نذر ہو گئے تھے۔

"کیوں کیا تم نے ایسا کون ہے وہ لڑکا بتاؤ۔" فاطمہ نے اسے ہلایا۔

"وہ صباح کا بھائی ہے۔ اس نے مجھے کالج سے نکلتے ہوئے ایک بار دیکھ لیا پھر پیچھے پڑ گیا۔ یقین کرو فاطمہ میں نے اسے بہت اگنور کیا مگر پھر میں ہار گئی۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ بہت پیار کرتا ہے مجھ سے۔" اسریٰ بولی۔

"نہیں ہے وہ اچھا لڑکا۔ بے ہودہ ہے۔ پھنسا رہا ہے تمہیں بیوقوف بنا رہا ہے۔" فاطمہ چیخ اٹھی۔

"نہیں فاطمہ نہیں۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں اسے۔ پلیز مجھے منع مت کرنا اس سے بات کرنے سے... پہلی بار، پہلی بار زندگی میں اپنے ہونے کا احساس ہوا ہے مجھے... پہلی بار لگا ہے کہ میں بھی اہم ہوں پہلی بار۔" کہتے کہتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

اس نے کبھی اسریٰ کو یوں روتے نہیں دیکھا تھا۔ اب دیکھا تو تڑپ اٹھی تھی۔ اس نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس وقت اس میں واقعی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اسے روک سکے۔

☼ ☼ ☼

"اسریٰ کہاں ہے؟" شہریار کی آواز پر وہ زور سے اچھلی اور مڑ کر دیکھا۔ سامنے ہی گاڑی کی چابی ہاتھ میں پکڑے شہریار کھڑا تھا۔ فاطمہ کی تو گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ کالج کی چھٹی ہو چکی تھی اور وہ گیٹ کے باہر رکشے کا انتظار کر رہی تھی مگر رکشے کی جگہ شہریار؟

"کیا ہوا؟" وہ اس کا پیلا پڑتا چہرہ دیکھ چکا تھا۔

"رکشا نہیں آیا؟" اس نے بمشکل حواس سنبھالے۔

"نہیں اس نے گھر فون کر دیا تھا کہ وہ آج نہیں آئے گا۔ اب تفتیش ختم ہو گئی ہے تو اسریٰ کو بلاؤ جلدی۔ ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔" وہ اپنی کھڑی ناک پڑھا کر بولا۔

"اسریٰ نہیں ہے۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا پھر ساتھ ہی اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ "کیا مطلب نہیں ہے۔" وہ چونکا۔

"وہ، وہ میرا مطلب ہے اس نے ابھی نہیں جانا۔ اس نے اور اس کی دوست نے کچھ نوٹس بنانے ہیں۔ وہ لیٹ آئے گی۔ کہہ رہی تھی خود ہی آ جائے گی۔" ایک ہی سانس میں اس نے اسریٰ کی رٹوائی کہانی طوطے کی طرح بول دی۔ شہریار نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا مگر کچھ کہے بنا آگے چل دیا۔ وہ بھی جلدی سے جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

حمزہ خان سے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ دو تین روز پہلے ہی شروع ہوا تھا۔ فاطمہ کے لاکھ سمجھانے کا بھی اس پہ کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔

اپنی گھریلو تلخیوں سے نکل کر وہ جس نئی دنیا کو اپنی منزل سمجھ رہی تھی وہ منزل تو رستے کی دھول تھی لیکن فاطمہ بے بس تھی۔

آج کل اسریٰ اتنی خوش رہتی تھی۔ اتنے رنگ اس کے چہرے پر بکھرے رہتے کہ وہ چاہ کر بھی اسے سختی سے منع نہ کر پاتی۔

"آ جاؤ اندر تم بھی۔ رائمہ سے کام ہے تھوڑا۔ پھپھو سے بھی مل لینا۔" شہریار کی آواز پر وہ ہوش میں آئی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ گاڑی پھپھو کی کوٹھی کے آگے رکی تھی۔ وہ بنا کچھ کہے اتر آئی۔ اندر جاتے ہی شہریار رائمہ کے ساتھ مصروف ہو گیا تھا۔ پھپھو سے دعا سلام کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھی تھی۔

پھپھو کچھ دیر اس کے پاس بیٹھیں پھر وہ بھی اٹھ کر شہریار اور رائمہ کے پاس چلی گئیں۔ ان کے قہقہوں کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ اسے یک دم ہی وحشت ہونے لگی تھی ہر چیز سے۔

یوں جیسے یہاں اسے کوئی نہ جانتا ہو، وہ سب کے لیے اجنبی ہو۔ اجنبیوں میں اجنبیوں کی طرح ہونا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا اپنوں میں اجنبی ہونا۔ اس اذیت کا اندازہ پہلی بار ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت شہریار باہر آ گیا اور پیچھے ہی مسکراتی ہوئی رائمہ۔

"چلیں۔" اس نے فاطمہ سے پوچھا۔ پوچھ تو یوں رہا تھا جیسے وہ بہت انجوائے کر رہی ہو یہاں۔ مگر جیسے

بولے بنا اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا اور آگئی۔

"آئس کریم کھاؤ گی؟" واپسی پر شہریار نے اسے آفر کی۔ اس کا موڈ بہت خوش گوار تھا یقیناً "رائمہ" کی وجہ سے۔

"نہیں" اس نے سنجیدگی سے کہہ کر رخ موڑ لیا۔ شہریار نے حیرت سے دیکھا کندھے اچکائے اور گاڑی چلا دی۔

☼ ☼ ☼

گھر پہنچتے ہی سب نے اسریٰ کے بارے میں پوچھا۔ شکر ہے شہریار اسے گیٹ پر ہی اتار گیا تھا۔ اس لیے اس نے تسلی سے جھوٹ بولا' ورنہ شہریار کی موجودگی میں یہ کام بہت مشکل ہو جاتا۔

گھر میں اچھی خاصی رونق تھی۔ روبانہ بھابھی اور اسجد واپس آگئے تھے۔ عمیر اور ریحان بھی دوبئی کے ٹور سے لوٹ آئے تھے۔ بس اس کے بابا ہی نہیں آئے تھے۔ کاش وہ اسسٹنٹ کمشنر نہ ہوتے تو وہ انہیں کبھی خود سے دور نہ جانے دیتی۔

"بھئی فاطمہ! ہم ریحان کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں۔ تم بتاؤ' تمہاری نظر میں کوئی ہے؟" روبانہ بھابھی نے اسے اندر آتے دیکھ کر کہا تو وہ چونکی۔

"کیا واقعی؟" اسے خوش گوار حیرت ہو رہی تھی۔

"ہاں ہاں واقعی۔ تم بتاؤ بیٹا۔" چھوٹے تایا نے کہا۔ اپنے بچوں کے علاوہ وہ سب سے ہی نرمی سے بات کرتے تھے۔

"یہ ساتھ والوں کی لڑکی دیکھی آپ نے؟ عزہ نام ہے اس کا۔ خالہ اور بڑی تائی تو ملی ہیں اس سے وہ کیسی رہے گی؟" اس نے فوراً ہی لڑکی ڈھونڈ دی تھی۔

"چلو جی مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ اگر وہ لڑکی اچھی ہے تو پھر بات چلاؤ وہاں۔ کیوں بھابھی!" بڑے تایا نے اب خالہ سے پوچھا۔

"جی جی بھائی صاحب ضرور۔۔۔ ہم کل ہی رشتہ لے کر جائیں گے ان کے ہاں۔" خالہ نے کہا اور روبانہ اور فاطمہ نے بھی تائیدی انداز میں زور سے سر ہلایا۔

☼ ☼ ☼

"ریحان بھائی چائے۔" اس نے پیچھے سے پکارا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ بالکنی میں کھڑے ہو کر سگریٹ پینا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور ساتھ میں فاطمہ کے ہاتھ کی بنی چائے بھی ہو جائے تو کیا بات تھی۔ اس نے مڑ کر کپ تھاما اور دوبارہ پہلے والی پوزیشن میں چلا گیا۔

"کل ہم آپ کا رشتہ لے کر جا رہے ہیں ساتھ والوں کے ہاں۔ عزہ نام ہے اس کا۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اگر آپ نے دیکھنی ہے تو دکھاؤں۔" وہ پرجوش سی ہو کر بولی۔ ریحان البتہ ہمیشہ کی طرح خاموش کھڑا رہا۔

"ریحان بھائی! دکھاؤں؟" فاطمہ نے اس کا شانہ ہلایا۔

"نہیں۔۔۔ تمہیں پسند ہے تو بس ٹھیک ہے۔" اس نے مڑ کر فاطمہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ خوشی سے فاطمہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کتنا پیار کرتے تھے سب اس سے۔ خالہ' بڑے تایا' بڑی تائی اور چھوٹے تایا بھی۔ ریحان' اسریٰ سب۔ آپس میں بے شک اختلاف تھے۔ مگر فاطمہ کے لیے سب ایک ٹھنڈی چھاؤں کی طرح تھے۔

تب ہی شہریار وہاں چلا آیا۔

"مبارک ہو یار۔۔۔ خیر سے ایک عدد بے وقوف کا ہمارے گھر میں اضافہ متوقع ہے۔" اس نے شرارت سے فاطمہ کو دیکھ کر ریحان کو چھیڑا۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ البتہ فاطمہ تپ گئی تھی۔

"میری دوست بے وقوف نہیں ہے' اچھا۔" وہ خفا لہجے میں بولی۔

"اچھا۔۔۔ا۔۔۔ا۔" شہریار نے اچھا کو کافی لمبا کھینچ دیا تھا۔ وہ پیر پٹخ کر وہاں سے آگئی۔

کمرے میں آئی تو اسریٰ سوتی ہوئی ملی۔ جب سے وہ کالج سے آئی تھی۔ کمرے میں بند تھی اور فاطمہ جو ارادہ کر رہی تھی کہ اسے بتائے گی کہ آج شہریار لینے

آیا تھا۔ مایوس سی ہو کر لیٹ گئی۔ پتا نہیں وہ کب عزہ خان کے بھنور سے نکلے گی۔

صبح اس کے لاکھ اٹھانے پر بھی اسریٰ نہیں اٹھی تھی۔ اسے تو شاید علم بھی نہیں تھا کہ اس کے سگے بھائی کا رشتہ لے کر جا رہی تھیں وہ۔ اس نے تو کمبل ہی منہ سے نہیں اتارا تھا۔ فاطمہ مایوس سی باہر آگئی۔

پھر خالہ، بڑی تائی، وہ اور رومانہ بھابھی چاروں عزہ کے ہاں چلی گئیں۔ وہاں ان کا زبردست استقبال کیا گیا تھا۔

عزہ کی امی انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ وہ اور رومانہ بھابھی اٹھ کر عزہ اور سارہ کے ساتھ اندر آگئیں، تاکہ خالہ اور تائی کھل کر عزہ کی امی سے بات کر سکیں۔

"ہم تمہارا ہاتھ مانگنے آئی ہیں میڈم!" فاطمہ نے اندر جاتے ہی اسے چھیڑا تو عزہ کے ساتھ ساتھ سارہ بھی اچھل پڑی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی عزہ نے سارہ کو شہریار کے بارے میں بتایا تھا اور نیرس پہ کھڑے ہو کر دکھایا بھی تھا اور حیرت انگیز طور پر سارہ کو پسند بھی آیا تھا۔

"واہ! اتنی جلدی اس نے گھر والوں کو رشتہ دے کر بھی بھیج دیا تھا، کمال ہے۔" عزہ نے شرما کر گردن جھکائی البتہ سارہ مسکرا دی۔

"ارے بھئی! لڑکے کے بارے میں تو بتاؤ کچھ۔" سارہ نے عزہ کے چہرے پر بکھرے رنگ دیکھ کر خوش ہو کر پوچھا۔ البتہ رومانہ اور فاطمہ، عزہ کا شرمیلا انداز دیکھ کر مطمئن ہوئی تھیں۔

"لڑکا۔ عمر انتیس سال، کامیاب بزنس مین، نام ریحان سکندر، ولد سکندر حیات برادر شریف آف اسریٰ سکندر۔"

فاطمہ شرارت سے بول رہی تھی اور عزہ اور سارہ پر گویا بم پھٹا تھا۔ "ریحان سکندر۔"

"ہاں جی... جیسے ہی ریحان کا رشتہ طے ہوا۔ ہم شہریار اور ریحان کی اکٹھے ہی کریں گے شادی۔" رومانہ بھابھی بتا رہی تھیں اور ان دونوں کی حالت ایسے

تھی گویا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ تب ہی خالہ کے بلانے پر فاطمہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

"شہریار صاحب کا بھی ہو گیا ہے رشتہ؟" سارہ نے ہمت کر کے پوچھا۔ اس سوال پر عزہ نے بھی گردن اٹھائی تھی۔

"ارے رشتہ؟ نکاح ہوا ہے اس کا تو تین سال پہلے فاطمہ کے ساتھ۔ بتایا نہیں فاطمہ نے تم لوگوں کو۔" انہوں نے حیرت سے کہا۔ جان وجود سے کیسے نکلتی ہے۔ آج سے پہلے عزہ کو اندازہ نہیں تھا۔ سارہ بھی پریشانی سے بھابھی کی شکل تکے جا رہی تھی۔

"بھابھی! باہر آئیں۔" فاطمہ کی آواز پر وہ بھی اٹھ کر باہر آگئیں۔ ان کے جاتے ہی عزہ بے جان سی ہو کر بیڈ پر گر گئی تھی۔

"عزہ! ہوش کرو۔ پاگل مت بنو۔" سارہ تڑپ کر اس کے پاس آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ سارہ کے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ پہلا خواب ٹوٹا بھی ایسے تھا کہ جڑنا ہی ناممکن، رشتہ ہی نہیں نکاح بھی ہو چکا تھا۔ ایک مضبوط بندھن میں بندھ چکا تھا وہ بھی تین سال پہلے۔

☆ ☆ ☆

واپسی پہ وہ چاروں مطمئن تھیں۔ عزہ کے گھر والوں نے سوچنے کا وقت مانگا تھا مگر عزہ کی امی کی خوشی دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ دل و جان سے راضی ہیں۔ رسماً وقت مانگا تھا۔ گھر آتے ہی اس نے اسریٰ کو ڈھونڈا۔ وہ باہر نہیں تھی۔

تو کیا وہ اب تک کمرے میں تھی؟ اسے بے اختیار تشویش ہوئی۔ کیا ہو گیا ہے اسے؟ وہ سوچتی ہوئی کمرے میں آئی۔ وہ ابھی تک کمبل میں تھی۔ فاطمہ نے کچھ بولے بنا اس کے منہ سے کمبل کھینچا۔ پھر ساکت ہو گئی۔

رو رو کر سرخ ہوا چہرہ اور آنکھیں اس کے سامنے تھیں۔ اسریٰ نے اسے دیکھتے ہی بازو چہرے پر رکھ لیا۔

"اسریٰ..." اس نے تڑپ کر اس کا بازو اس کے

منہ سے ہٹایا۔ اسریٰ نے سختی سے آنکھیں میچ لی تھیں۔ کچھ غلط ہونے کا احساس پوری شدت سے اس کے ذہن کو جلا گیا۔

"اسریٰ کیا ہوا ہے بتاؤ مجھے۔" وہ اس کے پاس بیٹھی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کا وجود دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔

"فاطمہ وہ... وہ حمزہ خان... وہ... وہ..." کہتے کہتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

"ہاں... ہاں... کیا ہوا؟ اسے بتاؤ۔ تم گئی تھیں نا کل اس سے ملنے۔"

اس نے دونوں ہاتھوں میں اس کے ہاتھ دبا کر کہا۔

"وہ بہت بڑا بلیک میلر ہے فاطمہ... چیٹ کیا اس نے مجھے... میری تصویریں بنائیں اور انہیں نہایت بے ہودہ بنا دیا... میرا یقین کرو فاطمہ وہ میری تصویریں نہیں ہیں۔ صرف چہرہ میرا ہے۔ وہ بے ہودہ لباس میں نے نہیں پہنا... میں نے نہیں پہنا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔

اور فاطمہ کا حال تو ایسے تھا جیسے آسمان اس کے سر پر آگرا ہو۔ ہر چیز سامنے سائیں سائیں کر رہی تھی۔

"وہ کہتا ہے کہ میں اس کی ڈیمانڈز پوری کروں۔ میں نے ایسا نہ کیا تو وہ تصویریں بابا کو بھیج دے گا اور بابا... وہ تو مجھے زندہ زمین میں دفن کر دیں گے۔"

وہ اب ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

"اوہ... میرے خدایا اب کیا ہوگا۔" فاطمہ کے منہ سے آہ نکل گئی۔ کتنا سمجھایا تھا اسریٰ کو مگر وہ مانتی ہی کہاں تھی۔ دل چاہا تھا اسے یاد کرائے' اس کی کوتاہیاں... مگر اس کی حالت دیکھ کر ہونٹ بھینچ گئی۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ تم پریشان نہ ہو۔ ہم شہریار یا ریحان بھائی کو سب کچھ بتا دیتے ہیں۔ وہ سنبھال لیں گے۔" فاطمہ نے کچھ سوچ کر اسے تسلی دی۔

"نہیں نہیں۔" اسریٰ چیخی۔ "تم کسی کو نہیں بتاؤ گی میں..." اسریٰ نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔

"تم فکر مت کرو میں تمہارا نام نہیں آنے دوں گی۔ میں خود جاؤں گی شہریار کو اور میں اسے صرف یہ کہوں گی کہ مصباح کے پاس تمہاری تصویریں تھیں لنکشن کی۔ وہاں سے اس کے بھائی نے لے کر ایڈیٹنگ کر دی اور اب وہ بلیک میل کر رہا ہے۔" فاطمہ نے کہا تو اسریٰ نے تشکرانہ نظروں سے اسے دیکھا پھر اس سے لپٹ گئی۔

"تھینک یو فاطمہ... تھینک یو... بہت بری ہوں میں۔" وہ ایک بار پھر رو پڑی۔ فاطمہ چپ چاپ اس کا سر سہلاتی رہی۔

☆ ☆ ☆

اسریٰ کا جو حال تھا اسے بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔ وہ ہر صورت شہریار سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ اب تک نہیں آیا تھا۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ اوپر اس کے کمرے میں آ گئی۔ ارادہ تھا کہ وہیں اس کے کمرے میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرے گی۔

کچھ دیر وہ ٹہلتی رہی۔ پھر کمرے میں لگی اس کی تصویریں دیکھنے لگی۔ ہر تصویر میں اس کا الگ انداز تھا۔ اسے اور اس کی شخصیت کو دیکھ کر بس ایک ہی لفظ ذہن میں آتا تھا۔ شاندار بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی تصویر اس نے آہستگی سے اٹھائی اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ عام دنوں میں وہ اتنی محتاط رہتی تھی کہ اس کے کمرے کے پاس بھی نہ پھٹکتی تھی۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ شہریار کو اس کی حرکتوں سے کبھی یہ لگے کہ وہ اس کی توجہ چاہتی ہے۔ مگر آج... آج اسریٰ کی وجہ سے اسے بہانہ مل گیا تھا۔

وہ بغور اس کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ سفید شرٹ میں اس کا مضبوط کسرتی جسم اور بے تحاشا بولتی آنکھیں۔ فاطمہ کو لگا جیسے تصویر سے نکل کر ابھی وہ اس کی چوری پکڑ لے گا۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ نظریں دوبارہ تصویر پر گاڑ دیں۔

ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی کبھی اتنی فرصت سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہر بار نسوانی انا آڑے آ جاتی کہ جب وہ مخاطب نہیں کرتا تو میں خود اس کی توجہ کیوں مانگوں اور اب تصویر دیکھ دیکھ کر آنکھیں سیراب

ہو رہی تھیں۔

"کاش! انعم اتنے شان دار نہ ہوتے' عام سے ہوتے' لیکن میرے ہوتے' صرف میرے۔" دل سے آہ نکلی اور دل تو پہلے ہی اسریٰ کی وجہ سے آزردہ تھا۔ فوراً" رونے کی تمنا کرنے لگا۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی تصویر پر گر رہے تھے۔ اس نے روتے روتے ہچکی لگائی۔ محرومیوں کے معاملے میں وہ اور اسریٰ تقریباً" ایک ہی جیسی تھیں۔

وہ چپ چاپ روتی رہی۔ رات مزید گہری ہوتی گئی اور کچھ ہی دیر میں وہ اسی سمٹ کر کمرے میں' اسی کے بیڈ پر ٹیک لگائے' اسی کی تصویر سینے پر رکھے بے خبر سو رہی تھی۔ بے نیند بھی نا... سولی پر بھی آجاتی ہے۔ اسے بھی آگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

پورے گھر پر سناٹا طاری تھا۔ بلکہ پورے گھر کیا' پوری کالونی کا یہ عالم تھا۔ رات کے ایک بجے وہ گھر لوٹا تھا۔ گیٹ کی اضافی چابی اس کے پاس تھی۔ گیٹ لاک کرکے وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا کچن میں آیا۔ پانی کا ایک گلاس پی کر اس کے قدم اوپر کی طرف اٹھ گئے تھے۔

سائٹ پر ضرورت سے زیادہ دیر ہوگئی تھی۔ اس لیے وہ ڈنر بھی باہر ہی کرکے آیا تھا۔ اب تو صرف ایک بھرپور نیند لینے کی خواہش تھی۔ آنکھیں رگڑتا وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور پھر فوراً" ساکت ہوگیا۔

بیڈ پر آڑھا ترچھا لیٹا وجود محو خواب تھا۔ نظر کا دھوکا تھا یا حقیقت۔ اس نے دوبارہ آنکھیں ملیں' مگر وہ حقیقت تھی۔ سربان فاطمہ احمد سو رہی تھی۔

اس کے ہونٹ بے اختیار ہنسی کے انداز میں سکڑ گئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ اس کے قریب آیا اور قریب آتے ہی ایک جھٹکا اور لگا تھا۔ صاف ستھرے چہرے پر آنسوؤں کے مٹے مٹے سے نشانات اور سینے پر الٹی دھری وہ تصویر۔

وہ یقیناً" بہت دیر تک روتی رہی تھی اور وہ تصویر۔ اس کو سیدھا کرکے دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اسی کی تصویر ہے' مگر پھر بھی وہ خود کو باز نہیں رکھ پایا۔ اس کا شک درست تھا۔ وہ تصویر اسی کی ہی تھی۔ تصویر سے نظر ہٹا کر اس نے دوبارہ ایک نظر اس پر ڈالی۔ سرمئی دوپٹے کے ہالے میں چمکتی شفاف رنگت' پلکوں اور گالوں پر سنہرے آنسو' ایک لمحے کے لیے وہ اسے کوئی پاکیزہ حور لگی تھی۔ اس نے بے اختیار نظر چرائی۔

اس وقت اسے جگا کے وہ شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سوائے سی کا بٹن آن کرکے خود باہر آگیا۔ آج اسے ڈرائنگ روم کی گرمی میں ہی سونا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کوئی وجہ بتائی ہے اس نے انکار کی۔" طاہر صاحب نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔۔ کوئی وجہ نہیں۔۔ کہتی ہے جہاں مرضی شادی کردو' مگر ریحان کے ساتھ نہیں۔۔ اس لڑکی کا تو دماغ ہی خراب ہے۔ اچھا بھلا رشتہ ہے اور لڑکا اور گھرانا بھی اتنا اچھا' پھر فاطمہ سے اس کی دوستی بھی بہت ہے' مگر پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔ میں نے پوچھا کوئی پسند ہے' کہتی ہے نہیں۔" عزہ کی امی نے قدرے خفگی سے انہیں آگاہ کیا۔ بیوی کا جواب سن کر وہ کسی گہری سوچ میں گم ہوگئے تھے۔

"یہ سب میری دی ہوئی ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ اپنی من مانی کرنے دی ہے۔ ہمیشہ اس کے بڑی بیٹی ہونے کا لحاظ کیا۔۔ مگر اب میں اسے کوئی غلط فیصلہ نہیں کرنے دوں گا۔

ریحان بہت اچھا لڑکا ہے۔ آج عشاء کی نماز میں ملا ہوں میں اس سے اور میں کل ان لوگوں کو کہلوا رہا ہوں کہ ہمیں رشتہ منظور ہے۔ عزہ کو خبر کر دینا۔" انہوں نے مستحکم لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔ بیگم طاہر نے سر ہلا کر ان کے موقف کی تائید کی۔ وہ ان کے فیصلے سے خوش تھیں۔

☆ ☆ ☆

بے حد سردی کا احساس تھا، جس کے باعث اس کی آنکھ کھلی تھی۔ کچھ دیر وہ سکڑی سمٹی یوں ہی کسلمندی سے لیٹی رہی۔ پھر کمبل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چونک گئی۔

اسریٰ تو نہیں تھی وہاں۔ وہ ہمیشہ اسریٰ سے ہی کمبل کھینچا کرتی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور ادھر ادھر دیکھا۔ رات والی ساری بات یاد آئی۔ وہ شہریار کے کمرے میں ہی تھی اب تک۔ اوہ گاڈ۔

کیا وہ اب تک نہیں آیا؟ اس نے نظریں گھڑی پر جمائیں۔ جہاں گھڑی چار بجا رہی تھی۔ صبح صادق کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر بیڈ سے اتر گئی۔ اسے جلد از جلد اپنے کمرے میں واپس پہنچنا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو علم ہو کہ وہ رات شہریار کے کمرے میں تھی۔

صد شکر کہ شہریار رات گھر نہیں آیا۔ اگر وہ اسے یہاں دیکھ لیتا تو نجانے کیا سوچتا۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور اے سی کا بٹن آف کر کے باہر نکلنے ہی لگی تھی کہ ٹھٹک گئی۔

دل کسی انہونی کے احساس سے بری طرح دھڑکا۔ اس نے تو اے سی چلایا ہی نہیں تھا۔ وہ سونے تھوڑی آئی تھی۔ وہ تو اسریٰ کے لیے بات کرنے آئی تھی۔ پھر اے سی کس نے چلایا۔ کیا شہریار نے؟ مگر وہ تو گھر آیا ہی نہیں۔ آیا ہوتا تو مجھے جگاتا تو سہی۔ تیز ہوتی دھڑکن کے ساتھ وہ کمرے سے باہر نکل آئی اور سیڑھیاں اترنے لگی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ایک لمحے کے لیے اس کی دھڑکن "حقیقتاً" رک گئی۔ اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ شہریار حسن صوفے پر چت لیٹا تھا۔ آنکھوں پر بایاں بازو دھرا تھا۔ وہ گھر آ گیا تھا اور "یقیناً" اسے اپنے کمرے میں سوتے دیکھ کر ڈرائنگ روم میں لیٹ گیا تھا۔

مارے گھبراہٹ کے اس کی جان ہوا ہونے لگی۔

جانے کیا سوچا ہو گا اس نے اور۔۔۔ اور۔۔۔ شہریار کی تصویر بھی تھی میرے ہاتھ میں۔۔۔ اس نے بے اختیار ماتھے پر ہاتھ مارا اور پیلے پڑتے چہرے کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

کمرے میں جاتے ہی گہرے گہرے سانس لے کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اس نے ایک نظر سوئی ہوئی اسریٰ کے چہرے پر ڈالی۔ اس کا مسئلہ حل کرنے گئی تھی اور اپنا مسئلہ کھڑا کر آئی تھی۔ "یقیناً" اب وہ شہریار سے آنکھیں نہیں ملا سکتی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اب وہ مذاق اڑائے گا۔ اسے تو موقع ملنا چاہیے تھا۔ جو وہ چپ رہا تھا۔

نسوانی انا اور وقار ٹوٹا بھی تو کس کے سامنے۔ فجر کے لیے وضو کرتے ہوئے آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگ رہا تھا اور دل اتنی تیز دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔

★ ★ ★

"فاطمہ نہیں اٹھی اب تک؟" بھابھی نے ناشتا ٹیبل پر رکھتے ہوئے اسریٰ سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں خیریت؟ طبیعت ٹھیک ہے اس کی۔ وہ تو سویرے ہی اٹھ جاتی ہے۔" بھابھی نے عمیر بھائی کے آگے چائے رکھ کر دوبارہ اسریٰ سے پوچھا۔ ٹیبل پر موجود سب افراد کی آنکھوں میں یہی سوال تھا۔ سوائے شہریار کے۔

"جی ٹھیک ہے۔ ویسے ہی۔۔۔ وہ رات دیر تک پڑھتی رہی۔" اسریٰ نے جھوٹ بولا تو سب نے سر ہلا دیا۔ البتہ شہریار نے سر جھکا لیا۔ ایک دلچسپ اور شرارتی مسکراہٹ اس کے چہرے پر دوڑ گئی تھی۔

"کالج نہیں جانا اس نے۔" اب کے شہریار نے پوچھا تو اسریٰ گھبرا گئی۔

"نہیں! ہم فری ہو گئے ہیں کالج سے۔" اسریٰ نے کہا۔ "پتا نہیں کب اٹھے گی۔" رات دیر تک وہ اس کا انتظار کرتی رہی تھی کہ وہ واپس آئے تو اسے پوچھوں کہ شہریار سے کیا بات ہوئی۔ مگر پھر وہ سو گئی۔

جانے وہ کب واپس آئی تھی اور جانے کیا بات ہوئی

تھی شہریار سے۔ اس نے بغور چائے کے گھونٹ لیتے
اور ریحان سے بات کرتے شہریار کو دیکھا۔ وہاں ہمیشہ کا
سکون تھا۔ کچھ بھی ڈھونڈنے میں وہ ناکام رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اٹھو بھی پھپھو فاطمہ... اور کتنا سوؤ گی۔ ایک گڈ نیوز
لے کر آئی ہوں تمہارے لیے' اٹھو نا۔" اس نے اس
کے وجود کو جھنجوڑا۔

"کون سی گڈ نیوز؟" اس نے سر باہر نکالا۔

"حمزہ کے گھر والوں نے ہاں کردی ہے ریحان بھائی
کے لیے۔" اسریٰ مسکرائی۔ ایک سکون کا احساس
فاطمہ کے چہرے پہ بکھر گیا۔

"گڈ! مبارک ہو۔" اس نے کہہ کر دوبارہ کمبل منہ
پر لے لیا۔ اسریٰ نے منہ بنا کر اسے دیکھا اور ایک بار
پھر کمبل کھینچ لیا۔

"کیا مسئلہ ہے۔ چھپ کیوں رہی ہو؟" اسریٰ نے
ڈانٹا تو وہ اٹھ بیٹھی۔

"کیا بات ہوئی شیری سے۔" اس نے تجسس سے
پوچھا۔ فاطمہ گڑبڑا گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب
دیتی' اسریٰ کا فون بجنے لگا۔ نمبر دیکھتے ہی اسریٰ کا رنگ
خوف سے پیلا ہو گیا۔

"اُف... فاطمہ وہ حمزہ خان..." اس نے فون فاطمہ
کے سامنے کیا۔ مارے طیش کے فاطمہ کی رگیں
اکڑنے لگیں۔

سارے فساد کی جڑ یہ کمینہ تھا۔ اسی بے غیرت کے
پیچھے وہ شہریار کے پاس گئی تھی۔

ایک جھٹکے سے اس نے فون اسریٰ کے ہاتھ سے
پکڑا اور یس کرکے کان سے لگا لیا۔

"کیسی ہو اسریٰ جان؟" حمزہ خان کی خباثت سے
بھری آواز نے گویا اس کے پورے تن بدن میں آگ
لگا دی۔

"شٹ اپ... جسٹ شٹ اپ۔" وہ چیخی۔ غصہ
کسی پہ تو نکالنا ہی تھا۔ شہریار نہ سہی' حمزہ خان ہی
سہی۔ اسریٰ ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم کمینے انسان! تمہیں کیا لگا کہ پہلے اسریٰ کو اپنی
پیار بھری باتوں میں پھنسا لو گے اور پھر اسے بلیک میل
کرو گے تو وہ ہو جائے گی۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم
جیسے کمینے بہت دیکھے ہیں ہم نے اور جہاں تک بات
ہے ان تصویروں کی تو یاد رکھنا! اگر تم بلیک میل کرسکتے
ہو تو ہم بھی کم نہیں ہیں۔

تصویریں تو منہاج کی بھی ہیں ہمارے پاس۔
ایڈیٹنگ ہم بھی کرسکتے ہیں اور اگر ہم نے یہ کرلیا تو تم
بھی منہ دکھانے لائق بھی نہیں رہو گے۔

اب اگر ذرا سی بھی غیرت باقی ہے تو جا کے ڈوب
مرو اور آئندہ یہاں فون کیا تو خون کردوں گی تمہارا۔"
غصے میں جو اس کے منہ میں آ گیا وہ کہتی گئی۔ زندگی
میں وہ کبھی کسی پہ یوں نہیں چلائی تھی۔ اس نے حمزہ
خان کا جواب سنے بغیر کھٹاک سے فون بند کردیا۔ چہرہ
سرخ ہو گیا تھا۔ اسریٰ تحسین آمیز نگاہوں سے اسے
دیکھ رہی تھی۔

"کون ہے یہ حمزہ خان؟" چھوٹے تایا کی سرد اور
چبھتی ہوئی آواز پر وہ دونوں زور سے اچھلیں۔ جانے وہ
کب سے دروازے میں کھڑے ان کی باتیں سن رہے
تھے۔ اسریٰ کا رنگ زرد ہو گیا۔

جس کمینے سے وہ ڈر رہی تھی' وہ سامنے کھڑا تھا۔

"بتاؤ...؟" وہ اسریٰ کو دیکھ کر دھاڑے۔

وہ دونوں کانپ اٹھیں۔ اسریٰ نے روتے روتے
سب کچھ بتا دیا۔ چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ چپ
کھڑے تھے بالکل چپ۔

"تایا..." اس نے ذرا سا انہیں ہلایا تو وہ چونکے۔

"میرا دل کر رہا ہے تمہیں گولی ماردوں اسریٰ! میری
اولاد ہو کر تم نے میرا ہی سر میرے آگے جھکا دیا۔ دفعہ
ہو جاؤ' آج کے بعد بھی میرے سامنے مت آنا... جلد
ہی تمہارا رشتہ دیکھ کے کرتا ہوں تمہیں رخصت۔"
غصے میں ان کی آواز ہمیشہ کی طرح کانپنے لگی۔

اسریٰ کی تو حالت یوں تھی گویا کاٹو تو بدن میں لہو
نہیں۔ فاطمہ کی نگاہوں میں خلا کا بے بس چہرہ گھومنے
لگا۔

"اسریٰ نے غلطی کی ہے۔ تایا ابا اس غلطی کے ذمہ دار آپ ہیں۔" وہ کہتے کہتے رو پڑی۔ چھوٹا سا دل تھا اس کا۔ اسریٰ جتنی بہادر تھوڑی تھی وہ۔ تایا نے چونک کر اس کو دیکھا۔

"میں... میں... میں ذمہ دار ہوں؟" حیرت سے ان کی آواز پھٹ سی گئی۔

"ہاں... ہاں... آپ ہی ذمہ دار ہیں۔ آپ نے کبھی خالہ کو بیوی کا مقام اور رتبہ نہیں دیا۔ کبھی اپنے بچوں کا باپ بن کے نہیں دکھایا۔ کبھی انہیں محبت اور اعتماد ہی نہیں دیا۔ مانا کہ آپ کی شادی آپ کی پسند سے نہیں ہوئی مگر اس میں خالہ یا آپ کے بچوں کا کیا قصور۔ تین، تین زندگیوں سے آپ نے انتقام لیا۔ گستاخی معاف تایا جان! اگر ریحان بھائی کی ادھوری شخصیت، اسریٰ کا گھر سے تنگ ہو کر باہر والوں سے محبت لینا... اس سب کے ذمہ دار صرف آپ ہیں۔ صرف آپ۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وہ گواہ تھی۔ خالہ کی محرومیوں کی، اسریٰ کی خود سری کی۔

اسریٰ بھی رو رہی تھی۔

تایا ابا خاموش کھڑے تھے۔ حساب کتاب سامنے تھا۔ آئینے میں اپنا چہرہ ان کو واضح صاف نظر آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اس اتوار وہ لوگ آ رہے ہیں رسم کے لیے، انگوٹھی پہنا جائیں گے تمہیں۔" امی نے بیڈ پر اس کے ساکت بیٹھے وجود کو دیکھا اور کہہ کر باہر چلی گئیں۔ سارہ نے دکھ سے بہن کو دیکھا مگر وہ بھی بے بس تھی۔

"سمجھوتا کر لو عزہ! شاید اسی میں تمہاری بہتری ہے۔" سارہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا تسلی دی۔ عزہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سب کچھ قسمت پر چھوڑ چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ارے تم تیار نہیں ہوئیں اب تک، جلدی کرو، سب تیار ہو گئے ہیں۔" اسریٰ نے اسے نظر بیٹھے

دیکھ کر ٹہوکا دیا۔ بجی سنوری، پراعتماد اسریٰ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

برسوں بعد ہی تو چھوٹے تایا نے خالہ، ریحان بھائی اور اسریٰ سے معافی مانگی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ فاطمہ کو تو سب خواب سا لگ رہا تھا۔ حمزہ خان کا معاملہ بھی تایا نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ سب خوش تھے سوائے اس کے۔

وہ ابھی تک شہریار کے سامنے نہیں گئی تھی۔ مگر آج تو لگتا تھا جانا ہی پڑے گا۔ ریحان کی رسم کرنے جو جانا تھا۔

"فاطمہ..." اسریٰ نے اسے بلایا تو وہ اٹھ گئی۔ کل بابا بھی آ گئے تھے اور اس بار تو بابا کے آنے پر بھی وہ خوش نہیں ہی رہی۔ اسریٰ چلی گئی تھی۔ اس نے بے دلی سے کپڑے بدلے اور جھٹکے سے برش کر بال برش کرنے لگی کہ دوبارہ دستک ہونے لگی۔

"کیا تکلیف ہے۔ سارے گھر کو میری ہی فکر پڑ گئی ہے۔ آ جاؤں گی میں، جاؤ تم لوگ۔" اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔ جوابا" اسریٰ کے حملہ نہ کرنے پر وہ مڑی اور ساکت رہ گئی۔ بلیک پینٹ کوٹ میں اپنے شاندار وجود کے ساتھ شہریار سامنے کھڑا تھا۔

چمکتی بولتی ہوئی بھوری آنکھوں میں بے تحاشا شرارت تھی۔ وہ نگاہیں چرانے لگی۔ دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ سامنا ہو ہی گیا تھا۔

"سارے گھر والے چلے گئے ہیں... تمہارے کہنے سے پہلے ہی۔" وہ مسکرا کر آگے بڑھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہوئی۔

"چپ کیوں رہی ہو اتنے دنوں سے؟" اس نے بنا کسی خفگی کے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جواب تھا ہی نہیں۔

"کیا بات... یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ پتا ہے پچھلے کچھ دنوں سے کتنا اداس تھا میں۔ کتنا دل کر رہا تھا تمہیں دیکھنے کو مگر تم تو یوں چھپ گئیں جیسے ماؤں ہی بیٹھ گئی ہو۔" وہ شرارت سے بولا۔ فاطمہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ مذاق اڑا رہا

تھا۔

"میں تو تلاش گمشدہ کا اشتہار دینے والا تھا کہ بھئی ایک لڑکی جس کی عمر اکیس سال ہے' کچھ دنوں سے لاپتا ہے۔ وائی تو اون ٹھیک نہیں' دل اس کے پاس ہے نہیں' وہ میرے پاس ہے۔ باقی ایک ٹھیک ٹھاک لڑکی ہے' جس کو ملے مجھے۔" بات اس کے منہ میں ہی تھی کہ اس نے جھٹکے سے سر اوپر اٹھا لیا۔ وہ چپ ہو گیا۔ آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر تھا۔

"آپ کو کوئی حق نہیں میرا مذاق اڑانے کا۔ آپ جو بھی سمجھتے ہیں غلط سمجھتے ہیں۔ میں کسی اور کام کے لیے گئی تھی آپ کے کمرے میں اور... اور... اور آپ کی تصویر بھی میں نے ویسے ہی اٹھائی تھی۔"

وہ رو رہی تھی۔ شرمندگی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ جو اس کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر ایک لمحے کو گڑبڑا گیا تھا۔ اب مسکرا رہا تھا۔ وائیں گال میں پڑتا گڑھا۔ وہ ڈوبنے لگی۔

ایک گہرا سانس لے کر اس نے اس کا نازک ہاتھ تھاما اور لا کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا کر دیا۔ پھر خود بھی اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو ذرا... کتنا پیارا کپل ہے ہمارا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ فاطمہ نے نگاہ اٹھا کر آئینہ دیکھا۔

"میں کوئی مذاق نہیں اڑا رہا۔ خوش ہو رہا ہوں کہ میری پیاری سی منکوحہ مجھے اتنا چاہتی ہے۔ پہلے مجھے لگتا تھا تم مجھ میں انوالو نہیں ہو۔ صرف میں ہی ایک پاگل۔ مگر اس دن تمہیں وہاں دیکھا تو ہر خدشہ دور ہو گیا اور یقین بھی ہو گیا کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔" وہ تھوڑا سا جھک کر اس کے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ فاطمہ نے بے یقین نظروں سے اسے دیکھا۔

"اب کیا آنکھوں سے قتل کرو گی؟" اس کے چہرے کے بالکل قریب اپنا چہرہ کرتے ہوئے بولا تو فاطمہ کے ہوش اڑ گئے۔

"نن... نہیں... وہ... وہ... وہ رائمہ۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور شہریار بے اختیار ہنس پڑا۔

"وہ دوست ہے۔ تم بیوی ہو' جان ہو۔" اس نے اس کے شانے پر ہاتھ پھیلا کر اسے ساتھ لگایا۔

سرخ ہوتے چہرے اور ناقابل یقین خوشی کے ساتھ وہ اس کے کندھے پر سر ٹکا گئی۔ آگے کی راہ گزر واضح تھی۔

☆ ☆ ☆

خالی نظروں سے وہ اپنے ہاتھ میں ابھی پہنائی ہوئی انگوٹھی دیکھ رہی تھی۔ نظریں سامنے کھڑے شہریار اور اس کے پہلو میں شرمائی شرمائی سی فاطمہ پر تھیں۔

"کتنی مکمل جوڑی تھی نا۔"

"میں آپ کو جانتا نہیں مگر اس انگوٹھی کے رشتے سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو سمجھوں گا۔ میں یہ وعدہ نہیں کرتا کہ آپ کو صرف خوشیوں سے روشناس کراؤں گا' ہاں البتہ یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ غموں میں بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔"

مدھم مگر گمبھیر لہجے میں ساتھ بیٹھے شخص نے کہا تو وہ ایک دم اسے دیکھنے لگی۔ وہ فقرے کہے تھے اس نے اور سمجھوتے کی راہ بہت آسان بنا دی تھی۔ اس نے گہرا سانس لیا اور مسکرا دی۔

کیا ہوا جو ساتھ بیٹھا شخص فواد خان نہیں تھا۔ کیا ہوا جو بہت آئیڈیل نہیں تھا۔ اس کا باطن تو اچھا تھا نا۔ اب کے اس نے مطمئن ہو کر نگاہیں سامنے جما دیں۔

"آئیڈیل بنائیں' ضرور بنائیں' مگر اس کو پانے کی خواہش کرنا فضول ہے۔" وہ اب پورے اطمینان کے ساتھ تصویریں بنوا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ریحان کے ساتھ شہریار آ کر بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ فاطمہ... جوڑی مکمل ہو گئی' خوشیاں مکمل ہو گئیں۔

معصوم
ایک ان کہی حقیقت!
Director: OZAN UZUNOGLU
Writer: ERHAN CIFLAK
Cast
Cagla Simsek, Gozde Mukavelat,
Orhan Simsek, Ufuk Sen,
Burcu Yuce and others.
Fri to Sun at 9:30 pm
ARY
زندگی
زندگی ہے ملو...

عنبرین اعجاز

سورج کی پہلی کرن کے طلوع ہونے سے لے کر رات کے ایک بجے تک لگاتار کاموں میں جتے رہنے کے بعد اگر نیند کی حالت میں غلطی سے بھی کمرے سے باہر اور منہ سے آہ برآمد ہو جائے تو عزت مآب سرتاج کا یہی جملہ سننے کو ملتا ہے کہ "آخر تم سارا دن گھر میں پڑی کرتی کیا رہتی ہو؟"

بس یہی تھی نوشینہ کی دن بھر کی مشقت کی کمائی اور اجرت۔ مشین کو بھی آرام کی ضرورت ہوتی ہے' اسے وقفے وقفے سے چلایا جاتا ہے ورنہ اس کی موٹر جل جانے کا خدشہ ہوتا ہے' لیکن بیوی ایک ایسی باکمال مخلوق ہے جس کی زندگی کے پیراگراف میں کوئی "کوما" نہیں' بس ایک ہی بار آخری جملے کے اختتام پر "فل اسٹاپ" لگتا ہے۔

ان دنوں اماں جی کے وزن اور شوگر میں پھر اضافہ ہو گیا تھا۔ سو انہوں نے باقاعدگی سے مارننگ واک شروع کر دی تھی۔ اماں جی کی صحت کے حوالے سے جہاں یہ بات خوش آئند تھی' وہاں نوشینہ کے لیے ایک اور لمحہ فکریہ تھا آج پھر اماں جی نے صبح کی سیر کے دوران اپنی کسی "واک فرینڈ" کے ساتھ کوئی لمبی چوڑی بحث چھیڑ لی تھی جس کے نتیجے میں آج پھر انہوں نے ضرورت سے زیادہ چہل قدمی کر لی' شوگر لیول گر گیا۔ اماں جی اپنی گلی سے کافی آگے نکل گئی تھیں' دوست جو قدرے جوان تھی باآسانی اپنے گھر واپس لوٹ گئی تھی۔

اماں جی حسب سابق پہلے فٹ پاتھ پہ بیٹھ کے سانس درست کرنے لگیں پھر قریبی ہوٹل پہ چلی گئیں' جوس پیا اور اس کے موبائل سے گھر فون کروایا۔ نوشینہ دونوں بچوں اور اپنے شوہر کے لیے ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھی۔ ایک واش روم پہ ابا جان کا قبضہ تھا' دوسرے پر فیصل قابض تھے۔ دونوں بچوں کو ہدایات دیتی ہوئی وہ جھٹ سے نکلی اور چائے کے ٹھیے پر پہنچی' اماں جی کو ساتھ لیا اور ٹیکسی کر کے گھر واپس لوٹی۔

اس دوران دونوں بچے ناشتا ادھورا چھوڑ کے اپنی اسکول وین میں اسکول جا چکے تھے۔ فیصل کا ناشتا جوں کا توں موجود تھا گویا فیصل بھی بغیر ناشتا کیے ہی آفس چلے گئے تھے۔ ابا جان کا ناشتا سامنے دھرا تھا اور وہ اخبار بینی میں مصروف تھے۔

آج تو اماں جی کی "حیدر آبادی فرائز کٹ" اور "دلی کی بریانی" پر بحث نے سب کو بھوکا مار دیا تھا۔ دو روز قبل انہوں نے دار چینی کے فوائد اور لونگ کے خواص بھی اسی انداز میں خاصی تفصیل سے تبصرہ فرمایا تھا' لیکن اس دن کم از کم بچوں کا لنچ تو تیار ہو ہی گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہاتھ تیز چلا رضیہ! سارا کام پڑا ہے۔ مجھے کیا فائدہ تجھے لگوانے کا' زیادہ تر کام تو مجھے خود ہی کرنا پڑتا ہے۔"

نوشینہ صحن میں رضیہ کے ساتھ فرش دھلوا رہی تھی رضیہ ڈھیٹ بنی ہی ہی کرنے لگی۔

"باجی جی! جب تک آپ میرے ساتھ کام میں نہیں لگتیں تو میرا دل بھی کام میں نہیں لگتا۔" رضیہ نے بتیسی کی بھرپور نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"چل کام کر! اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مجھے نہ پھسلا۔ کونوں میں اچھی طرح رگڑ رگڑ کے جھاڑو مار۔ دیکھ! کتنی کائی جمی ہے۔" نوشینہ نے گھرکا۔

"باجی! آپ پندرہ پندرہ منٹ ایک ایک کونے کی صفائی میں لگائیں گی تو ہفتہ تو یہیں صحن میں ہی لگ جائے گا' باقی کام کب ختم ہوں گے۔" رضیہ نے منہ بسورا اتنے میں اس کا موبائل بج اٹھا۔

"تو نے ماری ایڑیاں' دل میں بجی گھنٹیاں ٹن ٹن ٹن۔"

"لاحول ولا ہزار بار تجھ سے کہا ہے کہ اپنے موبائل کی رنگ ٹون تبدیل کر' لیکن مجال ہے جو تو میری سنے' چینی زبان تو نہیں بولتی میں۔"

نوشینہ نے جھنجلا کے کہا۔ رضیہ نے جھاڑو اور پائپ وہیں چھوڑا اور کمر میں بندھے دوپٹے کے پلّے میں اڑسا ہوا موبائل نکالا اور کان سے لگا کے دوسرے کونے میں جا گھسی۔

نوشینہ نے اسے غصیلی نظروں سے گھورا لیکن رضیہ بدستور دیوار کی طرف منہ کیے کھسر پھسر کرتی رہی۔ ہانڈی میں چمچ چلانے کی غرض سے نوشینہ اٹھی، پہلے نل بند کیا پھر اندر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

لاؤنج میں اماں جی گزشتہ ایک گھنٹے سے فون پہ گفتگو فرما رہی تھیں۔ گفتگو کیا تھی شکایتوں کا دفتر تھا جو بند ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ پڑوس کے ایک ہونہار لڑکے ولید نے ایک افغان دوشیزہ سے منگنی کرلی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ حال ہی میں سامنے والے مکان کے ایک پورشن میں شفٹ ہونے والی افغان فیملی کی خوب صورت نازک اندام بیٹی نیم سہ پہر اپنے گھر کے باہر سڑک پر کھڑی ریت کی چھلی (بھٹہ) لے رہی تھی جب ولید کی آفس سے واپسی ہوئی۔ بھٹے والے نے بھی اپنی ریڑھی عین سڑک کے بیچوں بیچ پارک کر رکھی تھی۔

بلاشبہ یہ حسن کا جلوہ تھا کہ نہ تو ولید کا ہاتھ ہارن بجانے کو اٹھا اور نہ ہی پاؤں بریک سے ہٹا۔ کل رات ہی منگنی کی مٹھائی گھر گھر بانٹ دی گئی تھی۔ اماں جی نے ولید کے لیے اس کے میٹرک کے امتحانات سے لے کر ایم فل فزکس گولڈ میڈلسٹ بننے تک تمام تعلیمی سفر کے دوران بہت ورد وظائف کیے۔ دراصل اماں جی اپنی بیٹی نرین آرا کے "روشن مستقبل" کے لیے یہ محنت کررہی تھیں۔

اڑوس پڑوس میں دیگر کئی "امیدوار" بھی تھے جن کی دیرینہ آرزوؤں کا قتل عام ہوا تھا۔ بے شک حقیقت تلخ ہوتی ہے لیکن حقیقت کو تسلیم کرنا تلخ ترین عمل ہے۔ نوشینہ قریب سے گزری تو اماں جی نے سائیڈ ٹیبل پہ دھرے اس کے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔

نوشینہ نے جھک کے موبائل اٹھالیا۔ فیصل کا میسج آیا ہوا تھا کہ آج شام کی چائے پر اس کا کولیگ معہ اپنی فیملی ان کے گھر آرہا ہے۔ ایک اور سرپرائز نوشینہ کا منتظر تھا وہ بھی مہینے کے آخر میں۔ جب بجٹ پہ ہاتھ سخت رکھنا پڑتا ہے بلکہ بجٹ خود ہی صارف پہ ہاتھ سخت رکھتا ہے۔ ان حالات میں ابا جی کو چائے کے لوازمات لینے مارکیٹ بھی نہیں بھیجا جاسکتا ان کی عادت تھی کہ راستے میں ہی آدھے نمک پارے، آدھی جلیبیاں اور آدھے بسکٹ چٹ کرجاتے تھے، اس لیے نوشینہ ہمیشہ آدھا کلو اضافی اشیا منگواتی تھی، مگر اب یہ مشکل امر تھا۔

نوشینہ کو یہ کار خیر بھی خود ہی انجام دینا تھا۔ والٹ میں پیسے رکھتے ہوئے اسے خیال آیا کہ سلائی والے کپڑے بھی سلنے دیئے ہیں دو گلیاں چھوڑ کے ہی اس لڑکی کا گھر تھا جو کپڑے سلائی کرلی تھی۔ نوشینہ نے سوچا کہ وقت کی بچت کے تقاضے کے پیش نظر اس طرح گھر سے نکلے کہ سلائی کے کپڑے دے کر مارکیٹ سے ضروری سودا سلف لے کر سیدھا بچوں کو پک کرنے ان کے اسکول چلی جائے اور پھر ایک ساتھ گھر واپسی ہو۔ چنانچہ اس نے بڑی سی چادر اپنے گرد لپیٹی اور کپڑوں کے شاپر سنبھالے نکل کھڑی ہوئی۔

"فریحہ سلائی سینٹر" کے کھلے گیٹ سے وہ اندر داخل ہوئی۔ سلائی سیکھنے والی کئی بچیاں ارد گرد بیٹھی تھیں۔ فریحہ نوشینہ کو بٹھا کے ٹھنڈا پانی لینے اندر کچن میں چلی گئی۔ قریب ہی ایک پیاری سی معصوم کم سن لڑکی مشین پہ بیٹھی بخیہ بھر رہی تھی رسمی بات چیت کا آغاز ہوا اس لڑکی نے بتایا کہ عنقریب اس کی شادی ہونے والی ہے اور اپنی ہونے والی ساس کی "ڈیمانڈ" پر اسے سلائی سیکھنا پڑ رہی ہے کیونکہ بڑی بہو گھر بھر کے لیے کھانا بناتی ہے اس لیے چھوٹی بہو کی ڈیوٹی سلائی مشین پر ہوگی۔

یہ سن کر تو نوشینہ کی پیاس میں مزید اضافہ ہوگیا۔ حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے ایک ہی سانس میں غٹاغٹ وہ ٹھنڈے پانی کا پورا گلاس پی گئی۔ سانس بحال ہوا تو اس نے شاپر کی گرہ کھولنے کو ہاتھ بڑھایا۔

"نوشینہ باجی! میں نے کپڑے سلائی کرنا چھوڑ دیا ہے اب میں مزید آرڈر نہیں لے رہی۔ یہ سلائی اسکول بھی اب بند کردوں گی۔"

فریحہ نے دھیمی آواز میں معذرت خواہانہ انداز میں انکشاف کیا۔ نوشینہ کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ ابھی

سال بھر پہلے ہی فریحہ نے اپنے شوہر کی محدود آمدنی اور تین بچوں کی بڑھتی ہوئی اسکول فیس اور دیگر اخراجات کے پیش نظر کپڑے سلائی کرنا شروع کیے تھے۔ ہنرمند، باصلاحیت، سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ آمدنی میں اتنی خیر و برکت ہوئی کہ پانچ ماہ بعد ہی سلائی سینٹر کھول لیا جہاں سیکھنے والی بچیوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ دیکھنے میں آرہا تھا۔ فریحہ کے تو دن پھر گئے تھے۔ تو پھر آخر ایسی کیا مجبوری آن پڑی جو اتنا کامیابی سے چلتا ہوا کاروبار اچانک بند کرنا پڑ رہا ہے۔

نوشینہ کے استفسار پر پہلے تو فریحہ ٹال مٹول سے کام لیتی رہی، لیکن نوشینہ کی "ثابت قدمی" اور "مستقل مزاجی" کے سامنے اسے ہار ماننا پڑی اور اس نے اصل سبب بتا ہی دیا۔

فریحہ نے بتایا کہ کچھ ہفتوں سے اسے اپنی طبیعت میں عجیب سے پژمردگی محسوس ہو رہی تھی، طبیعت نڈھال، سست اور چکر بھی آرہے تھے۔ آنکھوں کے آگے اچانک اندھیرا آجاتا، سارا دن غنودگی چھائی رہتی اس لیے فریحہ نے رضیہ کو گھر کے دیگر کام کاج کے لیے لگوا لیا تھا۔ پھر ایک دن رضیہ اسے اپنے ساتھ "پیر بابا پیر سوٹی سرکار" کے آستانے پر لے گئی۔ بقول فریحہ بابا جی پیر بھولی بہت ہی "پہنچے" ہوئے بزرگ تھے جنہوں نے فریحہ کا نام سنتے ہی اس کے شوہر اور بچوں کے نام، عمریں اور فریحہ کے مسائل تک گنوا دیے۔

بابا پیر سوٹی نے ہی فریحہ کو سختی سے تنبیہ کی تھی کہ سلائی کے کاروبار سے فوری طور پر دور ہو جائے۔ یہ کاروبار اس کے لیے مستقبل میں نحوست اور سخت مشکلات اور ناقابل تلافی نقصانات کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

"میری بیمار طبیعت ایک اشارہ ہے۔ اسی لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ کچھ عرصے بعد بابا جی کے مشورے سے کوئی اور کام شروع کرلوں گی۔" فریحہ نے اداسی اور خوف کے ملے جلے تاثرات لیے اپنی بات مکمل کی۔

"ہوش کرو فریحہ! تمہارے بابا جی کو غیب اور مستقبل کا علم کب سے ہو گیا۔ مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔ کوئی گہرا راز!" نوشینہ نے برملا اظہار کیا۔

"نہیں باجی! بابا جی نے تو مجھ سے "نذرانہ" یا "ہدیہ" بھی نہیں لیا۔ نہ ہی کوئی تعویذ یا ٹونہ ٹوٹکا کیا۔ بس صرف یہی ایک حل بتایا ہے۔"

فریحہ نے اپنے پیر صاحب کی وکالت کی۔ نوشینہ کو لگا کہ فی الحال مزید بات کرنا بے کار ہے لہٰذا وہ شاپر اٹھائے چل پڑی۔ مارکیٹ سے اشیائے خورد و نوش خریدتے وقت بھی وہ مسلسل فریحہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ معاً اس نے موبائل میں ٹائم دیکھا بچوں کی چھٹی ہوئے آدھا گھنٹہ اوپر ہو چکا تھا۔ نوشینہ حسب سابق آج پھر لیٹ ہو گئی تھی۔ وہ بھاگتے قدموں اور پھولی سانسوں کے ساتھ اسکول کے بند گیٹ کے سامنے پہنچی اکا دکا بچے اپنی وین کے انتظار میں کھڑے تھے، لیکن پنکی اور سیفی کہیں دکھائی نہ دیے۔

اس نے آگے بڑھ کر بچوں سے پوچھا تو ایک بچے نے سڑک کے پار ایک گھنے درخت کی جانب اشارہ کیا۔ نوشینہ نے تعاقب میں نظر دوڑائی تو دیکھا کہ دونوں بچوں کے اسکول بیگ گھاس پر پڑے تھے اور خود دونوں بہن بھائی شہتوت کے درخت کی چوٹی میں چھپے جنگلی شہتوت توڑ توڑ کے کھا رہے تھے۔ گرد و پیش کا انہیں کوئی ہوش نہ تھا۔ ماں کی پاٹ دار آواز سنتے ہی دونوں بچے پکے ہوئے پھل کی طرح دھڑام سے زمین پر آرہے۔ نوشینہ نے دونوں کو ایک ایک چپت رسید کی۔

"تو اور کیا کرتے ہم؟ آپ دیر سے آتی ہیں ہمارا بھوک کے مارے برا حال ہو جاتا ہے ماما!" بچوں نے بھی جواباً کارروائی کی اور کندھوں پر بیگ چڑھانے لگے۔

صد شکر کہ اللہ نے مہینے کے آخر میں مہمانوں کے سامنے عزت رکھ لی۔ رات کو سونے سے پہلے نوشینہ کو پھر فریحہ کا خیال آگیا۔ اماں ابا کو شب بخیر کہنے ان کے کمرے میں گئی تو بر سبیل تذکرہ اماں جی سے فریحہ کا ذکر کیا۔ اماں جی نے بتایا کہ قریب ہی ایک اور سلائی

اسکول اور بوتیک کھلی ہے۔ ابھی ہفتہ بھر پہلے ہی اس کا افتتاح ہوا ہے۔ "تازو بوتیک اینڈ ٹیلرز" کے نام سے جبکہ سلائی اسکول کا نام "دیباج النساء سلائی کڑھائی مرکز" ہے۔ اماں جی نے صبح کی کلب سیر کے دوران ہی دو کوٹھیوں کے باہر یہ بورڈ آویزاں دیکھے تھے۔

اماں جی نے مزید بتایا کہ تازو نامی لڑکی اور دیباج النساء نامی خاتون بھی صبح کی سیر کرتی ہیں اور اماں جی سے ان کی اچھی سلام دعا بھی ہے۔ مزید یہ کہ ان دونوں گھروں میں بھی رضیہ ہی کام کرتی ہے۔

☆ ☆ ☆

ڈور کا ایک سرا تو ہاتھ آگیا تھا۔ اگلے روز رضیہ کام کے لیے آئی تو نوشینہ نے باتوں ہی باتوں میں اس سے اپنی فرضی بیماری اور فرضی علامات کا ذکر کیا۔ رضیہ بہت غور سے ساری بات سنتی رہی۔

"مجھے تو شک پڑتا ہے رضیہ! کہیں کسی نے مجھ پہ کوئی جادو ٹونہ تو نہیں کروا دیا۔" نوشینہ نے سرگوشی کی۔

"جی جی باجی! مجھے تو آپ کی بات سن کے سو فیصدی یقین ہے کہ یہ کوئی ایسی ہی گڑبڑ ہے۔ باجی نوشینہ! اگر آپ کہیں تو میں ایک پیر بابا کو جانتی ہوں جو ایسے جادو ٹونے کا توڑ کرنے کے ماہر ہیں۔" رضیہ نے حسب توقع مشورہ دیا تھا۔

"اچھا! کیا نام ہے ان کا؟" نوشینہ نے وفور شوق سے پوچھا۔

"باجی! وہ جگہ یہاں سے ذرا دور ہے۔ میں آپ کو ساتھ لے چلوں گی مجھے راستے کا پتا ہے۔ لیکن اکیلے میں سمجھا نہیں سکتی اور پھر آپ کو راستہ ڈھونڈنے میں مشکل ہوگی۔"

رضیہ نے فٹ سے جواب دیا۔ نوشینہ نے ذرا توقف کے بعد یہ آفر قبول کرلی۔ اب رضیہ کے نتائج کی باری تھی۔

☆ ☆ ☆

آج پروگرام کے مطابق رضیہ جلد گھر آگئی تھی اور

کام بھی جلد ہی نمٹا لیے تھے۔ نوشینہ چادر لینے کے بہانے اپنے کمرے میں گئی اور فریحہ کو موبائل سے میسج کردیا کہ وہ بھی اپنے گھر سے نکل آئے اور گلی کے نکڑ پہ پہنچ جائے۔ رضیہ اور نوشینہ کو فریحہ راستے میں ہی مل گئی۔ نوشینہ نے پیر بابا کی طرف جانے کا بتایا تو فریحہ بھی بابا جی کو سلام کرنے کے بہانے ساتھ چل دی۔ دور سے ہی لال لال بیر بہوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ آستانے پہ بہت رش تھا۔ قریب ہی نصب ٹیوب ویل سے تینوں عورتوں نے پانی لیا پھر خواتین کے لیے مخصوص گوشے کی سمت بڑھ گئیں۔ زیادہ تعداد گھروں میں کام کرنے والی عورتوں اور بھرپور تیاری مات کی تھی۔

رضیہ نے ایک خدمت گار کے کان میں کھسر پھسر کی خدمت گار نے پیر بابا کے پاس جا کے سرگوشی کی۔ بابا جی نے اثبات میں سر ہلایا اور خدمت گار کے کہنے پہ تینوں آگے چلی گئیں۔

"بابا جی! یہ نوشینہ باجی ہیں۔" رضیہ نے تعارف کرایا۔

نوشینہ کا نام سننے کی دیر تھی کہ بابا جی نے اس کی پریشانی (فرضی بیماری) اور فرضی علامات من و عن بیان کرنا شروع کردیں۔ نوشینہ کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور منہ کھلے کا کھلا لیکن دل ہی دل میں وہ بابا جی کی اعلا یادداشت اور قوت حافظہ کی گرویدہ ضرور ہوگئی تھی۔ بابا جی بیر بہوٹی والی سرکار نے کافی جتن قیمت نسخہ (توڑ) تجویز کیا تھا۔ اکیس عدد روغنی دیے بوقت تہجد راول ڈیم کے کنارے عین پانی کے قریب موجود پتھروں پہ جلانے ہیں اور وہ بھی لگاتار سات روز۔ "پڑھائی" پیر بابا ہی کریں گے۔ ایک روز کا خرچ تقریباً" اٹھارہ سو تک آئے گا۔ کیونکہ بقول رضیہ نوشینہ باجی کے لیے لگاتار سات روز تک یہ "توڑ" کرنا دشوار ہوگا لہذا بابا جی اپنے کسی خدمت گار یا عامل کے ذریعے ہی یہ عمل ختم کروالیں گے البتہ اخراجات تو نوشینہ کو ادا کرنے ہی ہوں گے۔

نوشینہ نے جو یہ سنا تو اصل معاملے کی تہ تک پہنچ

تھی۔ یقیناً" اس میں رضیہ کا اپنا "کمیشن" بھی شامل تھا۔

"یہ دیے پٹرول سے جلانے ہیں یا سی این جی سے جلانے ہیں؟" نوشینہ یہ کہتے ہوئے تیز ہو گئی اور تیزی سے فریحہ کا بازو پکڑے دوڑ لگا دی۔ رضیہ کی صدائیں دور تک پیچھا کرتی رہیں۔

"اب تسلی ہو گئی تمہاری؟ رضیہ نے تمہارے مسائل دیکھے اور سنے۔ تمہیں خود ہی پیر بابا کا رستہ دکھایا اور پیر بابا کو تمہارے متعلق پہلے ہی ساری معلومات بہم پہنچا دیں۔ رضیہ کے ساتھ تمہیں دیکھتے اور تمہارا نام سنتے ہی وہی معلومات اپنی زبان سے ادا کر دیں اور تم بابا جی کی "غیب دانی" سے متاثر ہو گئیں۔" نوشینہ نے فریحہ سے کھل کے بات کی۔

"لیکن باجی! میرا سلائی اسکول کون بند کروانا چاہتا ہے اور کیوں مجھے سلائی کے کام سے مکمل طور پر "پرہیز" کا سختی سے کہا گیا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو گی؟" فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

نوشینہ کے دماغ میں "وہاج النساء سلائی اسکول" اور "نازو بوتیک اینڈ ٹیلرز" کے نام بجلی کی طرح لپکے۔ ان دونوں گھروں میں بھی رضیہ ہی کام کرتی تھی۔

"فکر مت کرو۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔ یہ گرہ بھی کھل ہی جائے گی۔"

نوشینہ نے فریحہ کو تسلی دی اور ساتھ ہی چند لیب ٹیسٹ اور کسی مستند ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کو کہا۔

دوسرے دن رضیہ کو نوشینہ اور فریحہ نے حساب کتاب کر کے فارغ کر دیا۔ رضیہ کو فارغ کرنے کی دیر تھی کہ رضیہ نے پورے محلے میں دونوں کے خلاف بے پر کی اڑائی جھوٹی سچی باتیں مرچ مسالے لگا کر ان دونوں سے منسوب کیں۔ نوشینہ اور فریحہ ذہنی طور پر یہ سب سننے کے لیے پہلے ہی تیار تھیں۔ سو انہیں کوئی فرق نہ پڑا۔ البتہ "فریحہ سلائی سینٹر" کے بند نہ ہونے اور پہلے سے زیادہ کامیابی ملنے پر کچھ لوگوں کو فرق ضرور پڑا تھا۔

مہینے بعد ہی رضیہ کو وہاج النساء اور نازو نے بھی فارغ کر دیا جس پر رضیہ نے خوب واویلا مچایا اور کھلم کھلا الفاظ میں ان کی حاسدانہ فطرت کی خوب چغلی کی۔ ان دونوں خواتین کے ساتھ مل کے ہی رضیہ نے فریحہ کے خلاف یہ پلان ترتیب دیا تھا اور رضیہ نے موقع پا کر فریحہ کو یہ تاثر دیا تھا کہ کسی نے اس پر کوئی ٹونا کروایا ہے اور پھر فریحہ کو مجبور کر کے پیر بابا کے آستانے پر لے گئی۔ بابا جی پیر سوہنی سرکار کو "نذرانہ و ہدیہ" اور رضیہ کو "کمیشن" تو وہاج النساء اور نازو نے ہی ادا کیا تھا۔

مقصد تو صرف فریحہ کا کاروبار بند کرانا اور اپنا کام جمانا تھا، لیکن رزق اور اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے خود لے رکھا ہے اور وسیلے بھی وہ خود ہی بناتا ہے۔ جیسے فریحہ کے رزق کی حفاظت کے لیے اس نے اپنے حکم سے نوشینہ کو وسیلے کے طور پر منتخب کیا تھا۔ ورنہ انسان کے ہاتھ میں یہ ہوتا تو انسان

"ہوائیں بیچتے نیلام رنگ و بو کرتے"

☆☆

ناولٹ

کھڑکی سے باہر دیکھنے پر موسم کافی اچھا تھا لیکن پی الحال کمرے میں بہت حبس تھی اور اس کی وجہ زنیش تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا مزاج گرم ہو رہا تھا اور پھر ٹھنڈا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ منال کا دل چاہا اپنی نک چڑھی کزن کو مشورہ دے کہ کمرے میں ہیٹر کی جگہ کوئی برف کی سل بھی رکھ دے۔ شاید اس کے مزاج میں کچھ افاقہ ہو جائے۔ لیکن ایسی بات کر کے اسے اپنی شامت تھوڑی بلوانی تھی۔ اس لیے وہ بھی چپ چاپ بیٹھی باہر کے موسم سے آنکھیں ٹھنڈی کرتی رہی۔

"تم کیا ٹکٹکی باندھے باہر دیکھے جا رہی ہو۔" زنیش

میر کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ تھی۔ منال اس حسین مسکراہٹ والے بندے کو دیکھتی گئی۔ تمہارے چہرے پر یہ مسکراہٹ سدا رہے راہ میر کو کہ اس کی امید بڑی کم ہے۔ وقت بڑا ستم گر ہوتا ہے۔

"تم کیا سوچ رہی ہو بھوری بلی۔" راہ میر نے اس کے سر پر چپت رسید کی۔

"کچھ نہیں۔" منال نے سر جھٹکا۔ "زنیش کا مزاج کچھ برہم ہے۔"

"یہ تو بڑی نئی خبر دی آپ نے۔" وہ ہنسا۔ "ان کا مزاج صحیح کس وقت ہوتا ہے۔ شاید رات کو سوتے

نزہت شبانہ حمید

اس کی خاموشی سے اکتا گئی۔

"تو کیا کروں۔ تم کوئی بات سننے پر راضی بھی تو ہو۔ خود ہی الٹی سیدھی باتیں جوڑ لیتی ہو۔" راہ میر نے اسی وقت اندر قدم رکھا۔

"تمہیں چین نہیں ہے؟" منال نے اسے ٹیڑھی نگاہوں سے گھورا لیکن راہ میر اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ وہ زنیش کو دیکھ رہا تھا۔

"زنیش کو کیا ہوا ہے؟" وہ ایک دم بے چین ہو اٹھا۔

"تمہارے سامنے بیٹھی ہے۔ خود پوچھ لو۔ بلکہ پوچھ کر دیکھ لو۔ ویسے ..... آدمی کو تمہارے جیسا ہونا چاہیے۔"

"اف آپی۔ اچھا خاصا نوجوان ہوں بھئی۔" راہ

وقت۔"

اس کے لہجے میں ابھی بھی شگفتگی تھی۔ اسے اب بھی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ نہ زنیش سے نہ زنیش کے رویے سے۔ منال کے دل میں ڈھیر سارے رشک کے جذبات سمٹ آئے۔ حالانکہ اس طرح سوچنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"ویسے کچھ پتا چلا کہ آج کس بات پر موڈ آف ہے؟"

بظاہر اس کا لہجہ لاپروا تھا۔ لیکن اس کے اندر اب پریشانی تھی اور یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ چاہے دنیا میں کچھ ہو جائے۔ راہ میر کو زنیش کے ماتھے کی ایک شکن بھی برداشت نہیں ہے لیکن رنیا تو راہ میر میں تھی۔ زنیش کے اندر حسن نے خود سری بھری تھی تو

دولت نے اسے مغرور بنا رکھا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ اس پر دونوں ہی چیزیں سجتی تھیں۔ جب وہ ادا سے اپنے بالوں کو پیچھے جھٹک کر اپنی چھوٹی سی خوب صورت ناک چڑھا کر بولتی تو دو ساری ہی چیزیں اس پر ایسے سج جاتیں۔ جیسے یہ ادائیں اسی کے لیے بنی ہوں۔ حسن بے پروا والا معاملہ نہیں تھا۔ اسے اپنے حسن سے آگاہی تھی۔ اور بہت تھی۔ منال کہتی تھی۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔

لیکن کوئی کچھ بھی کہے۔ وہ نادی تھا۔ جو وہ چاہتی تھی۔ اور کرتی بھی وہی تھی جو وہ کرنا چاہتی تھی۔ سنہرے حرفوں سے لکھی گئی قسمت جو کسی کسی کو ملتی ہے۔

وہ گھٹنوں میں سر دیے یوں ہی اوٹ پٹانگ سوچتی رہی تب ہی زمش نے اس کا کندھا ہلا کر کہا۔

"منال! میں باہر جا رہی ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔"
اس کا لہجہ سادہ ہی تھا۔ مگر اس کی تہہ میں ایک تحکم تھا۔ اور منال اس کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

اس کی فطرت میں شامل تھا۔ احسان یاد رکھنا۔ اور جب آپ کسی کا احسان یاد رکھتے ہیں تو پھر اور کچھ نہیں کر سکتے۔ منال نے اپنی بند ہوتی آنکھوں کو کھولا اور جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"دیکھو بھئی۔ کلمہ وغیرہ پڑھ لینا اور ہو سکے تو بلیک کا نظر کا ٹیکا لگا لینا۔ جس سے تمہیں گاڑی سے باہر بیٹھی ہوئی قیامت نظر نہ آئے۔" قریب سے گزرتی ہوئی لبنیٰ نے مذاق اڑایا جس کو زمش نے برا سا منہ بنا کر اور "ارے نہ" کر کے پرے کیا۔

"یقیناً تمہیں رامیر کے لیے کوئی گفٹ وغیرہ لینا ہوگا۔ اس نے بھی ابھی پچھلے دنوں تمہیں کوئی ڈائمنڈ رنگ دی تھی نا۔"

"ڈائمنڈ رنگ۔" زمش کی خوب صورت سنہری آنکھوں میں ہنستے ہنستے پانی آ گیا۔ "اتنا چھوٹا ڈائمنڈ کہ میں نے رامیر سے کہا۔ ایک مائیکرو اسکوپ بھی ساتھ لے آتے۔ جس سے یہ ڈائمنڈ نظر تو آتا۔"

"بہت بری بات ہے زمش! اس طرح کسی کا دل توڑا جاتا ہے۔"

"اور تمہیں بس اس کے دل کی فکر ہو رہی ہے اور لڑکوں کا دل کبھی بھی نہیں ٹوٹتا پیاری منال!"

"نہیں ٹوٹتا ہوگا۔ لیکن تمہارے معاملے میں تو ٹوٹنے سے آگے بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دھڑکنا ہی چھوڑ دے۔"

منال نے سچائی سے کہا۔ یہ وہ سچائی تھی۔ جس پر اسے لگتا تھا کہ خود اس کا دل بھی دھڑکنا چھوڑ دے گا۔

اس اتنے بڑے روشنیوں والے گھر میں ایک فرد ایسا بھی رہتا تھا۔ جس کی آنکھوں نے اپنی اوقات سے بڑھ کر خواب دیکھ لیے تھے اور خواب تو پھر خواب ہی ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بات وہ زمش کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔ کہ وہ محبتوں کی قدر کرنا سیکھ لے اور ہو سکتا ہے کہ اسے ضرورت بھی نہ ہو۔ لیکن یہ دوسری چیز منال کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ دنیا میں ایسا کون ہوگا۔ جسے محبتوں کی ضرورت نہ رہے۔ ایسی ہی اوٹ پٹانگ سوچوں میں مال آ گیا۔ اور وہ اس کے ساتھ ہر دکان پر گھسنے لگی۔ حتیٰ کہ پیسے ختم ہو گئے۔ اور کریڈٹ کارڈ کی باری آ گئی۔

"بس کرو زمش!" منال نے گڑگڑا کر کہا۔ "میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"ارے تم کیسی بور تنگ لڑکی ہو؟ لوگ تو شاپنگ پر آ کر اس قدر خوش ہوتے ہیں۔"

"زمش! ان کے پاس خوش ہونے کی وجہیں ہوتی ہوں گی۔ میرے پاس ایسی کوئی وجہ نہیں ہے۔" منال نے سادہ لہجے میں کہا اور اس لہجے کو سادہ بنانے کے لیے اسے کتنے جتن کرنے پڑے تھے یہ وہی جانتی تھی وہ ڈرتی تھی کہیں حسرتیں لہجوں کا روپ نہ دھار لیں۔ زمش بے دریغ جن چیزوں پر پیسے لٹا رہی تھی۔ ان میں سے کچھ چیزوں کی تو اس کو بھی اشد ضرورت تھی۔

تھے۔ سات پہننے والے سوٹ جو بالکل گھس چکے تھے۔ بیگ، جوتے، اتنے استعمال ہو چکے تھے کہ ان کی ورڈی ہی اڑ گئی تھی۔ لیکن اسے یہ چیزیں اس وقت تک چلانی ہی تھیں۔ جب تک اماں اپنا سارا قرضہ نہیں اتار لیتی تھیں۔ اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ اسی لیے وہ بیٹھی اوٹ پٹانگ سوچ رہی تھی اور دوسری طرف زنیش تھی۔ نہ اس کا منہ بند ہو رہا تھا نہ اس کے پرس کا منہ۔ باقی الگ سیل فون پر مصروف کار تھے۔

شاید ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زندگی ایک حرکت مسلسل کا نام ہے۔ مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔ بہت اچھا شعر ہے انسان کے پاس پیسے نہ ہوں تو وہ مردہ دل ہی ہو جاتا ہے۔ توبہ توبہ کیا ہو گیا ہے۔ اس نے خود ہی چپکے سے اپنے آپ کو تھپڑ مارا۔ پیسوں کے علاوہ دماغ اور کہیں جا ہی نہیں رہا ہے۔ اسی وقت زنیش نے اسے ٹہوکا دیا۔

"منال! اپنے لیے بھی کچھ لے لو۔"

خودداری کا سبق اچھی طرح رٹنے کے باوجود بھی بعض اوقات انسان کمزور پڑ ہی جاتا ہے۔ زنیش نے رواداری میں ایک جملہ کہا اور دوسرے ہی لمحے وہ سیل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ فون کی بیپ مستقل بج رہی تھی۔ فون کی اس مستقل بجتی گھنٹی میں اس نے پتا نہیں منال کا انکار سنا بھی یا نہیں۔ شکر تو یہ تھا کہ شاپنگ اب اختتامی مراحل میں داخل ہو گئی تھی۔

کیونکہ اب زنیش کو بھوک لگ رہی تھی۔ نہ جانے کتنا کچھ اس نے منگوا لیا تھا۔ منال جانتی تھی وہ ان سب چیزوں میں سے بہت تھوڑا سا ہی کھائے گی۔ پھر پتا نہیں کیوں اتنی ہوس ہے یا پھر پیسوں کی فراوانی۔

"اف خدایا! ہر سوچ ایک ہی بات پر کیوں اٹک رہی ہے پیسے پر۔ پتا نہیں منال کیسی گھٹیا سوچ ہو گئی ہے تمہاری۔"

جس وقت وہ دونوں گھر پہنچیں۔ سورج بالکل ڈھلنے کے قریب تھا۔

"اچھا ہوا تم لوگ جلدی پہنچ گئے۔ ہم تو کسی اور چیز کی تیاری کر رہے تھے۔" کنزیٰ نے شرارت سے کہا۔

"آج زنیش نے صحیح گاڑی چلائی تھی۔" منال نے کہا۔

"یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔" کنزیٰ نے بے پروائی سے کہا۔

"اچھا وہ کیسے؟" منال کے لہجے میں رہی سادگی کا نشر تھا مگر مزاج کنزیٰ بھی ہنس پڑی۔

"وہ اس طرح جناب کہ آپ دونوں صحیح سلامت گھر پہنچ گئیں۔ ورنہ یاد نہیں ہے پچھلی دفعہ بھی تمہارا بازو فریکچر ہوا تھا۔"

"اچھا لیکن وہ اس کی غلطی نہیں تھی۔" اس نے کمزور سا دفاع کیا۔

"منال!" کنزیٰ نے آنکھیں نکالیں۔ "یہ جھوٹ بولنے میں شمار ہو گا۔"

"اچھا۔" وہ خاموش ہو گئی۔ لوگ زنیش کو تو کچھ نہیں کہتے تھے۔ لیکن اس کے حوالے سے اس پر اچھی خاصی تنقید کر دیتے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ آسان ہدف تھی۔ ٹی وی لاؤنج میں سارا سامان پھیلا ہوا تھا۔ یہاں سے وہاں تک رنگ برنگی چیزیں۔ اس کے سر میں اتنا درد ہو رہا تھا کہ وہ ارد گرد کا دھیان کیے بغیر کونے والے صوفے میں گھس گئی۔ اسی وقت راد میر کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ زنیش سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اسے لوگوں کی باتیں سننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ لیکن اس کا نام راد میر کیوں لے رہا تھا۔

"تمہیں اس کے لیے بھی کچھ لینا چاہیے تھا۔" شاید راد میر کی نظراس پر نہیں پڑی تھی۔

"تم مجھے اب بور کر رہے ہو۔ مجھے عادت نہیں ہے کسی کے آگے صفائی پیش کرنے کی لیکن میں نے اس سے کہا تھا۔ اور اس نے منع کر دیا۔ جاؤ تو پوچھ سکتے ہو۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے کچھ پوچھنے کی۔ تم کہہ رہی ہو تو صحیح ہی کہا ہو گا۔" منال جانتی تھی کہ یہ راد میر کی

عادت تھی۔ وہ کسی بھی معاملے میں الجھتا نہیں تھا اور زنیشہ کی کہی ہوئی کسی بات سے تو بالکل نہیں۔ چاہے وہ غلط ہو یا صحیح۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ چپکے سے باہر نکلی۔

جس وقت وہ اپنے پورشن میں داخل ہوئی۔ پورے گھر میں دال کے تڑکے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے حساب لگایا۔ شاید دسواں دن جا رہا تھا کہ گھر میں تواتر سے دال پک رہی تھی۔ اس نے خوشبو کو اپنے اندر اتارا اور سوچا کہ اگر دال میں تڑکا نہ ہوتا تو دال کیسے کھائی جا سکتی تھی۔ لیکن شاید میں ہی غلط سوچ رہی ہوں۔ زندگی بھی تو روزانہ کی دال کی طرح پھیکی اور بے مزہ ہے۔ اور کہیں خوشیوں کا ہلکا سا تڑکا بھی نہیں۔ پھر بھی تو گزاری جا رہی ہے۔

"امی! آپ کی کچھ مدد کروں۔" اس نے کچن میں جھانکا۔

"نہیں۔ تم کب آئیں۔ زنیشہ کے ساتھ گئی تھیں نا۔"

"جی!" اس نے مختصراً کہا۔

"منہ دھو کر آؤ تو کھانا کھاؤ۔"

"شام میں بہت کچھ کھا لیا تھا۔ اس وقت بھوک نہیں ہے۔" اس نے مری مری آواز میں کہا۔ اس نے آئینے میں اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ سارا دن دھوپ میں پھر پھر کر جلد کا ستیاناس ہو گیا تھا۔ اس نے عرق گلاب نکال کر چہرے پر لگایا۔ یہی اس کا موئسچرائزنگ تھا۔ یہی اس کی کریم۔ شکر تو یہ تھا کہ اتنی چھوٹی سی بھی چیز سے جیسے اس کی اسکن جیسے چمکنے لگتی تھی۔ صورت تو اس کی کسی سے کم نہیں تھی۔
پر مقدر؟ اس کے راستے گم شدہ تھے۔

* * *

وہ آنکھیں بند کیے زور و شور سے نوٹس رٹنے میں مصروف تھی۔ جب اچانک کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ دروازے میں کھڑے سامنے کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ اس کے علم میں تین چار بار ہی رہا ہو گا کہ وہ اس طرح ان کے پورشن میں آیا ہو۔ راد میر کے ہاتھ میں دو تین شاپرز تھے۔ وہ اس نے تپائی پر رکھ دیے۔

"یہ کیا ہے؟"

"دیکھ لینا۔" اس نے لاپروائی سے کہا "اور مجھے چائے پلوا دو اچھی سی۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ سے ماتھے کو دبایا۔ اصولاً "تو اسے فوراً" دور جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

"نہیں کیا ہو گیا ہے۔ ایک چائے بنانا۔ کیا بہت بھاری کام بتا دیا ہے؟" اس نے منال کے سر پر چپت ماری۔

"نہیں۔ وہ احسان بہت بھاری ہو گیا ہے۔ جس کا بوجھ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔" اس نے رک کر آہستہ سے کہا۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہے۔" راد میر نے اسے خفگی سے گھورا۔

"تم ہم دونوں کی دوست بھی ہو۔ کل مجھے اچھا نہیں لگا تھا کہ اس پاگل نے تمہارے لیے کچھ بھی نہیں لیا اور مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ اس نے تو ضرور پوچھا ہو گا۔ تم ہی بے وقوف ہو۔ ہر بات میں انکار۔"

منال چپ چاپ اسے دیکھتی رہ گئی۔ ایسے ہی تو کوئی اچھا نہیں لگتا۔ کسی میں کوئی خاص چیز ہوتی ہے۔ بالکل الگ سی۔ بہت دفعہ وہ سوچتی تھی۔ کہیں یہ بے ایمانی نہ ہو۔ لیکن بے ایمانی تو جان بوجھ کر ہوتی ہے۔

محبت کے راستوں میں تو ہر چیز غیر ارادی ہوتی ہے
محبت کی ابتدا سے لے کر انتہا تک۔

اس وقت بغیر دیکھے بھی جان چکی تھی کہ ان شاپرز میں بہت ساری ایسی چیزیں ہوں گی جن کی اسے ضرورت تھی اور وہ اس کے لیے ایک سال کے لیے تو کافی ہوں گی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"لڑکی! میں دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں کھڑے کھڑے سوچنے کی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔ چلو ادھر ہم لوگوں کی طرف آجاؤ۔ کوئی نہ کوئی پروگرام ضرور ہی بن رہا ہو گا۔ تھوڑا چینج ہو جائے گا۔"

"نہیں۔ مجھے کچھ اسائنمنٹ بنانے ہیں۔ ابھی نہیں آسکوں گی۔" اس نے سہولت سے انکار کیا۔

☆ ☆ ☆

"سنال! تم نے سمسٹر فیس تو نہیں بھری ہو گی۔" امی نے کام کرتے کرتے رک کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"نہیں۔" اس نے نظریں چرائیں۔ "ٹیوشن کے بچے بھی کافی کم ہو گئے تھے۔ بجر ایسے میں فیس کس طرح جمع ہوتی۔ لو گویا چار مہینے بے کار چلے گئے۔ کوئی بات نہیں امی! کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔"

اس نے تسلی دی۔

"تم اگر یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں جاب کی اجازت دوں گی۔ تو یہ بھوت اپنے دماغ سے نکال دو۔" ان کے لہجے میں غصہ تھا۔ "رشتہ آئے کوئی تو تم بھی اپنے گھر کی ہو جاؤ۔"

"بس 'یہ چڑچڑی' زہر لگتا ہے مجھے یہ جملہ۔ ابھی میری شادی کا کوئی ذکر نہیں چھیڑے گا۔"

"کوئی تمہاری بات سن لے تو وہ یہی سمجھے کہ ہزاروں رشتے آئے ہوئے ہیں اور ان میں سے تمہیں کوئی پسند نہیں آرہا ہے۔" وہ بیزار ہو کر اس کے پاس سے اٹھ گئیں۔ تو وہ بھی کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی۔

یہ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ جس سے وہ کبھی نہیں تھکتی تھی۔ آسمان اندھیرا۔

چاند کی ٹھنڈی سفید روشنی اور ایسی پیاری پیاری چیزوں کے درمیان سارے زمانے کی گھٹیا اور فضول سوچیں جن کے سوچنے سے صرف سر میں درد ہی ہوتا تھا۔ لیکن ان سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا تھا۔

بڑے ماموں کے پورشن میں اس وقت بھی کافی گہما گہمی تھی۔ پتا نہیں ان سب لوگوں کا شمار الوؤں کے کون سے قبیلے سے تھا۔ دنیا کے سارے کام رات میں ہوتے تھے۔ خاص طور پر زنیش وہ تو بالکل اپنے موڈ کی تابع لڑکی تھی۔ جس وقت جو دل میں آگیا۔ وہ کام اسی وقت سرانجام دینا ہے۔

☆ ☆ ☆

اس کے پورے کمرے میں سوٹ بکھرے ہوئے تھے۔ ہر ڈیزائن کے ہر کلر کے۔ پتا نہیں ان سب کی شامت کیوں آئی تھی۔ سنال نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سوچا۔

"زنیش! تم نے بلایا تھا۔" اس نے بیڈ پر جگہ بنائی۔

"ہاں۔ آج فاریہ کی سالگرہ ہے۔ تم بتاؤ کون سا سوٹ پہنوں تاکہ سب سے اچھی، سب سے مختلف بس میں ہی لگوں۔"

"تم کچھ بھی پہن لو گی۔ سب اچھا لگے گا۔" اس نے سادگی سے کہا۔ زنیش نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"تم بھی چلنا فاریہ کی سالگرہ میں۔" زنیش نے سرسری سے کہا۔

"میں... نہیں۔" وہ ایک دم بدک گئی۔ "میں نہیں جاؤں گی۔"

زنیش اس کی شکل دیکھ کر ہنسنے لگی۔

"تم نے تو لیپاری ایکشن دکھایا ہے۔ جیسے میں تمہیں ڈسکو پارٹی میں لے کر جا رہی ہوں۔ ویسے یہ بھی اچھی جگہ ایک زبردست جوک رہے گا۔ چلو اس پر بھی ورکنگ کریں گے۔"

"نہیں پلیز۔ اس سے اچھا تو میں تمہارے ساتھ فاریہ کی برتھ ڈے پر چلی جاتی ہوں۔" بوکھلاہٹ میں اس کے منہ سے بے ربط جملے نکلے۔

"اچھا خیر چھوڑو یہ بیگ تمہارے لیے۔" اس نے الماری کے نچلے خانے سے خوب صورت سا بیگ

نکالا۔ وہ نیا جلب تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے زمیش۔ تم خود درگزر کرنا۔ چیزوں کو اس طرح برباد نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہ ریسٹ کلر مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔"

منال نے خاموشی سے تھام لیا۔

پہلی کی طرف سے تو کم از کم دو سالوں کی چھٹی ہوئی۔ پہلے راہ میر پھر زمیش۔ دونوں نے ہی الٹ چیزیں رکھا تھیں۔ ایک کے رویے میں خلوص اور دردمندی تھی اور دوسرے کی اپنی ذاتی پسند ناپسند تھی۔

"خیر۔" اس نے سر جھٹکا "انسانوں کا تجزیہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہر ایک کی اپنی فطرت ہوتی ہے۔"

"تو پھر کیا ہے نا۔ تم چل رہی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

اسی وقت بڑی مامی نے کمرے میں قدم رکھا۔

"دیکھو بھئی منال! تم ذرا اپنی دوست کو سمجھاؤ۔" بڑی مامی نے اس طرح کہا گویا زمیش ہر کام اس سے پوچھ کر کرتی ہو اس نے سوالیہ نظروں مامی کی طرف دیکھا۔

"دیکھو اب یہ تمہارا اتنا خیال رکھتی ہے تو تمہارا بھی تو کوئی فرض بنتا ہے نا۔" انہوں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے بیگ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نتھنے میں اسے دونوں باتوں پر اعتراض تھا۔ لیکن وہ خاموش رہی۔

"بس بہت اس نے اپنی مرضی چلا لی۔ اب اس سے کہو شادی کے لیے تیار ہو جائے۔ اب اس گھر میں بھی ہنگامے ہوں، رونقیں لگیں اور زمیش کے بچوں کی رونق ہے۔"

بڑی مامی بھی پوری فلم تھیں۔ منال کو ہنسی آئی۔ کہاں تو وہ ابھی شادی کے لیے راضی نہیں تھی اور انہوں نے اس کے بچوں تک کے خواب دیکھ لیے تھے۔ لیکن پھر اس کی ہنسی ایک دم رک گئی۔ وہ کیسے کسی کے خوابوں کا مذاق اڑا سکتی تھی۔ خوابوں پر کس کا اختیار ہوتا ہے۔ وہ تو خود ہی دل میں کنڈلی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نہ کھلتے ہیں اور نہ ختم ہوتے ہیں۔

شام کو زمیش کا موڈ خوشگوار دیکھ کر اس نے بڑی مامی والا پیغام اسے سنا دیا۔ جسے اس نے ادائے بے نیازی سے جھٹک بھی دیا۔

"مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔"

"لیکن راہ میر اب بے حد منتظر ہے۔ تو بلاوجہ ہی کیوں ٹائم ویسٹ کیا جائے۔"

"کوئی ٹائم ویسٹ نہیں۔ ابھی تو صحیح وقت ہے انجوائے کرنے کا۔ پھر کہاں یہ سب کچھ ہو گا اور میں تو ہرگز ایک سیدھی سادی زندگی گزار کر نہیں مرنا چاہتی۔"

"اگر سیدھی سادی گزارنا نہیں چاہتی ہو تو ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھ جاؤ۔ پھر زندگی نہ سیدھی رہے گی نہ سادی۔ تم ہمیں پہاڑوں کے بیچ میں آرام کر رہی ہو گی۔" کنزیٰ نے شرارت سے کہا۔ اس کی عادت تھی۔ وہ ایسے ہی مذاق کرتی تھی۔ مگر زمیش کا منہ اور موڈ دونوں ہی بگڑ گئے۔

"میں منال سے بات کر رہی تھی۔"

"بات کرنے کے لیے دونوں فریقین کا بولنا ضروری ہے جبکہ منال بے چاری تو صرف سن رہی ہوتی ہے۔" منال جز بز ہو گئی۔ ہر جھگڑے والی جگہ پر اس کا نام بلاوجہ ہی گھسیٹ لیا جاتا ہے۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی۔" راہ میر گاڑی سے اتر کر سیدھا ان ہی لوگوں کے پاس آ گیا۔ "تم ٹھیک ہو!" اس نے زمیش کے چہرے کی طرف بغور نگاہ ڈالی۔ وہ اس کے ماتھے کی ہر شکن سے آگاہ تھا۔ پتا نہیں اس کا دل محبت کی کس مٹی سے بنا تھا۔ جو ہمیشہ سرسبز ہی رہا کرتی تھی۔ حالانکہ زمیش کا مزاج تو ایسا تھا کہ اسے بہت پہلے ہی بنجر ہو جانا چاہیے تھا۔

"توبہ۔" منال نے ایک دم سر جھٹکا۔ "یہ خیالات کی کون سی فضول قسم ہے اور کہاں سے آئی ہے۔"

اس نے خود اپنے آپ کو ڈانٹا۔

"اور کیا ہو رہا ہے منال!" زمیش کی طرف سے کوئی

جواب نہ پاکر راد میران کی طرف متوجہ ہوا۔

"کچھ نہیں۔" وہ ایک دم بوکھلا گئی۔ اس کے اس طرح بوکھلانے پر راہ میر نے اسے بغور دیکھا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ کہا کچھ نہیں۔ ورنہ وہ کیا بتاتی کہ اسے لوگوں کی اچھائیوں پر بھی اعتراض رہنے لگا ہے۔

☆ ☆ ☆

"زینش! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے منمناتے ہوئے کہا۔

"کیوں تمہیں کوئی کچھ کہہ رہا ہے۔" زینش نے اسے گھورا "ہم تنہے بہت سارے لوگ ہیں۔"

"تمہاری دوست کی تقریب تھی تم بلاوجہ ہی مجھے لے آئیں۔" اس نے کہہ تو دیا۔ بس اسے زینش کی نیت کی خبر نہیں تھی۔ وہ کیا جان سکتی تھی کہ وہ اسے اپنے ساتھ کیوں گھسیٹے پھرتی ہے۔ وہ اس تکلیف کا بھی نہیں سوچتی ہے۔ جو اسے اٹھانی پڑ جاتی ہے۔ اس کے پاس ایسی محفلوں میں جانے کے لیے نہ ڈھنگ کا سوٹ ہوتا ہے نہ ہی اس طرح کے کوئی دوسرے لوازمات اسے تو بس ایسا لگتا کہ چوروں کی طرح منہ چھپانا پڑ جاتا تھا اور دوسری بات یہ بھی پتا چل گئی تھی کہ افسانوں فلموں میں جو یہ سب کچھ دکھاتے ہیں۔ وہ سب بکواس ہوتا ہے۔ ایسا کہیں نہیں ہوتا کہ جو شخص اس گیدرنگ کا ہیرو ہو۔ اسے ہمیشہ ہی غریب اور مسکین سی نظر آنے والی لڑکی ایک دم سے پسند آجائے۔

بہرکیف ابھی اس کی زندگی میں ہیرو تو کیا کوئی ولن بھی نہیں تھا اور دیکھا جائے تو اسے ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایک ہیرو جیسا شخص اس کی زندگی میں موجود تھا اور اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ اس کے لیے نہیں تھا۔ اچھے لوگ تو روشنی کی طرح ہوتے ہیں۔ سب ہی کے حصے میں تھوڑا بہت اجالا آہی جاتا ہے۔ وہ اسی طرح کی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہی۔ جب اچانک ہی کوئی کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ہیلو مس!"

"جی۔" وہ ایک دم گڑبڑا گئی۔ سر گھما کر دیکھا تو زینش بھی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ کرتی تو وہ اسی طرح تھی لیکن غصہ آج اسے پہلی دفعہ زیادہ آیا۔ نہ جانے کون ہے۔ جو اس طرح آکر سر پر سوار ہو گیا ہے۔ کہنیاں میز پر ٹکا کر وہ اس طرح آگے ہو کر بیٹھا تھا۔ جیسے آیا ہے کسی جرم کی تفتیش کرنی تھی۔ اس نے میز پر رکھے شیشے کے گلدان کو دیکھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا۔ اس کی حرکت پر ایک دم ہنس پڑا۔

"میرا خیال ہے... یہاں پر جتنے لوگ بھی موجود ہیں' آپ ان سب سے زیادہ معصوم ہیں۔" آنے والے نے تو سادہ لہجے میں اس کی تعریف ہی کی تھی۔ لیکن اس کا چہرہ ایک دم لال سرخ ہو گیا۔

"آپ زینش کی کون ہیں؟" اس نے ایک دم پوچھ لیا۔

"زینش سے پوچھ لیں۔" اس نے چڑ چڑے پن سے کہا۔

"آپ سے کیوں نہ پوچھوں؟"

"اس لیے کہ میں آپ کو جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔"

"بات تو صحیح ہے۔" وہ ایک دم کھل کر مسکرایا اور بالکل اسی وقت منال پر انکشاف ہوا کہ وہ کافی سے زیادہ خوب صورت شخص تھا اور شاید بہت زیادہ دولت مند بھی۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ یا اللہ زینش کہاں چلی گئی ہے آئندہ اس کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی اس نے دل ہی دل میں پکا ارادہ باندھ لیا۔

اسی وقت زینش ہنستی کھلکھلاتی نہ جانے کہاں سے آگئی۔

"ہائے" اس کا خوب صورت چہرہ سنہری بالوں کے بیچ میں دمک رہا تھا۔ وہاں پر بھی ساری روشنیوں کی تاب ایک طرف اور اس کے چہرے سے پھوٹتی روشنی ایک طرف۔ اللہ نے اس کو کتنی فرصت میں بنایا تھا۔

وہ یک ٹک مبہوت سی اسے دیکھے گئی۔ اس نے آج تیاری بھی تو بہت کی تھی۔ اسے منفرد نظر آنے کا خبط تھا۔

اس کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی آنکھوں میں بھی بہت سی حیرت اور اس سے زیادہ ستائش کا جذبہ تھا۔

"زیجش! تم بہت زیادہ چینج نہیں ہو گئی ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ چینج کی جگہ تم کچھ اور بھی بول سکتے تھے۔ لیکن پھر پتا کیسے چلے گا کہ آپ نواب خاندان کے چشم و چراغ جناب جہان شاہ ہیں۔"

زیجش نے ادھار رکھنا کب سیکھا تھا۔ وہ خفیف سا ہو کر ایک دم ہنس پڑا۔

"تم جانتی ہو نا۔ میں کسی کی تعریف نہیں کر سکتا اور وہ بھی حسن کی۔ ہاں سادگی کی تعریف میں نے ضرور کی ہے۔"

"اچھا ذرا میں بھی تو سنوں۔ اس گیدرنگ میں تمہیں کون سادہ نظر آ گیا۔"

"یہ۔" اس نے ایک دم سامنے بیٹھی منال پر نظر ڈالی۔

"اوہ! اچھا۔" زیجش کی اوہ میں بھی ایک عجب سا رنگ تھا۔ جیسے یہ بات اسے اچھی نہ لگی ہو۔ لیکن وہاں پر اس کا کسی پر کیا زور تھا سوائے منال کے اس لیے اس نے فوراً "جانے کا آرڈر نافذ کر دیا۔ وہ ابھی بھی تھی۔ بل میں ٹولہ بل میں ماشہ والی۔ اس نے شکر کرتے ہوئے جانے کو قدم بڑھائے۔

"آپ سے دوبارہ ملاقات ہو سکتی ہے؟" جہان شاہ کی آنکھیں بڑی چمکدار اور صاف و شفاف تھیں۔

زیجش نے ایک نظر میں ساری صورت حال کا جائزہ لیا۔ اور ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"یہ کہیں آتی جاتی نہیں۔ آج بھی میں اسے زبردستی لے کر آئی تھی۔"

پھر وہ پورے راستے خاموش ہی رہی۔ بلکہ ایک طرح سے اس سے ناراض۔ وجہ نامعلوم۔ وہ اپنے ہی طرز کی تھی۔ اپنے ہی کہے اور سنے کو صحیح سمجھنے والی اور منال کے پاس سے کوئی خاص نہیں۔

"کیا باتیں کر رہے تھے تم لوگ۔" بہت دیر بعد اس نے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں۔"

"تم جانتی ہو منال! ہمارے سرکل میں جہان شاہ کو کن لفظوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ خیر تمہیں اس سے کیا مطلب ہو گا۔ اور آج مجھے احساس ہوا ہے کہ میں تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کر جاتی ہوں۔ تمہیں ایسے فنکشن میں بالکل مزا نہیں آتا ہے نا اور میں تمہیں زبردستی لے آتی ہوں۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

آج بہت ساری مختلف سمتوں کی باتیں تھیں۔ جنہیں زیجش نے دو لفظوں میں سمیٹ دیا اور منال نہ اس کی بات سمجھ پائی۔ نہ اس کی نسبت اور نہ اس کے پاس اتنا فالتو دماغ تھا۔ جو فالتو باتوں میں لگاتی۔

ان سب چیزوں کا اثر دوسرے دن ہوا۔ رات بہت دیر تک ٹھنڈی ہوا میں رہنے کی وجہ سے دوسرے دن اسے بخار نے جکڑ لیا۔ سر بھاری ہو رہا تھا اور جکڑ اور اندر کہیں شرمساری بھی تھی۔ وہ مستقل اپنی ماں کو پریشان کر رہی تھی نہ چاہتے ہوئے بھی۔ پہلے وہ اس کی سسٹر نفیس کی وجہ سے پریشان رہیں۔ پھر اپنی بیماری لے بیٹھیں اور اب دو دن تک کڑوے کڑوے جوشاندے پینے پڑ جائیں گے۔ بیماری سے زیادہ تکلیف اسے جوشاندے پینے سے ہوتی تھی اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر سامنے پڑے ہوئے مگ کو دیکھا۔ جوشاندے کی براؤن تہہ پر ہلکی سی نیلی بھی آ گئی تھی۔

"اف!" اس نے آنکھیں بند کر کے مگ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن مگ اپنی جگہ سے غائب ہو گیا تھا۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو سامنے بیٹھے راہ میر پر نظر گئی۔ کپ اس کے ہاتھوں میں تھا۔

"جب تمہیں پسند نہیں ہے تو کیوں پی رہی ہو۔ جب یقین نہ ہو تو بندہ صحیح بھی نہیں ہوتا۔"

"اب جوشاندے کو کیا پتا کہ میں نے یقین سے پیا یا بے یقینی سے۔" اس نے منہ بسور کر کہا۔

"اف وہ!" راہ میر نے کلائی موڑ کر گھڑی دیکھتے ہوئے

کرلائے میرے پاس تو اتنا فالتو دماغ نہیں کہ تمہیں یہ بات سمجھاؤں۔ لیکن ابھی ڈاکٹر کے پاس چلو۔ آج کل بخار اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہو رہے ہیں۔"

"بس مجھے یقین ہے جو شاید دوا لی لوں گی۔ تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔" اس کے سادہ لہجے میں معصومیت تھی۔ راہ میر بے اختیار ہی ہنس پڑا۔

"اٹھ جاؤ منال! میں نے آنٹی سے پوچھ لیا ہے۔ تم کیوں ضد کی ہو رہی ہو۔" وہ بات کرتے کرتے ناراض ہونے لگا۔

"مجھ سے ناراض ہو۔" منال نے دل میں سوچا۔ اس پر کیا لازم ہے کہ وہ راہ میر کی ہر بات مانے۔ اس کو تو عادت ہے۔ سب کا خیال رکھنے کی۔ سب کے کام آنے کی۔ لیکن کوئی اس کی طرح احسان کا طوق گلے میں نہیں ڈال لیتا۔ باؤں کی زنجیر نہیں بنا لیتا اور دل کو کسی موضوع پر بے مہر بھی بن جانا چاہیے۔ اس نے سر جھکائے جھکائے کتنی ہی باتیں سوچ لیں۔ حتیٰ کہ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی کمرے میں اس کی دوائیاں اور دودھ لے کر آ گئیں۔ اور خاموشی سے کوئی پرچی اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے کھول کر دیکھا۔

بینک اسٹیٹمنٹ تھی۔ اس کی سمسٹر فیس جمع ہو گئی تھی۔ کمرے میں موجود ساری چیزیں وہ لے کر آیا تھا۔ منال کے آنسو اندر ہی اندر گرنے لگے۔

کیا اب بھی دل کو بے مروت بنانا چاہیے تھا۔

☼ ☼ ☼

بڑے ماموں تھوڑے سخت تھے۔ وہ کہیں جانے کو منع تو نہیں کرتے تھے۔ لیکن کہتے تھے کہ اکیلے نہیں جایا کرو اور زینش کے ساتھ منال ہی لگی تھی۔ ہر چیز کے لیے۔ ہر بات کے لیے۔ اسے ضروری پڑھنا ہوتا۔ اگلے دن اس کی پریزنٹیشن ہوتی یا اسائنمنٹ اسے سارے کام چھوڑ کر زینش کا ساتھ دینا ہوتا اور کوئی اس سے پوچھ لیتا کہ کیوں؟ تو وہ جواب بھی نہیں دے سکتی تھی۔ لیکن اس کا جواب وہ خود اچھی طرح جانتی تھی۔

واہ میر کو زینش کی ... زندگی کے کسی ایک مسئلہ بھی اسے پریشان کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ پھر واہ میر کو بھی منال ہی نظر آئی تھی۔

اور منال کو اس کے چہرے کا شرمندہ سا تاثر اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے بغیر کہے ہی بچھر زینش کے غم اپنے ذمے لے لیے۔

احسان اتارا جائے کسی طرح کسی طور سہی۔ وہ تو اپنے احساس کے ہاتھوں بندھی ہوئی تھی۔ لیکن زینش نے تو اسے باقی بے دام غلام ہی سمجھ لیا تھا اور زینش کی عادت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ اب وہ کوئی بھی بات اس سے پوچھتی نہیں تھی۔ صرف حکم صادر کرتی تھی اور نہ جانے یہ سلسلہ کب تک چلنا تھا۔

منال نے اپنے دکھتے سر کو دبایا۔ آج جو کچھ ہوا تھا وہ بہت عجیب تھا۔ اس نے زینش کی آنکھوں میں کچھ دیکھا تھا اور وہ اس رنگ کو بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔ کیونکہ یہ اس کی اپنی آنکھوں کا رنگ بھی تھا۔

کوئی حسرت سی کوئی خواہش سی مگر کیوں؟ اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔ جن کے پاس سب کچھ موجود ہو۔ پھر ان کی آنکھوں کا یہ رنگ کس لیے۔ وہ زینش پر کبھی بھی رشک نہیں کرتی تھی۔ سوائے ایک واہ میر کا حوالہ چھوڑ کر۔ وہ واہ میر کی عزت کرتی تھی اور دعا کرتی تھی کہ اسے کبھی کوئی دکھ نہ ملے۔

اس وقت بھی واہ میر کراچی میں نہیں تھا۔ کسی فلاحی تنظیم کی فنڈ ریزنگ کے سلسلے میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ وہ اتنا مصروف رہتا تھا۔ مگر پھر بھی گھر کے ہر فرد کے متعلق باخبر رہتا تھا کسی کو آکشف ہوا کوئی پریشانی بس اسی کا نام ذہن میں آتا تھا اور وہ ذہن میں نام آتے آتے دل میں کب آیا۔ اس کی خبر اسے نہیں ہو سکی اور ایسے لوگوں سے انسان محبت نہ کرے تو کیا کرے اور یہ وہ چیز تھی۔ جو اندر بہت اندر کہیں دل کی گہرائیوں میں تھی۔

اور جس کی خبر خود کو بھی بہت مشکل سے ہوتی

تھی۔

اس کا دماغ خراب ہوا تھا۔ مگر اس کی تربیت ...لمحے بھی اس نے ایک سیکنڈ کو بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اسے واہ میر مل جائے محبت کے باب میں پایا کہیں بھی نہیں تھا ہاں وہ واہ میر کے لیے ضرور دعا کرتی تھی کہ وہ جس سے محبت کرتا ہے وہ اسے مل جائے کیونکہ زینش کے مزاج کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔

منال کو یاد تھا۔ اس نے ایک دفعہ عجیب سا جملہ کہا تھا اور وہ جیسے دل میں اس کے کھب گیا تھا کہ "وہ حسین صورتوں سے تو سب ہی محبت کرتے ہیں اور اگر واہ میر بھی کرتا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے۔" حالانکہ۔ اس محبت کے بہت سے فائدے وہ اٹھا بھی لیتی تھی۔ زندگی کے بہت سارے مشکل موڑ پر وہ اس کے کام آتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ زینش سے بات کرے گی۔

تین دن تک اس نے خود ہی ہمت باندھی اور خود ہی توڑ دی اور بالآخر وہ خود چڑ بھی گئی۔ آخر ایسی بھی کیا مصیبت تھی۔ فضول کی گھبراہٹ۔

وہ کمرے کی گھٹن سے گھبرا کر باہر لان میں آ گئی۔ نیم ملگجا اندھیرا چاروں طرف چھا رہا تھا اور ایسے میں اس کی نظر بینچ پر بیٹھی زینش کے چہرے پر پڑی تو وہ دھک سے رہ گئی۔ وہ بیمار اور پژمردہ سی لگ رہی تھی اور اس وقت بھی اس کی آنکھیں خلا میں نہ جانے کہاں مرکوز تھیں۔ منال کے پاؤں گھاس میں جیسے دھنس سے گئے۔

جن کے پاس دنیا کی ہر نعمت موجود ہو۔ ان کے چہرے ایسے کیسے ہو جاتے ہیں۔ اس نے پہلے بھی یہ باتیں سوچی تھیں اور آج دوبارہ سوچ رہی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو زینش؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں مجھے کیا ہوا؟"

جتنے بل اس کے ماتھے پر تھے اتنے ہی اس کے لہجے میں... منال چپ رہ گئی۔ ایسے لوگوں سے کیسے بات کی جائے جو اپنا کوئی نشان نہ دیتے ہوں۔ لیکن پھر اس کے سامنے واہ میر کا چہرہ آ گیا۔ وہ ان دنوں کتنا پریشان تھا نہ اس کے چہرے کی اداسی چھپی تھی نہ

آنکھوں کی اور یہ سب کچھ زینش کی وجہ سے تھا۔ وہ بے خبری نہیں، بے دردی بھی بن گئی تھی۔

پتا نہیں لوگ اس طرح کیسے کرلیتے ہیں۔ جن سے آپ کے خصوصی رشتے بنتے ہوں۔ ان ہی سے لہجہ بے رخی برتنا اس کی خاموشی سے تنگ آکر وہ کھڑی ہوئی۔ تو زینش نے ہاتھ کے اشارے سے اسے واپس بٹھادیا۔ یہ ایک شاہی اشارہ تھا۔ لیکن اسے بیٹھنا پڑا۔

"تم نے جہاں شاہ سے ملاقات کی تھی نا۔"

"ملاقات؟" وہ بھونچکا رہ گئی "اسے ملاقات کہتے ہیں۔ تم دو منٹ کے لیے اٹھ کر گئیں اور وہ حضرت میرے سر پر سوار ہوگئے۔"

"بے خبری بھی بڑی نعمت ہے۔ تم جانتی نہیں منال کہ جس کو تم سر پر سوار ہونا کہہ رہی ہو۔ لوگ اس سے دو منٹ بات کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔"

"رہتے ہوں گے مجھے اس سے کیا۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"ہاں۔ ٹھیک بات ہے تمہیں اس سے کیا۔ جب مقدر لکھے جارہے تھے۔ تمہارا مقدر فرشتوں نے سنہری حرفوں سے لکھ دیا تھا۔ اس لیے واقعی تمہیں اس سے کیا؟" منال کو ڈر لگنے لگا۔ وہ پاگل ہوگئی تھی یا اسے بنا رہی تھی۔

شام کے گہرے ہوتے سائے اور اس پر زینش کا جملہ۔ کیا اس پر کسی آسیب نے قبضہ کرلیا تھا۔ جو وہ ایسی بہکی بہکی باتیں کررہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے زینش کے چہرے پر نگاہ کی اس کا حسین چہرہ پرسکون تھا۔ لیکن آنکھوں میں جنون یا دیوانگی کی کوئی لہر سی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے چہرے کا پورا تاثر تبدیل ہوگیا تھا۔ کوئی سرد سی لہر منال کے اندر دوڑی یک دم اس نے جانے کو قدم بڑھائے۔ لیکن زینش نے اسے بٹھالیا۔

"بیٹھ جاؤ منال! تمہاری طرف بڑے حساب نکلتے ہیں۔"

حالانکہ حساب تو ان کا نکلنا چاہیے۔ جو برابری کی سطح پر کھڑے ہوں۔ ان کے درمیان کون سی چیز مشترک تھی۔ یہ ساری باتیں اس نے سوچیں۔ لیکن کہا کچھ نہیں اسے لگا کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اس کی کسی کوئی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔

اور سن تو وہ اس کا حساب کتاب بھی نہیں سکی۔ جب اس کو بلانے کے لیے آگئی تھی۔

"منال! تمہیں بڑے ماموں بلا رہے ہیں۔"

اس حکم کے بعد تو وہ رک ہی نہیں سکتی تھی۔ بڑے ماموں بہت کم کسی بات کے لیے اسے بلاتے تھے اور جو کچھ بھی وہ کہتے تھے۔ پھر اس پر فوری عمل کرنا ہوتا تھا۔ وہ بڑے کمرے سے نکلنے لگی۔ تو اس کی نظر راہ میر پر گئی۔ آج بھی وہ پریشان تھا۔ منال کو دکھ ہوا جو لوگ دوسروں کو ذرا سی بھی تکلیف نہیں دیتے۔ پھر ان ہی کے ساتھ ایسا کیوں ہوجاتا ہے۔ اس کا دل چاہا۔ وہ اس آدمی کے پاس رک کر دو لفظ تسلی کے دے دے۔ لیکن وہ سر جھکائے اس کے پاس سے گزرتی چلی گئی۔ محبت کرنے والوں کی تکلیف کو کوئی بھی کم نہیں کرسکتا۔ اور اس کے پاس تھا بھی کیا۔

وہ بڑے ماموں کے پاس پہنچی تو وہ بھی پریشان تھے زینش وہ طوطا تھی۔ جس میں سب ہی جان تھی اور وہ تو خیر اکلوتی بھی تھی اور جو اکلوتے ہوتے ہیں۔ ان پر بہت ساری چیزیں یوں بھی معاف ہوتی ہیں۔

"تم تو دوست ہو بیٹا! پوچھو تو اسے ہوا کیا ہے۔"

بڑے ماموں بڑی اچھی پوسٹ پر تھے۔ ان سے ملنے کے لیے اپائنٹمنٹ لینا پڑتا تھا اور منال دیکھ رہی تھی کہ وہ آدھے گھنٹے سے مسلسل ٹہل رہے تھے۔ وہ بہت پریشان تھے۔

منال نے دل میں سوچا۔ وہ بھی خود کو تھوڑی دیر پہلے تک — اس کے دوستوں میں ہی شمار کرتی تھی۔ مگر جو بات اس نے کی تھی۔ وہ تو دشمنوں والی تھی۔

اس کے کانوں میں دوبارہ سے زینش کی آواز گونجی۔ سرسراتی ہوئی پھنکتی ہوئی آواز۔ اس نے خوف زدہ ہو کر ایک دم سر جھٹکا۔

وہ واپس اپنے پورشن کی طرف پہنچی۔ تو اس کے

قدم جھجکے جھجکے سے تھے۔ اب الگ رہا تھا۔ دل دنیا کی ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا ہے۔ اسے دل کی اس کیفیت سے سب سے زیادہ ڈر لگا کرتا تھا۔ اور اب اسی کیفیت نے سرتاپا اسے گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ سر جھکائے نہ جانے کب تک بیٹھی رہتی۔ جب امی کمرے میں داخل ہو گئیں۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" وہ غصہ ہونے لگیں۔

"نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہو۔ کچھ گھر کا بھی خیال نہیں رہا۔ حالانکہ اسی گھر کے پیچھے جان مار دیتی تھیں۔" ان کی بات پر اس نے خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ امی صحیح کہہ رہی تھیں۔

اسے اپنا یہ دو کمروں والا پورشن بھی بڑا عزیز تھا۔ جتنا بھی وقت اس کے پاس ہوتا۔ اس کو سجانے سنوارنے میں گزار دیتی تھی۔ اسے افسوس ہوا۔ کیا وہ اتنی بے خبر ہو گئی تھی۔ کاش زندگی میں سچ مچ ایسا ہو کہ انسان اپنے سارے غم، ساری فکریں، پریشانی کسی گٹھڑی میں باندھ کر کہیں پھینک آتا۔ دفن کر دیتا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں الٹا حالات خود انسان کو دفن کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔

اس دن اس نے بہت کام کیے۔ گھر بالکل نکھر کر چمکنے لگا۔ اب وہ دوبارہ سے اس کا وہی گھر بن گیا تھا۔ سجا ہوا اور خوشبو سے مہکتا ہوا۔ اس کی ساری بچت ان پھولوں پر ہی خرچ ہو جاتی تھی۔ اس کے پھولوں کے جنون سے سب ہی آگاہ تھے۔

راہ میر نے بہت مہنگے گملے لا کر دیے تھے اور وہ کافی مہنگے پودے ہوئے تھے۔ جن کے نام بھی اسے نہیں آتے تھے۔

پتا نہیں کیسے یہ ہوا کہ پچھلے پندرہ دنوں میں سب کچھ ہی اس کے دماغ سے نکل گیا تھا۔ اور ایسا اس لیے ہوا تھا کہ زینش کا مزاج کسی کو سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اور زینش کی وجہ سے راہ میر پریشان تھا اور راہ میر کی وجہ سے وہ محبت کی عجیب مثلث تھی نہ سمجھنے والی نہ سمجھانے والی اور اب پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے اپنی پڑھائی شروع نہیں کی۔" راہ میر کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

"میں شروع کرنا چاہتی ہوں۔ مگر کوئی چیز شروع ہی نہیں ہو پائی ہے۔" اس نے بے تکا سا جواب دیا۔ راہ میر نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ تھکی ہوئی بھی تھی اور کچھ پریشان بھی۔

"کوئی مسئلہ ہے تو بتا سکتی ہو۔" بہت سارے راستوں پر بھٹکنے کے بجائے اس نے سیدھا سا سوال کر دیا۔

مسئلہ تو تھا مگر شاید بتانے والا نہیں تھا۔ اس لیے وہ خاموش رہی۔

وہ ضدی بھی نہیں تھی اور راہ میر کی کوئی بات تو وہ یوں بھی نہیں ٹالتی تھی۔ اور سب لتنے اچھے لوگ پھر پتا نہیں۔ ایسی لڑکیوں کو کیوں پسند کر لیتے ہیں۔ جن کے سینوں میں دل نہیں پتھر ہوتا ہے۔ وہ سوچتی رہی اور الجھتی رہی۔ حالانکہ دونوں چیزیں بے فائدہ تھیں۔

"تم اگر اپنے آپ سے لڑنا چھوڑ دو تو یہ واقعی تمہارے لیے بہت اچھا ہو گا۔" اس کا لہجہ اب بھی دوستانہ تھا اور اس جملے کی تہہ میں موجود خلوص کی رمق کو بھی وہ جان سکتی تھی۔ اس کے دل پر جیسے بہت سارے بوجھ آگرے اور بلاوجہ آنکھوں میں آنسو۔

"کیا ہو گیا ہے منال۔" وہ اس کے پاس گھٹنوں کے بل جھکا۔ اس کا لہجہ تھا اور اس کے آنسو۔ کبھی کبھی ہر چیز پر سے اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ دل پر سے پہلے اور حالات پر سے بعد میں۔ خیر کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن اس وقت جو ہوا۔ وہ اچھا نہیں ہوا۔ اب اسے راہ میر کو بتانا ہی تھا۔ کہ زینش نے اس سے کیا کہا ہے۔ اور اس نے سب کچھ راہ میر کو بتا دیا۔ وہ ساری باتیں۔ جن کا بظاہر کوئی سر پیر اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن ضروری نہیں کہ سب لوگ اس کی طرح کوڑھ مغز ہوں اس کی باتیں سن کر بہت دیر تک راہ میر خاموش رہا اور منال کو لگا کہ اس نے سب کچھ دیواروں کو سنایا تھا۔ لیکن راہ میر نے خاموشی توڑ ہی دی۔ وہ اس سے چھوٹے چھوٹے سوالات کرتا رہا۔

"پریشان نہ ہو۔" اس نے منال کا سر تھپکا۔ "اللہ بہتر کرے گا۔"

اور اللہ تو واقعی بہتر کرتا ہے 'یہ تو ہم خود ہوتے ہیں جو حالات سے ڈرے رہتے ہیں۔ جو قسمت سے سہمے رہتے ہیں۔

دوسرے دن زینش وندناتی ہوئی اس کے کمرے میں آگئی۔

"تم سمجھتی کیا ہو خود کو۔" اس کی آنکھوں میں بھی شعلے تھے اور لفظوں میں بھی۔ وہ ایک نظر زینش کو دیکھ کر رہ گئی۔ پتا نہیں اس پر کون سا آسیب آگیا تھا۔ وہ کوئی بات سمجھ کر ہی نہ دے رہی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے۔" اس نے سہولت سے پوچھا اور اس کے بیٹھنے کے لیے کرسی آگے کی۔

"ہٹاؤ یہ کرسی۔" اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے کرسی کو ٹھوکر ماری۔ کرسی پلٹ کر دور جا گری۔ پتا نہیں کیوں منال کو یوں لگا کہ زینش کا بس چلتا تو یہ سلوک کرسی کے ساتھ نہیں بلکہ خود اس کے ساتھ کرتی وہ ایک دم جھرجھری لے کر رہ گئی۔ اسے لوگوں کے انتہا پسندانہ رویے سے خوف آتا تھا۔

"تم نے راہ میر سے میرے متعلق کیا کہا ہے۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں جس سے تم اس قدر غصے میں آجاؤ۔"

"جھوٹ نہیں بولو۔" وہ غرائی" وہ مجھ سے بہت ساری باتوں کی وضاحت مانگ رہا تھا۔ جہان شاد کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ تم نے بتایا ہے یہ سب کچھ۔"

جس حساب کتاب کا اس نے کہا تھا وہ شاید آج کا ہی دن ٹھہرا ہو گا۔ ترازو بھی اسی کے ہاتھ میں تھی اور اس کے اعمال بھی۔ جنہیں وہ ایک ایک کر کے برائی کے پلڑے میں تولتی جا رہی تھی۔

"اس دن صرف تمہاری آدھے گھنٹے کی ملاقات ہوئی تھی نا جہان شاد سے اور اس آدھے گھنٹے کی ملاقات میں تم نے میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔" اس کا لہجہ اب بھی زہریلا ہی تھا۔

لیکن اس وقت کچھ بھی کہنا اسے بے کار لگا تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ نہ سن سکتی تھی۔ اور نہ سمجھ سکتی تھی صرف ایک ہی کام وہ بخوبی انجام دے سکتی تھی۔ سو وہ اسی کام کی انجام دہی میں مصروف تھی۔ یعنی اسے ذلیل کرنے کا کام۔

راہ میر کا کمرہ ہی سب سے پہلے پڑتا تھا اور اب وہ حیران کھڑا صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ ہو کیا رہا ہے۔" اس کا لہجہ سخت تھا اور آواز بلند زینش کی زبان بند ہوئی اور منال کا دل۔ جس وقت سے وہ ڈر رہی تھی۔ وہ وقت آگیا تھا لیکن مرد کو واقعی اللہ نے بڑا معاملہ فہم بنایا ہے۔ اس نے صرف سننے پر اکتفا نہیں کیا۔ زینش کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ اس کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔"

"تمہاری بات نہیں ہے راہ میر۔"

"تم بلاوجہ کسی کو باتیں سناؤ گی۔ تو میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔" منال نے راہ میر کے کہنے پر ایک نظر اسے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ اسے پتا تھا کہ وہ کوئی خاص نہیں تھی۔ راہ میر ہر ایک کے لیے ہی ایسا تھا۔ ہمدرد اور مخلص۔ غلط بات برداشت کرتا ہی نہیں تھا۔ لیکن بات ساری یہ تھی کہ آج اس نے کس کو غلط کہا تھا۔ یا کس کے سامنے کھڑا ہوا تھا اسے ایک دم ڈر لگنے لگا۔ کچھ نہ کچھ غلط ہونے کو تھا یا ہو گیا تھا۔ یہ اسے کون بتاتا۔ وہ تو صرف سب کچھ صحیح ہونے کی دعا ہی کر سکتی تھی۔

"تم میری غلطیاں نہیں نکالو راہ میر!" وہ ایک دم بھڑکی تھی۔ اتنی بڑی بات اس نے برداشت کرنا کب سیکھی تھی۔

"اور نہ اس کو بہت معصوم سمجھو یہ غلطی میں نے ہی کی تھی اور میں نے اس غلطی کی سزا بھی بھگت لی ہے۔"

"تو میں تم سے تین دن سے اور کیا پوچھ رہا ہوں۔ تم کوئی بات بتاتی بھی تو نہیں ہو۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا تم کوئی بھی بات بتاؤ گی۔ میں اس پر یقین صرف اس صورت میں کروں گا۔ جب منال بھی اس کی

تصدیق کرے گی اور اس طرح کسی پر الزام بھی نہیں لگایا کرتے زنیش بی بی۔"

منال نے گہری سانس لی۔ اگر زخم مل رہے تھے تو مرہم بھی تھا۔ لیکن مرہم مداوا نہیں بنتے۔ وہ صرف تکلیف کم کر دیتے ہیں۔ لیکن زنیش جو باتیں کر رہی تھی وہ صرف تکلیف نہیں تھیں۔ وہ صرف زخم نہیں تھے۔ وہ آگ جیسی کوئی چیز تھی۔ آگ جو مرنے جیسی تکلیف دیتی ہے۔

"یہ سامنے کھڑی ہے پوچھو اس سے۔ راہ میر سے یہ جہان شاہ سے ملتی رہی ہے یا نہیں۔ اور ہم لوگ اسے کتنا معصوم اور نیک سمجھتے رہے اور جہان شاہ کہتا ہے کہ مجھے ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی اور میں ایسی ہی لڑکی سے شادی کروں گا۔"

"تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔ آخر تمہارے اس جہان شاہ نے کہیں تو شادی کرنی ہی ہوگی اور منال بہت اچھی ہے اور دوسری بات کی میں گارنٹی دیتا ہوں کہ اس نے اگر جہان شاہ سے ملاقات بھی کی ہو گی تو تمہاری موجودگی میں کی ہو گی۔ تمہیں اچھی طرح پتا ہے منال کا ایسی لڑکی نہیں ہے۔"

"مجھے سب کا پتا ہے۔ سب سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن میں جہان کو کسی اور کو نہیں دے سکتی۔ اور منال تو اس کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہے۔"

منال رونا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اسے رونا ہی تھا۔ اس جیسے قسمت و حالات کے مارے لوگ رو بھی نہیں تو کیا کریں۔ وہ نہ زنیش کی زبان روکنے پر قادر تھی اور نہ ہی اس الزام کو قبول کر سکتی تھی۔ جو زنیش نے اس پر لگایا تھا۔ الزام لگنا بالکل مرنے جیسا ہوتا ہے اور اس میں مرنے کے بعد کون زندہ بچتا ہے۔

اسے دنیا اور دنیا کے اصول سمجھ میں نہیں آتے۔ اگر جہان شاہ کا کچھ بھی جھکاؤ زنیش کے لیے ہوتا تو وہ قابل نخرات نظر آتی جاتی۔ لیکن بالکل وہی چیز اس کے لیے طعنے اور الزام کی طرح بن گئی۔ جبکہ جبکہ سب کو یہ بات پتا تھی اور خود اس کو بھی کہ وہ راہ میر کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اب اس نے

ایک دم سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور ہر بندھن سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ جو لوگ بندھن توڑ دیتے ہیں۔ انہیں احساس نہیں ہوتا کہ انہوں نے کیا چیز توڑ دی ہے۔ بہت دفعہ منال کے آنسو آ گرا جاتے۔ وجہ سے تو بہت دفعہ راہ میر کی شکل دیکھ کر بھی آنسو آ گئے۔

پتا نہیں محبت میں ناکامی زیادہ بڑا دکھ ہے یا بے وفائی۔ وہ سوچتی رہی کہ محبت کی وہی پرانی کہانی ہمیشہ زندہ رہے گی۔ جس میں ایک فریق کے حصے میں دھوکا آتا ہے۔

وہ راہ میر کی شکل دیکھتی تو اپنا غم اسے بھولنے لگتا۔ ہر چیز بہت واضح ہو کر سامنے آ گئی تھی۔ اب کچھ چھپا نہیں رہ گیا تھا۔ بلکہ کچھ بچا بھی نہیں رہ گیا تھا۔

وہ اکلوتی تھی۔ سکہ رائج الوقت کے مطابق اکلوتی اور دولت مند ہونے کے لحاظ سے اس کی خواہش پوری ہوتی تھی۔ بلکہ اس کی ہی خواہش سامنے پتا نہیں کیوں دار پر کھینچا گیا۔ اس نے راہ میر کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔ حالانکہ اس کے پاس تو سچ بتانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ نہ کوئی ہنگامہ آرائی نہ کوئی حاشیہ آرائی اسے تو صحیح یاد بھی نہیں تھا۔ کہ ایک بار دو دفعہ کی ملاقات تھی۔ وہ بھی زبردستی زنیش اسے ساتھ لے گئی تھی۔

اور راہ میر نے ساری بات سننے کے بعد کہا تھا۔

"میں نے تو کوئی بات پوچھی ہی نہیں تھی۔ تمہارا چہرہ آئینہ ہے اور تمہیں کسی کو وضاحت دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ انسان جتنی صفائیاں دیتا ہے اتنی ہی ان کہی کہانی میں اترتا جاتا ہے۔"

وہ پہلے بھی بہت نہیں بولتی تھی۔ اور اب تو جیسے حلق میں بات کرتے ہوئے کانٹے سے اگ آتے۔ ای دن رات اس کی شکل دیکھ کر ہی رو جاتیں۔

پھر کبھی وہ غصہ بھی ہو جاتیں اور غصہ ہونا ان کا حق بھی بنتا تھا۔ اس گھر میں لوگ ہی کتنے تھے۔ صرف دو اور ان میں سے بھی اگر ایک فرد خاموش ہو جائے تو گھر قبرستان جیسے بن جاتے ہیں۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ امی کو کام کرتے دیکھے۔ پہلے بھی وہ ان کے ساتھ

نے زبردستی کام چھین لیتی تھی۔ اور اب وہ چپ چاپ گوتم بدھ کی طرح ایک جگہ بیٹھی رہتی۔ بہت ساری باتیں امی کے کانوں تک بھی آئی تھیں۔ مگر انہوں نے منال سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا انہیں ضرورت ہی نہیں تھی۔ ماؤں کو اپنی بیٹیوں کی ساری باتوں کی خبر ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

بس تھوڑے دنوں کی بات تھی۔ پھر اس کی چپ نے اس سارے قصے کو دھندلا دیا۔ اکیلے کتنے فسانے بنائے جاسکتے تھے۔

زنیش نے بھی کچھ عرصے تک جہان شاہ کا سوگ منایا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ لیکن وہ دوبارہ سے پہلے والی زنیش بن گئی۔ شاید اسے کوئی دوسرا جہان شاہ مل گیا تھا اور شاید اس کے سفر میں راہ میر نام کے کسی شخص کا پڑاؤ نہیں تھا۔ جس کے لیے وہ اپنے قدموں کو روک لیتی۔

منال کو بہت حیرت ہوتی تھی۔ انسان اتنے خسارے کا سودا کیسے کرلیتا ہے۔ اس نے کس طرح راہ میر جیسے شخص کو چھوڑ دیا تھا۔ کیا وہ خود نہیں سمجھتی تھی کہ وہ جتنی خود سر اور تلخ مزاج ہے۔ وہ کسی کے ساتھ بھی گزارا نہیں کرسکتی ہے۔

اس کا زنیش سے کوئی رابطہ کوئی واسطہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ یہ باتیں اس کو سمجھاتی یا اسے منع کرتی۔

☼ ☼ ☼

دنیا اور دنیا کے کام اسی طرح چلتے ہیں۔ بہت سارے لوگوں کے بیچ میں کوئی ایک شخص ایسا ہوجاتا ہے۔ جو خیال بھی کرلیتا ہے اور پروا بھی۔ راہ میر پہلے بھی بہت خیال کرتا تھا۔ اور اب جبکہ زنیش کسی اور راہ کی مسافر بن گئی تھی۔ تب بھی راہ میر نے اپنے کسی کام سے منہ نہیں موڑا۔ منال شرمندہ ہوجاتی' احسان مند ہوجاتی۔ لیکن سمجھ نہیں پاتی کہ ان چیزوں کا بدلہ وہ کس طرح اتار پائے گی۔ ایک سوچ اکثر دماغ میں آجاتی کہ اس دنیا میں کسی کو بہت اچھا نہیں ہونا چاہیے۔ اچھے لوگ آپ کو اندر سے مار دیتے ہیں۔ بے بسی کا احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ آپ ان کے سامنے کھڑے نہیں ہوسکتے ہیں۔ امی اس کے لیے دعا کرتی تھیں۔ وہ راہ میر کے لیے۔ محبت سب کو ہی مجبور کردیتی ہے۔ دل کے اندر لگی آگ کو بجھانے میں بڑا وقت لگ جاتا ہے اور وہ پھر بھی نہیں بجھتی ہے۔ حقیقت یہی تھی المیہ بھی یہی تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر میں زنیش کی منگنی کا فنکشن شروع ہوگیا تھا اور منال کا دل چاہتا۔ وہ کسی ایسی جگہ جاکر چھپ جائے۔ جہاں اسے راہ میر کا منہ نہیں دیکھنا پڑے کہیں سے کسی طرح سے یہ وقت ٹل جائے۔ یہ لمحات کسی طرح گزر جائیں۔ محبتوں کے وہ بہت سارے لمحے' جو اس کے زنیش کے حوالے سے تھے۔ جن کا کبھی اس نے جواب نہیں دیا تھا۔

بڑے ماموں نے منگنی کا فنکشن بھی بڑے پیمانے پر ہی ارینج کیا تھا۔ بڑی مامی نے سب لڑکیوں کے لیے بہت مہنگے اور خوب صورت جوڑے بنوائے تھے۔ منال کا نہ منگنی میں جانے کو دل چاہ رہا تھا اور نہ ہی وہ جوڑا پہننے کو لیکن اسے تماشا لگوانے کا بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ زندگی بھی کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ اس نے تیار ہوتے ہوئے سوچا۔ اذیت کا ایک رنگ میر کے چہرے پر ہے۔ کچھ ایسا ہی رنگ راہ میر کے چہرے پر بھی ہوگا لیکن ہم دونوں کو ہی ان رنگوں کو چھپا کر جینا ہے۔

اور جس نے محبت کا کھیل کھیلا۔ کیا اس کے چہرے پر بھی کوئی رنگ ہوگا۔ جدائی کا اور جدائی کا نہ سہی تو ندامت کا اور وہ اپنی ساری سوچوں میں غلط تھی' وہاں رنگ تو تھے۔ مگر فتح مندی کے' احساس تفاخر کے' خوشیوں کے۔

اس کا منگیتر بہت خوب صورت تھا اچھا تھا۔ اور بہت دولت مند بھی لیکن یہ کون سا کمال تھا۔ اس نے سوچا' یہ ساری خوبیاں تو خود زنیش میں بھی موجود

تھیں۔ اب اس کو بھی ایسا وقت نہ ملتا تو کس کو ملتا۔ اسے ایک دم جہان شاد باد لگا۔

زنیش نے اس کے پیچھے تو سارا ہنگامہ کیا تھا۔ تو اب وہ کہاں ہے۔ لیکن اس کا جواب کون دیتا۔

"آؤ نا۔ زنیش کے پاس تو چلو۔" حبہ اٹھ کر اس کے قریب آئی۔ وہ اسلام آباد سے آئی تھی اور اسے سارے معاملے کی کوئی خبر نہیں تھی۔

"نہیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" اس نے راہ میر کی تلاش میں نظریں گھمائیں۔ وہ تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھا۔ اور ہمیشہ سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی درد کی ایک ہلکی سی تہہ بھی موجود تھی۔ لیکن اس نے ڈریسنگ بہت اچھی کی ہوئی تھی۔ انسان کے پہناوے بھی کیا چیز ہوتے ہیں۔ بہت سی چیزوں کو نظروں سے اوجھل کر دیتے ہیں اور یہ اچھا بھی ہے۔ ورنہ انسان کس کس کو جواب دیتا پھرے۔ اس نے اپنی تیاری کو بھی ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ اگر جو میں یہ خوب صورت جوڑا نہیں پہنتی تو ہر ایک کو بیٹھ کر ایک رام کہانی سنانی پڑ جاتی۔ اس نے گہری سانس لی۔ اس سے ایک بات تو پتا چل گئی کہ دنیا والوں کے ساتھ چلو تو دنیا کے بہت سارے سوالوں سے جان چھوٹ جاتی ہے۔

اس لیے آج سے یہ طے ہے کہ سارے خوابوں کو باندھ کر کسی کونے میں ڈال دینا ہے اور وہ زندگی گزارنی ہے جو بہت سارے لوگ گزارتے ہیں منافقت سے مفاہمت سے' اور جو فیصلہ کر لیا تو ابھی سے عمل کیوں نہیں۔ اس نے اپنے آپ کو مضبوط کیا' اپنے دل کو مضبوط کیا اور اٹھ کر زنیش کے پاس آ گئی۔

ڈنر سرو ہو چکا تھا۔ اور اسٹیج پر زنیش اکیلی تھی۔ وہ بھی سنوری زنیش کے پاس کھڑی ہوئی تو ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں حیرت ضرور اتری۔ لیکن وہ زنیش تھی۔ جسے اپنی ہر چیز پر ملکہ حاصل تھا' اس نے اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپا لیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم میرے فنکشن میں شریک ہوئیں۔" اس جملے میں اس لہجے میں بہت کچھ تھا۔

لیکن اسے جھگڑا نہیں کرنا تھا۔ حالانکہ اس لمحے اسے یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ آسان کوئی بھی چیز نہیں ہوتی' بے شک دنیا کے ساتھ بھی چلو' تب بھی صبر اور برداشت کا سبق یاد ہی رکھنا چاہیے۔

"میں کیوں شریک نہیں ہوتی زنیش! یہ میرے ماموں کے گھر کی تقریب تھی اور وہ باتیں جن کا کہیں کوئی وجود نہ ہو۔ ان کی وجہ سے دلوں میں فرق نہیں آنا چاہیے۔"

"یہ تو تم کہہ رہی ہو نا کہ وجود نہیں ہے۔ ورنہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جو چیزیں اپنا وجود رکھتی ہیں۔ ان ہی کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے۔" وہ دلہن بنی بیٹھی تھی اور کون سے حساب کتاب چکا رہی تھی۔ ایسے لوگوں کو کیا جواب دیا جا سکتا تھا۔ وہ اسٹیج پر سے خاموشی سے اتر آئی۔

"تم مبارک باد دینے گئیں؟" اس نے سر اٹھا کر راہ میر کی آنکھوں کو دیکھا۔ وہ بہت سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ کتنے لوگوں کی ستائشی نظریں ان دونوں پر تھیں۔ جس طرح وہ لوگ تیار تھے لوگ انہیں بھی کوئی شادی شدہ جوڑا ہی سمجھ رہے ہوں گے راہ میر اسے لیے ہوئے پیچھے کی طرف آ گیا۔

"مجھے اچھا لگا سنال!"

"لیکن مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ اس طرح جینے سے مر جانا اچھا ہوتا ہے۔"

"ارے!" راہ میر کے لہجے میں سچ مچ کی حیرت تھی "اتنا اچھا تیار ہو کر مرنے کی باتیں نہیں کرتے۔"

"میں اپنے آپ سے لڑتے لڑتے تھک گئی ہوں۔ حالانکہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سوچا تھا کہ میں اپنے آپ کو بدل لوں گی۔ لیکن کوئی بھی چیز آسان نہیں ہوتی نہ دنیا کے ساتھ چلنا نہ اس سے نکلنا۔ مجھے لگتا ہے۔ میرے لیے کوئی راہ باقی نہیں بچی ہے۔"

"کوئی راہیں ختم نہیں ہیں سنال اور ایسا بھی نہیں ہوتا کہ صرف اندھیرے ہی اندھیرے ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔ "میں روشنی تلاش کروں گی۔"

☼ ☼ ☼

وہ اب بہت کچھ اچھا کرنے لگی تھی۔ یا پھر یہ کہ اب بہت کچھ اچھا ہونے لگا تھا۔ اس کو گرافک میں ڈگری مل گئی تھی۔ اور جس دن ڈگری اس کے ہاتھ میں آئی اسے لگا۔ اس کے اعتماد میں بھی سوگنا اضافہ ہو گیا ہے اور بس اب اسے صرف ایک جاب کی ضرورت تھی۔ اس نے راہ میر سے جاب کے لیے بات کی۔

"کسی کو بھی تمہاری جاب پر اعتراض نہیں ہو گا۔ منال! لیکن شہر کے حالات دیکھو۔" اس کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

"اچھا دیکھو تم اپنی سی وی دے دو۔ تین چار جگہ اپلائی کر دوں گا۔" اس نے منال کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر تسلی دی اور وہ اس تسلی سے ہی بہت خوش ہو گئی۔ راہ میر کو اچھا لگا۔ اسے زینش یاد آ گئی۔ اپنی محبت اس کی بے اعتنائیاں۔ زندگی اسی کا نام ہے اور یہ دوسری دفعہ تھا۔ جب اس نے منال کو غور سے دیکھا۔ اچھے لوگ ہمیشہ سے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ہمیں دیر سے نظر آنا شروع ہوتا ہے۔ بہت عرصے کے بعد اس نے کوئی بات خوش دلی سے سوچی تھی۔

اور بالکل اسی دن کی بات تھی کہ اس نے زینش کو غصے میں تیز گاڑی چلاتے ہوئے دیکھا۔ ایسا وہ تب ہی کرتی تھی۔ جب اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جاتی تھی۔ اس وقت نہ گاڑی کی خیر ہوتی تھی۔ نہ اس میں بیٹھنے والے کی..... اس نے ایک لمحے کو سوچا کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ وہ اس کے پیچھے نہیں جائے گا۔ اسے یہ بات خود کو چار بار، کبھی پڑی اور پانچویں دفعہ کہنے سے پہلے وہ گاڑی میں اس کے پیچھے جا رہا تھا۔ اسے بہت آگے جانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

وہی ہوا۔ جس کا اسے ڈر تھا۔ گاڑی آڑی ترچھی سڑک کے کنارے کھڑی نظر آ گئی۔ زینش کے ماتھے پر چوٹ آئی تھی۔ چوٹ بہت زیادہ نہیں تھی۔ لیکن وہ شاک میں تھی۔ اپنا خون دیکھ کر اس کا ری ایکشن بالکل بچوں نے بچوں والا تھا۔

راہ میر نے بہت مشکل سے اسے اپنی گاڑی میں ڈالا۔ مکینک کو فون کر کے بلوایا۔ پھر اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس آیا۔ اس سارے عمل کے دوران وہ بالکل خاموش رہا۔ زینش نے دو ایک دفعہ کچھ بولنا چاہا۔ لیکن اس کا منہ دیکھ کر خاموش رہ گئی۔

"سوری۔ میری وجہ سے تمہیں بڑی تکلیف ہوئی۔"

اس کا یہ جملہ راہ میر کو اچھا نہیں لگا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ خاموش ہی رہتی، اپنے سابقہ مغرورانہ انداز میں۔ اس نے زینش کے چہرے کو دیکھا۔ جس پر واضح کشمکش تھی اور اس کی خوب صورت بھوری آنکھوں میں کہیں غصے کی جھلک بھی۔ یقیناً اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہوئی تھی۔

"میری دو دن سے رانیال حسن سے لڑائی چل رہی ہے۔"

"ابھی تم لوگوں کی منگنی کو کتنا عرصہ گزرا ہے۔ جو تم نے لڑائی شروع کر دی ہے۔"

"میں نہیں کرتی ہوں۔ میں اپنی عادت کے برخلاف اس کی بہت ساری باتیں ان سنی بھی کر لیتی ہوں۔ لیکن میں کس طرح سمجھاؤں کہ اس کے اندر خود بری بری عادتیں ہیں۔" اس کے بے ساختہ کہنے پر راہ میر نے اسے دیکھا۔

"میری ایک بات نہیں مانتا۔ ہر بات میں اپنی چلاتا ہے۔ ضدی اور خود سر ہے۔"

"تو یہ ساری تو تمہاری بھی عادتیں ہیں۔ تمہیں بری نہیں لگتی کیا انہیں۔ اور جن سے محبت ہوتی ہے۔ ان کی بہت ساری باتوں کو درگزر کیا جاتا ہے۔"

"وہی تو کر رہی ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" راہ میر نے گہری سانس لی۔ اس نے محبت کا پہلا سبق سیکھ لیا تھا۔ یعنی درگزر کرنا۔ کیونکہ خود وہ بھی ابھی تک یہی کرتا آیا تھا۔

اور اس کے بعد یہ ہوا کہ ان دونوں کے درمیان جو ایک دیوار سی تھی نہ نظر آنے والی وہ گر گئی۔ وہ پہلے والی

زنیش بن گئی۔ اپنا ہر مسئلہ اور اس کے حل کے لیے راہ میر کی طرف دیکھنا۔

دانیال بہت اچھا تھا۔ دولت مند خوب صورتی میں وہ جہان شاہ کے ہی برابر تھا۔ بس دانیال سے اسے محبت نہیں ہو پائی۔ یہ کام ہو شادی کے بعد ہو جاتا۔

لیکن دانیال کے گھر والے نظام اور تنگ نظر لوگ تھے۔ آئے دن اس کی ممی کو کوئی نہ کوئی دورہ پڑ جاتا اور انہیں زنیش کی کسی نہ کسی بات پر اعتراض، نکتہ چینی، تنقید۔ اس کے سرکل میں کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ انہیں جہان شاہ کے متعلق تھوڑا بہت پتا تھا۔ اور اس حوالے سے بھی نئے دن ان کی طرف سے اسے کوئی نہ کوئی بات سننے کو مل ہی جایا کرتی تھی۔

دانیال سب کچھ سمجھتا تھا اور پھر بھی خاموش رہتا تھا۔ یہی بات ان کی آئے دن لڑائیوں کا سبب بن جایا کرتی تھی۔ انتقام کے جوش میں دوسروں کو سبق سکھانے کے بجائے اب اسے خود سبق پڑھنا پڑا تھا برداشت اور درگزر کا۔

☆ ☆ ☆

ان سارے چکروں میں بھی راہ میر کے دماغ میں یہ بات تھی کہ منال نے اس سے جاب کا کہا ہے۔ اس نے دو ایک لوگوں سے بات کی۔ خود بھی کوشش کی۔ لیکن کہیں بات نہیں بنی اور کہیں اسے ماحول سمجھ میں نہیں آیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک ہفتے تک ان لوگوں کے پورشن کی طرف جا بھی نہیں سکا اور جس دن گیا۔ وہاں بڑی اہم خبر اس کی منتظر تھی۔ منال کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ گھر میں بیک وقت خوب ہجاؤں جیسے منظر تھے۔ امی جتنی خوش تھیں۔ منال کا منہ اتنا ہی سوجا ہوا تھا۔ اور وہ خاموش بھی بہت تھی۔

گئے دنوں کے وہ سارے عکس جن سے اس نے بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا تھا۔ آج وہ سارے عکس اس کے چہرے پر تھے۔ آج وہ پھر پہلے والی منال لگ رہی تھی۔ خاموش اور گم صم۔

اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

اس نے ایک مہینے میں بہت کچھ دیکھا تھا اور بہت کچھ جان لیا تھا۔ دل اگر کسی خوش فہمی میں مبتلا بھی تھا۔ تو شکر کہ وہ خوش فہمی بھی اب نہیں رہی تھی اور کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔ راہ میر بہت اچھا تھا۔ لیکن اس نے کوئی زندگی بھر کی اس کی ذمہ داری نہیں اٹھائی تھی اور یہ بھی بالکل اس کا ذاتی فعل تھا۔ کہ اس کا رویہ زنیش کے ساتھ کیسا تھا۔ جس نے زخم دیا تھا۔ اسے اتنی جلد مسیحائی کی ضرورت کیوں پڑ گئی اور اگر پڑ ہی گئی تھی۔ تو کیا ضروری تھی کہ وہ شخص راہ میر ہی ہوتا۔

اس نے گہری سانس لی۔ محبت چیز ہی ایسی ہے۔ نہ محبت سے دل خالی ہو پاتا ہے اور نہ ہمیں سکون مل پاتا ہے۔ بے شک سارے خوابوں کو گٹھری باندھ کر کسی کونے میں ہی کیوں نہ ڈال دو کہ اب ان سے دستبرداری ہے۔ لیکن خواب پھر بھی دامن سے ہی لپٹے رہتے ہیں۔ دل میں گھس کر بیٹھ جاتے ہیں۔ رگوں میں خون کی جگہ ———— اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ تو ساری غلطی تو خود اپنے دل کی تھی۔ دوسرے کا کیا قصور۔

لیکن پھر بھی جب راہ میر نے حال پوچھا۔ تو جان میں کوئی چیز پھنس گئی۔ اسے لگا۔ وہ کوئی جواب نہیں دے پائے گی۔

"تم ناراض ہو گی۔ لیکن یقین کرو منال۔ میں نے چار پانچ جگہوں پر اپلائی کیا تھا لیکن بات نہیں بنی۔ چلو تم دل چھوٹا نہ کرو۔ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔"

اسے پتا تھا۔ راہ میر نے کہا ہے تو وہ واقعی کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا۔ لیکن اپنی کہانی کیا کہتی۔

پچھلے دنوں اپنے آپ سے کیے ہوئے سارے وعدے بھی کہیں حباب بن کر اڑ گئے تھے۔ انسان خود پر کتنا جبر کر سکتا ہے۔ اسے اب خود سمیت سب پر ہی حیرت ہونے لگی تھی۔ راستے ختم نہیں ہوتے کوئی امکان، کوئی امید کہیں نہ کہیں رہ ہی جاتی ہے ان کا سرا تھام کر چلو شاید کبھی منزل مل ہی جائے اگر اب نہ منزل تھی نہ منزل کی مسافت، سب چیزوں نے راستے میں ہی دم توڑ دیا تھا اور اکیلا خالی آدمی کتنی دیر تک

دوسرے کا ساتھ نبھا سکتا ہے۔ اب رونے کا مطلب
نہ شکست تھا، نہ محبت میں ناکامی' بس ایک کہانی تھی۔
سو ختم ہو گئی۔ اس کا رشتہ آیا ہوا تھا۔
زنیش اب دوبارہ بچھڑے راستوں پر قدم رکھ رہی
تھی۔ اب سب صحیح تھا۔ مگر وہ ایک شاخ سال غم جیسے
دل کہیں سو ہری رہی۔
"منال!" راہ میر نے اسے آواز دی۔ "جو باتیں کہہ
رہا ہوں۔ اسے غور سے سننا۔ میری ساری کہانی
تمہارے سامنے ہے محبت سے لے کر محبت میں ناکامی
تک شاید کسی کو خبر نہ ہو۔ مگر تمہیں خبر ہے۔ تم سے
کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔ گو کہ میں نے کبھی
زبان سے نہیں کہا۔ مگر کیا محبت کو اس کی ضرورت
تھی؟ لیکن یہ بھی میری ہی غلط فہمی تھی۔ اگر ہمارے
درمیان محبت ہوتی۔ تو ایسی نوبت ہی کیوں آتی؟ محبت
میں سارے قصور' سارے خسارے خود اپنے ہی نکل
آتے ہیں، تمہیں کیا اس خسارے کے سودے میں
شریک کرنا۔ لیکن بس یونہی۔ ابھی ابھی مجھے خیال آیا
ہے۔ جب مجھے تمہارے رشتے کا بتا رہی تھیں اور امی
بھی شادی کے لیے بہت اصرار کر رہی ہیں۔ تو کیا میں
اپنا رشتہ بھیج دوں؟"
پہلے اسے لگا کہ زلزلہ آیا ہے۔ کیونکہ ساری
دیواریں فرش اسے ہلتے ہوئے نظر آئے۔ پھر اسے لگا
کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بادل کی خواہش ہی
اتنی مجسم ہو گئی تھی کہ اس نے من چاہے لفظوں کا
روپ دھار لیا تھا۔ کوئی بات ضرور ہوئی تھی۔ دماغ
خراب ہونے سے لے کر دل خراب ہونے تک۔
اسے اپنے اوپر غصہ آیا۔ اپنے حالات پر غصہ آیا۔
خواہشوں کو اپنا روگ اپنا جنون کیوں بنا لیا کہ لوگ پتھر
ہی مارنے لگے۔ دل دکھانا' پتھر مارنے جیسا ہی ہوتا ہے
اور یہ پتھر بھی اس نے مارا تھا۔ جس کے متعلق وہ
خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ کہ وہ یہ کام بھی کر
سکتا ہے۔ لیکن اچھے لوگ ہمیشہ فرشتوں کا لبادہ ہی
اوڑھے رہیں۔ یہ کہاں لکھا ہے۔
"تم میری بات سن رہی ہو نا؟"
حالانکہ نہ وہ کچھ سن رہی تھی۔ نہ سمجھ رہی تھی۔
پھر بھی اس نے گردن ہلا دی۔ جانے راہ میر نے کیا
سمجھا کیا نہیں۔ مگر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے
بعد بھی وہ بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس
کے اندر کوئی جیسے کہہ رہا تھا کہ اسے راہ میر کے لفظوں
پر یقین کر لینا چاہیے۔ مگر کوئی کیسے یقین کر لے۔ نا
ممکنات پہ' معجزات پر اور دوبارہ زندہ ہونے پر۔

☆ ☆ ☆

آج پھر سب کی شامت آئی تھی۔ زنیش نے
کمرے کی کتنی ہی چیزیں توڑ دی تھیں۔ اس دفعہ مسئلہ
دانیال نہیں۔ بلکہ دانیال کی ممی تھیں۔ انہوں نے
زنیش کو کسی بات پر ٹوکا تھا۔ حالانکہ طوبیٰ کا خیال تھا
اور اس نے چپکے سے مرتضیٰ سے کہا بھی کہ زنیش کو ٹوکنے
کی نہیں لتاڑنے کی ضرورت ہے اور وہ بھی ٹھیک
ٹھاک۔ تب کہیں جا کر اس کے دماغ سے گرد اترے
گی۔ ایک بڑا سا چھناکا ہوا۔
"یا اللہ۔" مرتضیٰ اٹھ کر بھاگی۔ زنیش نے کہیں
اپنے آپ کو دراز سے نہ دے مارا ہو۔ لیکن وہاں پہنچ
کر سب نے سکون کا سانس لیا۔ فقط چھناکا ہوا تھا وہ
زمین پر ٹکڑوں کی صورت میں تھا اور اس میں سے
دھواں اٹھ رہا تھا۔
"یہ غصے کی سب سے خاص شکل ہے۔" مرتضیٰ نے
آہستہ سے تبصرہ کیا۔ "جب انسان کو یہ بھی خیال نہ
رہے کہ اس نے کیا نقصان کر دیا ہے۔"
"اس نے تو بغیر غصے کے بھی اپنا بڑا نقصان کیا ہے۔
اسے راہ میر کے علاوہ کوئی سنبھال نہیں سکتا تھا۔ اور
اس نے راہ میر کو ہی چھوڑ دیا۔" طوبیٰ کا تبصرہ زیر لب
تھا اور زبردست تھا۔ صرف محبت کا ہی ظرف ہوتا ہے
کہ ہر چیز معاف کر دے۔
"تمہیں یاد ہے زنیش کی کتنی باتوں' کتنی چیزوں پر
ہم لوگ جان مار کر رہ جاتے تھے۔ مگر راہ میر کے ماتھے پر
شکن نہیں آتی تھی۔ بلکہ اسے تو احساس بھی نہیں ہو
پاتا تھا۔ اور یہ اپنی زنیش اگر آج اسے اپنی غلطی کا

احساس ہو جائے تو اپنے راہ میر نے بھی معاف کرنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگانا۔" ابھی تو جملہ اس کے منہ میں ہی تھا کہ زنبش پیچھے سے غرائی۔

"ایک گھنٹے سے تم لوگوں کی بکواس سن رہی ہوں۔ تم لوگوں کے دماغ میں اس سے اچھی بات نہیں آسکتی ہے۔" "اس کے تیور اتنے خراب تھے کہ وہ دونوں ہی ڈر گئیں۔" اور میں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ میں نے جس سے محبت کی۔ اسی سے شادی کر رہی ہوں اور اگر میں راہ میر سے اپنے متعلق ڈسکس کرتی ہوں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں راہ میر سے شادی کرلوں گی۔ میرا منگیتر راہ میر سے بہت آگے کی چیز ہے۔ تم سب لوگ چھوٹے دماغ کے لوگ ہو۔"

وہ ٹک ٹک کرتی چلی گئی۔ اس نے راہ میر کو بھی نہیں دیکھا۔ جو دھماکے کی آواز سن کر نکلتے ہوئے باہر آیا تھا۔ آواز چونکہ زنبش کے کمرے سے آئی تھی۔ اس لیے وہ جلدی میں سلیپر بھی پاؤں میں نہیں ڈال سکا۔ اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا؟ مگر کیا وہ خود اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے اپنے آپ سے گھن آئی۔ اسے اتنا بد دیانت سمجھ لیا گیا تھا۔ کیا اچھائی ہمیشہ راندۂ درگاہ ہی رہے گی۔

"شکر ہے کہ اس نے کل ہی منال سے بات کرلی تھی۔" بہت دیر کی خاموشی کے بعد اس نے فیصلہ کیا۔ اب اسے جو کچھ بھی کرنا تھا جلد کرنا تھا۔ پہلے اس نے امی سے بات کی' انہیں بیٹے کی کسی چیز پر بھی کبھی اعتراض نہیں تھا۔ پھر پھپھو اور منال سے بات کی۔ نہ پھپھو سے کوئی جواب بن پڑا نہ منال کوئی جواب دے سکی۔ ایک نے سر پر ہاتھ رکھا اور دوسرے کے چہرے پر اتنے رنگ تھے کہ وہ ساری عمر لگا کر بھی انہیں شمار کرنا چاہتا تو نہیں کر پاتا۔

اسے اب اس گھر میں بھی نہیں رہنا تھا۔ اس نے اپنا گھر بنوانا شروع کروا دیا تھا۔ اپنی منگنی کے چوتھے دن سے ہی اس نے یہ کام شروع کروا دیا تھا اور یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ کوئی بھی صحیح طریقے سے حیران نہیں ہو سکا۔

راہ میر میں سب کی جان تھی اور اس کی خوشیوں میں بھی سب لوگ شریک تھے۔ جو سب کے ہوں۔ لوگ بھی ان کے ہی ہو جاتے ہیں۔ کیا ہوا جو ایک شخص اپنا نہیں ہو سکا۔ اب وقت بدل گیا تھا۔ وقت تو بہت ساری چیزیں بتا بھی دیتا ہے اور بہت کچھ چھپا بھی لیتا ہے۔ اس کی مرضی جس پہ چاہے اپنا راز کھول دے۔

وہ گھر میں اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ اسے دنیا کی بھی خبر نہ رہی اور شاید یہ اچھی بات بھی ہو۔ دنیا میں اچھی خبریں ہوتی بھی کہاں ہیں۔

گھبرانے لگا۔ فضا بدل رہی ہے۔ کوئی چیز گھر کے ماحول میں سرایت کر رہی ہے۔ چپ چاپ اپنا اثر ڈال رہی ہے۔ کوئی زہر جیسی چیز جو انسان کی جان لے لے اور اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ محبت میں جان بھی دی جاسکتی ہے۔

زنبش نے خود اپنی منگنی توڑ دی تھی۔ محبت سے کی ہوئی منگنی۔ اس کے الزامات کی فہرست بہت طویل تھی کہ والدین اس کی کوئی بات نہیں مانتے تھے۔ ہر بات کے لیے وہ اپنے ماں باپ کا منہ دیکھتا تھا۔ برعکس میں اس کے شہروز صرف نہیں فیصد تھے تو اسے سسرال میں ہمیشہ ایک کمتر مقام ملے گا۔ کسی کو بھی حیرت نہیں ہوئی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ اور شاید بہت پہلے ہو جاتا لیکن اس لیے نہیں ہو پایا۔ کیونکہ راہ میر ہمیشہ اس کی کتھارسس سن لیتا تھا۔ وہ صحیح مشورے بھی دے دیتا تھا۔ بات ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن بات تو اب شروع ہوئی تھی۔

منال کو حیرت ہوئی کسی کو بھی بہت زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ منگنی ہی تو ہوئی تھی۔ وہ اس اعتراض خود ہی کے بھی ان لوگوں سے نکل آئے۔

کسی نے بھی اس کی منگنی ٹوٹنے کو سیریس نہیں لیا۔ وہ تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس نے پتا نہیں کیوں سیریس لے لیا۔ یہ سمجھ لیا کہ اس کی شادی راہ میر سے ہو جائے گی۔ اور زندگی اسے وہ سب بخش دے گی جو کہیں دل کے بہت اندر چھپا ہوا تھا۔ ایسا کچھ نہیں

ہوتا۔ زندگی صرف ان ہی لوگوں کو نوازتی ہے جن کو پہلے بھی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہوتی اور ان کا کام اس کے بغیر بھی چل سکتا تھا اور اس بات میں اس کا کیا کمال تھا۔ اچھے لوگوں سے محبت ہو ہی جاتی ہے۔

اور اس محبت نے پھر اسے کچھ اور دیکھنے ہی نہیں دیا۔ حتیٰ کہ جب زنیش نے اس پر جہان شاہ کے حوالے سے الزام لگایا۔ اس وقت بھی اس نے ایک لمحے کو کچھ اور نہیں سوچا اور اب؟

☼ ☼ ☼

ہر طرف سناٹوں کا راج تھا۔ یا اس کو ہی اس طرح کا لگتا تھا۔ خود اپنے دل میں اندھیرے بس جائیں۔ تو روشن دنیا بھی اندھیری ہی لگتی ہے۔ اور کتنی بھی روشنیاں کرلی جائیں۔ رات تو رات ہی ہوتی ہے۔ سرد، سیاہ اور سفاک، اور وہ رات جو چلتی رہتی ہے۔ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ جس کے اختتام پر کوئی صبح بھی منتظر نہیں ہوتی۔ وہ شام وہی رات زندگی میں آگئی تھی۔ دل میں گھس کر بیٹھ گئی تھی اور وہ اسے نکالنے پر قادر بھی نہیں تھی۔ اس کی خوشیوں کا وقت اب ختم تھا۔ یا ختم ہونے کو تھا۔ ویسے بھی نہیں جانتی تھی اور اسے کوئی غلط فہمی بھی نہیں تھی۔

بڑے ماموں کے سب ہی لوگوں پر کچھ نہ کچھ احسانات تھے۔ احسان کا بدلہ احسان ہی ہے اور دوسری آخری چیز۔ راہ میر کی زنیش سے محبت تھی۔ محبت واپس مل جائے۔ تو لوگ شادی شدہ زندگی بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں اور یہاں تو صرف دس لوگوں کی موجودگی میں ایک بات پکی ہوئی تھی۔ وہ بات رہتی نہ رہتی۔ کس کو فرق پڑتا تھا۔

وہ اندھی نہیں تھی۔ اسے بھی نظر آرہا تھا۔ دبی دبی سرگوشیاں، بڑی ماں کا راہ میر کے لیے التفات۔ جو خیر پہلے بھی کم نہیں تھا۔ زنیش کا مغرورانہ انداز اور چہرہ اب بھی کم نہیں تھا۔

اور تقریباً "بڑوں" کا ایک متفقہ خیال اور دباؤ کہ منال بہت اچھی ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ مگر زنیش؟

اچھا ہونا برا ہونے کا سبب کیسے بن جاتا ہے۔ یہ نکتہ اسے کون سمجھاتا۔

اندھیرے چاروں طرف سے بڑھتے چلے آرہے تھے اس دن بھی وہ پچھلی سیڑھیوں پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جب کوئی سایہ اس کے قریب آکر رک گیا۔ سر اٹھا کر دیکھے بغیر بھی اسے پتا تھا کہ اتنا پیچھے آکر اسے کون تلاش کر سکتا ہے۔

"مجھے مزدوروں کو کچھ بتانا ہے۔ تمہیں چلنا ہے تو چلو۔ تم کلر اسکیم دیکھ لینا۔"

منال نے نظریں اٹھائیں وہ سب باتوں سے لاعلم تھا۔ یا بن رہا تھا۔ دونوں ہی صورتوں میں اس کے تو ہاتھ خالی تھے۔

دس دن پہلے جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد بھی۔

"اور ہاں۔"

وہ جاتے جاتے پلٹ کر آیا۔ اس کے ہاتھ میں قرآن پاک تھا جو اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

"امی نے کہا تھا کہ اب تم دونوں وہاں گھر جانا تو قرآن پاک رکھ دینا۔"

"میں کیوں زنیش۔" اس کی زبان لڑکھڑائی۔

"زنیش کیوں؟" راد میر نے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"اسے تم رکھو گی۔ وہ تمہارا گھر ہے۔"

پتا نہیں وہ اور کیا کہہ رہا تھا۔ اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ دن پہلے کی ساری باتیں اسے یاد آگئیں۔ سب لوگ راد میر کا گھر دیکھنے کے سلسلے میں گئے تھے ان میں زنیش بھی تھی۔

گھر اتنے آرٹسٹک انداز میں بنا تھا کہ سب ہی ایک دم حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ حتیٰ کہ خود زنیش بھی حیران رہ گئی۔ حالانکہ وہ حیران ہونے والوں میں سے تھی نہیں۔

"یہ سب کچھ منال کا کرشمہ ہے۔" اس نے فراخدلی سے سارا کچھ اس کے دامن میں ڈال دیا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ اسے کسی بھی چیز پر اعتراض نہیں ہوتا تھا۔

سب لوگ مختلف جگہوں پر بکھر گئے تھے اور کمرے میں صرف وہ اور زنیش ہی رہ گئے تھے۔ ایک لمحے کی بات تھی۔ اسے اپنے متعلق جو خوش فہمی تھی اور وہ جو سمجھتی تھی کہ وہ بہت خوددار ہے۔ کبھی کسی سے کچھ مانگ نہیں سکتی۔ اس ایک لمحے میں بند جانے کیا ہوا۔ یہ شیوہ بس ہمارا ہے کہ جب بھی قتل کو آئیں اندھیرے موسموں میں دشمنوں کی رہبری کرنا دشمن کی رہبری کرنے کے بجائے اس نے دشمن سے ہی راستہ مانگ لیا۔ اس نے راد میر کو مانگا۔ چیزیں فاتح لوگوں سے ہی مانگی جاتی ہیں اور زنیش کا شمار اور مقدر فاتح لوگوں میں لکھ دیا گیا تھا۔ تو وہ کیا کرتی۔ زندگی بھر اس نے کبھی کسی کی استعمال کی ہوئی چیز کو چاہے وہ کتنی بھی قیمتی ہوتی۔ نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا لیکن چیزوں اور انسانوں میں فرق ہوتا ہے۔

"کچھ کہہ نہیں سکتی ہوں۔" زنیش نے کندھے اچکائے۔ "مجھے کسی کا حق مارنے کا شوق نہیں ہے۔ لیکن جو تمہارا ہے نہیں۔ اس پر تم کیسے حق جتا سکتی ہو۔

اس کی آنکھوں میں نمی بھی میرا دل دھڑکتا ہے۔"

"یہ بات تم اس وقت بھی جانتی تھیں۔ جب تم اسے چھوڑ گئی تھیں۔"

"تو کیا ہوا غلطی ہو جاتی ہے۔ لیکن اب مجھے سمجھ آگئی ہے۔" زنیش کی دوست کی غلطی تھی۔ اور اس کے ساری زندگی کے آنسو تھے۔ زنیش کا لہجہ سرد تھا۔ پھر اس سے زیادہ بات نہیں کی گئی تھی اور بات کرنے کو اب کچھ رہ بھی نہیں گیا تھا۔

"مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ اس گھر کو تم نے بڑی محنت سے بلکہ شاید محبت سے بنوایا تھا لیکن کوئی بات نہیں۔ اس بات کو بھی میں اور راد میر یاد ضرور کریں گے۔"

اس کے لہجے میں کوئی الگ سے بات نہیں تھی۔ وہ جس طرح بات کرتی تھی۔ آج بھی اسی طرح کا لہجہ تھا۔ مگر کوئی چیز راد میر کے دل میں چبھ سی گئی۔ وہ اس وقت زنیش کو بلانے ہی آ رہا تھا کہ ان دونوں کی باتیں سن کر وہیں رک گیا تھا۔

آگ بجھ جاتی ہے۔ مگر آگ نہیں بجھتی ہے۔ وہ کسی کونے میں سلگتی ہی رہ جاتی ہے۔ کسی دن نظر جاتی ہے تو پتا چلتا ہے۔ آپ نے جو بھی فیصلے کیے تھے وہ اپنی جگہ صحیح عزت نفس کے سبق بھی صحیح مگر اس محبت کا کیا کیا جائے۔

دل میں منال کی وفا کی قدر تھی، عزت بھی، لیکن محبت اس محبت کو وہ کہاں سے لے کر آتا۔ جس پر کسی بے وفا کا قبضہ تھا۔ وہ زنیش کو معاف کر دیتا۔ کسی نے صحیح کہا ہے۔ انسان محبت کے جذبے میں معاف نہ کرے تو پھر کب کرے۔ زخم تو لگ ہی جاتے ہیں اس کا بدلہ محبوب سے کیسے لیا جائے۔

مگر یہ محبت سے الگ کوئی چیز تھی۔ یہ ایک گھر کی بات تھی۔ گھر جس کی بنیادوں میں پہلے بلکہ بہت پہلے وفا کا خون شامل ہونا چاہیے۔ زندگی کے نئے سفر میں اب کہ وفا پر عشق کی بنیاد رکھنی تھی۔

بکھر جائیں گے کیا ہم جب تماشا ختم ہوگا
میرے معبود آخر کب تماشا ختم ہوگا

چراغ حجرۂ درویش کی بجھتی ہوئی لو
ہوا سے کہہ گئی ہے اب تماشا ختم ہوگا

کہانی میں نئے کردار شامل ہو گئے ہیں
نہیں معلوم اب کس ڈھب تماشا ختم ہوگا

کہانی آپ الجھی ہے کہ الجھائی گئی ہے
یہ عقدہ تب کھلے گا جب تماشا ختم ہوگا

یہ سب کٹھ پتلیاں رقصاں رہیں گی رات کی رات
سحر سے پہلے پہلے سب تماشا ختم ہوگا

تماشا کرنے والوں کو خبر دی جا چکی ہے
کہ پردہ کب گرے گا کب تماشا ختم ہوگا

دل نا مطمئن ایسا بھی کیا مایوس رہنا
جو خلق اٹھی تو سب کرتب تماشا ختم ہوگا

افتخار عارف

معنی کا عذاب

چوک سے چل کر، منڈی اور بازار سے ہو کر
لال گلی سے گزری ہے کاغذ کی کشتی
بارش کے لاوارث پانی پر بیٹھی بے چاری کشتی
شہر کی آوارہ گلیوں میں سہمی سہمی گھوم رہی ہے
پوچھ رہی ہے
ہر کشتی کا ساحل ہوتا ہے
تو کیا میرا بھی کوئی ساحل ہوگا
بھولے بھالے اک بچے نے
بے معنی کو معنی دے کر
ردی کے کاغذ پر کیسا ظلم کیا ہے!

گلزار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"جس کے سامنے اس کے مسلمان بھائی کی غیبت ہو رہی ہو اور وہ اس کی حمایت پر قدرت رکھتا ہو اور اس کی حمایت کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی حمایت فرمائے گا اور اگر اس کی حمایت نہ کی حالانکہ وہ اس کی حمایت پر قادر تھا تو دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ اس پر گرفت فرمائے گا۔"

شیخ سعدی کہتے ہیں:

میں نے ایک بزرگ کو دریا کے سیلاب میں چیتے پر سوار دیکھا۔ اس ہولناک منظر سے میں ایسا گھبرایا کہ چلنے سے عاجز ہو گیا۔ میرے پاؤں جم گئے۔ انہوں نے میری یہ حالت دیکھ کر تبسم فرمایا اور فرمایا۔

"سعدی! اس سے تو تعجب نہ کر۔ تو اللہ کے حکم سے گردن نہ موڑ، کوئی چیز تیرے حکم سے منہ نہ موڑے گی۔"

لاریب: ماہ زیب۔ گوجرانوالہ

خیر خواہی:

حضرت عبداللہ مروزی ـــــ تھے۔ ایک شخص ہمیشہ انہی سے کپڑے سلواتا تھا اور ہر بار کھوٹا روپیہ سلائی کے معاوضے میں دیتا تھا۔ آپ لے لیتے اور کبھی انکار نہ کرتے اور نہ ہی اسے جتلاتے تھے۔ ایک دن ان کی غیر حاضری میں شاگرد نے اس سے وہ کھوٹا سکہ نہ لیا۔ اور جب آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے شاگرد سے کہا۔ "تو نے وہ کھوٹا سکہ کیوں نہ لیا۔ برسوں گزر گئے وہ میرے ساتھ اسی طرح کرتا تھا۔ میں اس پر صابر رہا اور ہمیشہ اسی خیال سے کھوٹا سکہ لیتا رہا کہ اگر میں نے نہ لیا تو وہ کسی اور مسلمان کو فریب دے گا۔"

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

مہکتی کلیاں:

- گمراہوں کے سوا ایسا کون ہے جو اپنے پروردگار کی رحمت سے ناامید ہو۔
- جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ بدلہ نہیں لیتا۔
- ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت نیک عورت ہے۔
- وقت، ہوا اور دولت ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

مایوسی کفر ہے:

ابلیس کے لفظی معنی ہیں "انتہائی مایوس"۔ اللہ کی رحمت سے مایوس، جنت میں داخلے سے مایوس۔ اسی لیے اللہ کی رحمت سے مایوسی کو کفر کہا گیا ہے۔

عذرا ناصر۔ کراچی

خالی زندگیاں:

بہت سے لوگوں کے پاس دین کا اور تعلیمات کا بڑا علم ہوتا ہے لیکن ان کی زندگیاں بڑی خالی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرف باہر کا علم انسان کے اندر کو نہیں بدل سکتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ظلم سے ظلم پیدا ہوتا ہے مگر پھر بھی ہر شخص دوسرے پر ظلم کرتا ہے۔

(اشفاق احمد کی کتاب سے اقتباس)

ثمرہ منظور۔ [illegible]

چھوٹی سی بات

٭ اگر آئینے میں اچانک آپ کا چہرہ خوبصورت نظر آنے لگے تو جان لیجیے کہ آپ کی نظر کمزور ہو گئی ہے۔
٭ آپ کی زندگی کی تصویر، آپ خود نہیں بناتے بلکہ آپ کا اخلاق اور آپ کی محبتیں بناتی ہیں۔
٭ بہار کا خزاں رسیدہ پتا جب آپ کے پاؤں تلے آتا ہے تو چرچراتا ہے۔ غور کیجیے وہ کتنا خزاں نم ہو گا بھی آئے گی۔

(مستنصر حسین تارڑ)

رخسانہ رفیق۔ ملتان

دور اندیشی

ایک معمولی شکل و صورت والے امیر کبیر نوجوان نے ایک حسین و جمیل لڑکی سے شادی کی درخواست کی۔ جو لڑکی نے قبول کر لی۔ نوجوان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ مسرت و شادمانی سے جھومتے ہوئے اس سے کہنے لگا۔

"میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کر رہا ہوں۔ مجھے امید نہ تھی کہ تم ہاں کر دو گی۔ میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتا۔ مگر تم بہت عظیم ہو۔ میری تو شکل بھی ایسی نہیں کہ کوئی خوب صورت لڑکی مجھ پر دوسری نظر ڈالنا پسند کرے۔"

"ہاں! میں نے بھی اس بارے میں کافی سوچا تھا۔" لڑکی نے ایک ادا سے کہا "پھر مجھے خیال آیا کہ تمہارا زیادہ تر وقت تو فیکٹریوں میں ہی گزرا کرے گا۔"

منیبہ فیصل۔ ڈہرکی

کامیابی کا راز

چارلس ڈکنس سے ایک موقع پر کامیابی کا راز دریافت کیا گیا تو اس نے جواب دیا۔
"میں نے کبھی ایسے کام کو ہاتھ نہیں لگایا جس میں، میں اپنی ساری طاقتیں صرف نہ کر سکوں۔"

السرنگ۔ ملتان

پرستار

ایک تقریب میں ایک مشہور مصنف کا تعارف ایک خاتون سے کروایا گیا۔ وہ بولیں۔
"اوہ ہاں... آپ تو بہت مشہور شخصیت ہیں مجھے آپ کے سب ناول بے حد پسند آئے، خاص طور پر، ناول تو بہت ہی اچھا تھا۔ کیا نام تھا اس کا... یاد نہیں آ رہا... کہانی بھی یاد نہیں آ رہی۔ بہت اچھا پلاٹ تھا۔ مگر... اس وقت ذہن میں نہیں آ رہا۔ ارے وہی ناول جس کے ٹائٹل پہ لڑکی نے گلابی رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اور اس کے کانوں میں ڈائمنڈ کے جھمکے تھے...۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

اقوال جبران

٭ بہترین انسان وہ ہے جب اس کی تعریف کی جائے تو وہ شرمندہ ہو اور جب اس کی برائی کی جائے تو وہ خاموش رہے۔
٭ زیب و زینت کی نمائش کم ظرفی کی دلیل ہے۔
٭ جو شخص سوال پوچھنے میں تیز ہو، وہ جواب دینے میں کمزور ہوتا ہے۔
٭ اقوال بے معنی ہیں جب تک یہ عادات پر اثر انداز نہ ہوں۔
٭ جو لوگ تمہاری خدمت کرتے ہیں اس کے بدلے میں سونے کے ڈھیر بھی انہیں دو تو یہ کوئی بڑی قیمت نہیں ہو سکتی تو انہیں اپنا دل پیش کرو یا جبران کی خدمت کرو۔

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

عمل

لفظ کسی بھی تعلق یا رشتے میں بہت اہم ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی بڑے بڑے لفظ بھی بے جان ہو کر کھوکھلے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور ایک چھوٹا سا عمل بہت جان دار اور موثر ثابت ہوتا ہے۔

نصرت منیر۔ کہروڑ پکا

الفاظ چنتے ہیں

* اپنی مرضی اور اللہ کی مرضی میں فرق کا نام غم ہے۔
* کوئی آپ کی بات بھی سننا گوارا نہ کرے، اس سے بڑی آپ کی توہین اور کیا ہوگی۔
* زندگی میں تجربات کیجیے، انسان تجربے ہی سے سیکھتا ہے۔
* ذہن میں اچھے خیالات کو جگہ دیجیے۔ آپ خیر خواہ دوستوں میں رہیں گے۔
* اپنے اردگرد کے برے ماحول پر چیخنے چلانے سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ وہ جیسے لیتے ہیں دوستوں کے درمیان اس کے تدارک کے لیے بولیں گے تو بہتر بھی ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس خراب ماحول سے خود کو بچائیں۔ آپ ایک خاندان بچا لیں گے۔
* اس جہاں میں انسان نے دولت مند بننے کے جائز طریقے بھی سیکھے ہیں وہ انہیں ناکافی لگتے ہیں۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کھرڈ بیگا

اخبار

ایک امریکی باپ نے اپنی بیٹی سے شکوہ کیا۔
"دیکھو جولیا! میں اتنا تنگ نظر باپ نہیں ہوں کہ رات کو دیر تک تمہارے منگیتر کے ٹھہرنے پر اعتراض کروں۔ اگر وہ صبح تک تمہارے پاس بیٹھ کر تمہیں اپنی محبت کا یقین دلاتا رہتا ہے تو بے شک دلاتا رہے۔ مگر بیٹی اس سے کم از کم اتنا ضرور کہہ دینا کہ صبح کو اپنے گھر واپس جاتے ہوئے وہ ہمارا اخبار ساتھ لے جانا چھوڑ دے۔"

عائشہ۔ گوجرہ

دیر تا خیر

ایک معروف اداکارہ نے کسی سیٹھ صاحب کے خلاف بدتمیزی کرنے پر تھانے میں ان کی رپورٹ درج کرائی۔
"سیٹھ صاحب نے آپ سے کب بدتمیزی کی؟" تفتیشی افسر نے پوچھا۔
"پچھلے ہفتے۔" اداکارہ نے جواب دیا۔
"تو آپ نے پچھلے ہفتے ہی رپورٹ کیوں نہ درج کروائی؟" تفتیشی افسر نے حیرت سے پوچھا۔
"اس وقت تک ان کا دیا ہوا چیک ڈس آنر ہو کر بینک سے واپس نہیں آیا تھا۔" اداکارہ نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

صائمہ جمیل۔ کراچی

سرگوشی اہلِ دل

* تعلق ٹوٹا ہو یا بڑا، اس کے اندر تعلق کا امکان رکھا اس کی اس زخم کو نسل کی طرح ہوتا ہے، جو کسی بھی لمحے جب بات تہرانے لگتی ہے۔
* خواہش ضرورت بن جائے تو تکمیل کے لیے ناجائز راستے کھل جاتے ہیں۔
* بعض عکس ڈالنے والا عمل زیادہ فساد و شمار یعنی نتیجہ توقعات کے برعکس لاتے ہیں۔
* قسمت کے کھلنے کا انتظار نہ کریں بلکہ آگے بڑھ کر دستک دیں۔
* محبتیں اجتماع کو جنم دیتی ہیں اور اجتماع محبتوں کو۔
* انسان جب تک خاموش رہتا ہے اپنا اسرار قائم رکھتا ہے اور جب وہ بولتا ہے تو اپنا بھید کھول دیتا ہے۔
* انسان خوابوں کی کشش کے آگے ہار جاتا ہے۔
* غریب کے پاس صرف دو سکے ہوتے ہیں۔ ایک خوشی (دوسرے کے لیے) اور دوسرا خودداری (اپنے لیے)
* میری صرف ایک سانس میری اوقات ہے۔
* مرد وہ ہے جسے زندگی، عورت اور محبت کو برتنے کا فن آتا ہے۔
* خوب صورت اور مال دار لوگوں کی آدھی دلیل ان کا حسن اور ان کا مال ہوتا ہے۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کھرڈ بیگا

خالدہ جیلانی

سمیرا سبحان ــــــــــــ کراچی

دشمنی سا ہے اس شہر کے لوگوں سے تعلق
برسوں جیسے ڈرتے بھی رفاقت نہیں مرتی

شمائلہ فرقان ــــــــــــ فیصل آباد

آداب سفر اب وہ سکھاتے ہیں جنہوں نے
دو چار قدم طے یہ مسافت بھی نہیں کی

سونیا صابر ــــــــــــ بہاولپور

دیے منڈیر پہ رکھ آتے ہیں ہم ہر شام نجانے کیوں
شاید اس کے لوٹ آنے کا کچھ امکان ابھی باقی ہے

انیلا ناہید ــــــــــــ سکھر

بہت سجائے تھے آنکھوں میں خواب میں نے بھی
سہے ہیں اس کے لیے یہ عذاب میں نے بھی

مہوش نمر ــــــــــــ لیہ

انا کی جنگ میں ہم جیت تو گئے لیکن ابھی لکھنا ہے
خود کو کیوں کر سکتے ہیں، بستہ دوبارہ ڈھونڈ لیتے ہیں

ناجیہ اکبر ــــــــــــ لاہور

متاع عمر عزیز ساری، گنوا چکے پر سفر ہے جاری
عجیب سودا ہے عاشقی کا کہ نفع سود و زیاں نہیں ہے
مری خموشی پہ ہنسنے والو! یہ سنبھل کر کبھی نہ سوچ لینا
کہ میرے پہلو میں دل نہیں ہے کہ میرے منہ میں زباں نہیں ہے

ایس۔ آر مسکان ــــــــــــ جام پور

جب سے تم روٹھے اے دوست
عید بھی ہم سے روٹھ گئی ہے

شمع مسکان ــــــــــــ جام پور

کتنی مشکل سے فلک پہ نظر آتا ہے
عید کے چاند نے انداز تمہارے سیکھے

ملیحہ تابش ــــــــــــ کراچی

یہ جو میرا رنگ ہے روپ ہے یونہی بے سبب نہیں دوستو
میرے خوشبوؤں سے ہیں سلسلے میری نسبتیں ہیں گلاب سے

الماس ملک ــــــــــــ ملتان

پانی کی ضرورت ہے محبت کے شجر کو
پتھر پہ کبھی پیڑ اگائے نہیں جاتے
احساس اگر ہو تو وفا پھولے پھلے گی
دستور محبت سکھائے نہیں جاتے

رخسانہ بخشی ــــــــــــ ملتان

کھیل ہیں یہ سارے مقدر کے
ٹوٹ گئے گھر اندر سے ڈر کے
کس سے ہم نقش الم لکھیں
لوگ سارے ملے مجھے پتھر کے

تہمینہ اکرم ــــــــــــ گاؤں کوٹلی پھرات

نیا موسم میری بینائی کو تسلیم نہیں
میری آنکھوں کو وہی خواب پرانا لوٹا دے
جس کی آنکھیں مجھے اندر سے بھی پڑھ سکتی ہوں
کوئی چہرہ تو میرے شہر میں ایسا لا دے

جگنو ــــــــــــ لودھراں

مختصر محبت کا مختصر انجام
تم بچھڑے ہم بکھر گئے

نمرہ افرا ــــــــــــ کراچی

بستی بھی، سمندر بھی، بیاباں بھی مرا ہے
آنکھیں بھی مری، خواب پریشاں بھی مرا ہے
جو ڈوبتی جاتی ہے وہ کشتی بھی ہے میری
جو ٹوٹتا جاتا ہے وہ پیماں بھی مرا ہے

ثمرہ اقصیٰ کی ڈائری سے

مصر کی سرزمین پر حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ اخوان ظلم کے خلاف برسر پیکار ہیں۔ اس پس منظر میں لکھی یہ نظم میں نے ماہنامہ پکار میں پڑھی۔ آپ کی نذر۔

لہو میں بھیگے تمام موسم
گواہی دیں گے کہ تم کھڑے تھے
وفا کے رستے کا ہر مسافر
گواہی دے گا کہ تم کھڑے تھے
جب اندھیرے کی کوکھ میں سے نکلنے والے
یہ سوچتے تھے کہ کوئی جگنو نہیں بچا ہے
سحر کا سورج گواہی دے گا کہ تم کھڑے تھے
تمہاری آنکھوں کے طاقچوں میں جلے چراغوں کی روشنی نے
نئی راہ ہمیں دکھائی
جدھر بھی دیکھا نظر اٹھا کر
تم ہی کو پایا، تم ہی کھڑے تھے

جگنو۔ لوز دار کی ڈائری سے

زندگی کی نمود ہمیشہ محبتوں اور چاہتوں سے شروع ہو کر ان ہی جذبوں پر ختم ہوتی ہے۔ محبتیں اور چاہتیں ختم ہو جائیں تو زندگی ہی نہیں رہتی۔ احمد فراز کی یہ خوبصورت غزل ایسی ہی محبتوں اور چاہتوں کی کشمکش کی عکاسی ہے۔

گرفتہ دل عندلیب، گھائل گلاب دیکھے
محبتوں نے سبھی رتوں میں عذاب دیکھے

یہ صبح کاذب تو رات سے بھی طویل تر ہے
کہ جیسے صدیاں گزر گئیں آفتاب دیکھے

وہ چشم محروم کتنی محروم ہے کہ جس نے
نہ خواب دیکھے نہ جگنوؤں کے عذاب دیکھے

کہاں کی آنکھیں کہ اب تو چہرے پہ آبلے ہیں
اب ان آبلوں سے بھلا کوئی کیسے خواب دیکھے

عجب نہیں ہے جو خوشبوؤں سے ہے شہر خالی
کہ میں نے دہلیز تا تماں پر گلاب دیکھے

خوشبو رباب چیمہ کی ڈائری سے

کبھی کبھی ترک الفت کرنے والوں کے درمیان اتنے فاصلے پیدا ہو جاتے ہیں کہ کوئی تعلق بھی باقی نہیں رہتا۔ اس طرح کی شاعری بہت اثر کرتی ہے۔ جیسا کہ یہ غزل ہے۔

ربط قائم نہ رابطہ باقی
رہ گیا ہم میں فاصلہ باقی

اب شکایت ہے نہ گلہ باقی
وہ تعلق نہ رہ گیا باقی

کوئی چارہ نہ تھا سوا اس کے
ترک الفت ہی تھا دوا باقی

تم نے اچھا کیا پہل کر کے
مجھ میں کب تھا یہ حوصلہ باقی

اور تو کچھ نہیں رہا باقی
رہ گیا ذات میں خلا باقی

تیرے جانے کے بعد جیون میں
بس ہوں یا میرا خدا باقی

رخسانہ رخشی کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سعداللہ شاہ کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

عجب طرح سے سوچا ہے زندگی کے لیے
کہ زخم زخم ہیں کھلتا ہوں ہر خوشی کے لیے

وہ مجھ کو چھوڑ گیا تو مجھے یقین آیا
کوئی بھی شخص ضروری نہیں کسی کے لیے

سوال یہ ہے کہ اس نے کبھی نہیں پوچھا
کہ آپ سوچتے کیسے ہیں شاعری کے لیے

اسے خبر ہے کہ اس کا کوئی نہیں اپنا
اک آشنائی بھی کافی ہے اجنبی کے لیے

خطا کسی کی ہو لیکن سزا کسی کو ملے
یہ بات جبر نے چھوڑی ہے ہر صدی کے لیے

یہ سادگی تھی مری یا کہ سعد چاہت تھی
کہ میں نے خود کو پیش کیا دل لگی کے لیے

ثریا شاہ کی ڈائری سے

دل پر اداسی کی کیفیت طاری ہو تو کوئی بھی چیز دل کو نہیں بہلاتی۔ اسی کیفیت کی عکاس عبدالحمید عدم کی یہ غزل آپ کی نذر۔

ساقی شراب لا کہ طبیعت اداس ہے
مطرب رباب اٹھا کہ طبیعت اداس ہے

چبھتی ہے قلب و جاں میں ستاروں کی روشنی
اے چاند ڈوب جا کہ طبیعت اداس ہے

شاید ترے لبوں کی چٹک سے ہو جی بحال
اے دوست مسکرا کہ طبیعت اداس ہے

ہے حسن کا فسوں بھی علاج فسردگی
رخ سے نقاب اٹھا کہ طبیعت خراب ہے

میں نے کبھی یہ ضد تو نہیں کی پر آج شب
اے مہ جبیں نہ جا کہ طبیعت اداس ہے

توبہ تو کر چکا ہوں مگر پھر بھی اے عدم
تھوڑا سا زہر لا کہ طبیعت اداس ہے

جگنو فرزداد کی ڈائری سے

محسن نقوی ہر دلعزیز شاعر ہیں۔ اُن کی ایک خوبصورت غزل آپ سب قارئین کے لیے۔

عجب ہیں راستے میرے کہ چلنا بھی نہیں ممکن
ذرا ٹھوکر جو لگ جائے سنبھلنا بھی نہیں ممکن

تیرا چہرہ میری نظروں میں وہ منظر سا ہو جائے
کہ اب بھیگی ہوئی پلکوں کو ملنا بھی نہیں ممکن

ملے ہیں بعد مدت کے تو اک مسرور ہیں ایسے
کہ جلنا بھی نہیں ممکن پگھلنا بھی نہیں ممکن

تعلق ٹوٹ جانے سے امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں
دلوں میں حسرتیں لے کر بہلنا بھی نہیں ممکن

بہت ناکامیاں لے کر رہا ہوں خاک کا قیدی
چلو اب آج سے گھر سے نکلنا بھی نہیں ممکن

اسے اتنا نہ سوچا کر تجھے عادت نہ پڑ جائے
پھر ایسی عادتیں محسن بدلنا بھی نہیں ممکن

خط لکھنے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

شبانہ شوکت ۔۔۔ حیدر آباد

مجھے اگست کے خواتین ڈائجسٹ میں لکھی گئی ساجدہ یاسمین کی کہانی کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ کزن میرج (قریبی رشتہ داروں میں شادی) میں عموماً" بچے ابنارمل ہی پیدا ہوتے ہیں تو ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں خاندان میں شادی کو ترجیح دینے کا حکم فرمایا تھا۔ ان کی فرمائی ہوئی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ خاندان میں شادی سے ہونے والے بچے ہی ابنارملٹی کا شکار ہوتے ہیں، ہندوؤں کے عقائد کی تقلید کرنا ہے۔ جو کزنز کو بہن بھائی کے برابر کرداتے ہیں۔ اور خاندان سے باہر شادی کرتے ہیں۔ خاندان میں شادی کو وجہ نہ بنائیے بلکہ اصل وجوہات کو تلاش کیجیے ورنہ ادھورے علم کی بنا پر لکھی گئی کہانیوں سے کئی ناپختہ ذہن متاثر ہو سکتے ہیں۔ بچوں کی ابنارملٹی میں پولیو کی بیماری بھی تھی جو الحمدللہ اب تقریباً" ختم ہو چکی ہے۔ ٹھیک اسی طرح دوسری بیماریاں جو پیدائشی بچوں کو لاحق ہوتی ہیں ان میں ماں کا خود بیمار ہونا، ماں کے اندر کسی پیچیدگی کا ہونا، ماں اور باپ کا خون میچ نہ کرنا جیسے ماں کا خون RH پازیٹو اور باپ کا نیگیٹو تو اس سے بچے کے اندر کوئی کمی رہ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے دوران حمل اور ڈلیوری کے فوراً" بعد زچہ کو ایک مخصوص انجکشن لگایا جاتا ہے تاکہ کسی پیچیدگی سے بچا جا سکے۔ میں اپنی مثال دوں کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے جو نہ ٹھیک سے بولتا ہے نہ پڑھتا ہے اور نہ ہی صحیح سے چلتا پھرتا ہے۔ ابنارمل تو نہیں ہے لیکن بالکل ٹھیک بھی نہیں ہے۔ پریگننسی میں مجھے ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا اور ہوتے ہوئے واش روم میں پاؤں پھسل جانے سے میں گر گئی تھی۔ ورنہ میری اور شوکت کی تو بالکل ہی الگ الگ خاندانوں میں ہونے والی شادی ہے۔ یہ لوگ راجپوت ہیں اور ہم مغل تو پھر میرا بچہ ایسا کیوں ہوا اور کیا ہندوؤں میں کبھی ابنارمل بچے نہیں دیکھے گئے؟ کیا وہ باہر شادی کرنے کی وجہ سے بالکل نارمل بچوں کے ماں باپ بنتے ہیں۔ ان چیزوں پر غور کیجیے ورنہ اس طرح کی کہانیوں سے کئی نوعمر بچیاں اپنے طے شدہ رشتوں سے انکار کر کے والدین کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتی ہیں اور آج کل اچھے رشتے ملنا ویسے ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

ج: شبانہ! آپ نے بالکل درست لکھا ہے۔ اولاد کا نارمل یا ابنارمل ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مرضی ہوتی ہے۔ اس کے لیے کوئی بھی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ عموماً" ڈاکٹرز یہ بات کہتے ہیں کہ آپس کی شادیاں اس کا سبب ہو سکتی ہیں۔ لیکن دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ یہ بات سو فیصد درست نہیں ہے۔ نہ ہی کزنز کے درمیان شادی کو اس کی وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ خود ہمارے علم میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں جہاں بالکل الگ خاندانوں میں شادیاں ہوئی ہیں اور ان کے بچے نارمل نہیں ہیں۔ آپ نے خط لکھ کر وضاحت کی اور ہمیں احساس دلایا۔ تہہ دل سے شکریہ۔ لیکن ایک وضاحت کر دیں کہ کہانی میں ان کے خاندان میں ابنارمل بچے پیدا ہوتے تھے اور آپس کی شادیوں کی وجہ سے اس بیماری کے بڑھنے کا امکان تھا۔

کنول مشتاق ۔۔۔ سعدیہ سیداں گجرات

ہر ماہ کا شمارہ میرے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ گھر

میں بہنوں اور کزن اور بھابھیوں کو مزے مزے کے ناول پڑھ کر سنانا میری ذمہ داری ہوتی ہے۔ مگر اگست کا شمارہ میرے لیے بری خبر بھی لے کر آیا۔ میرے اسکیچز شائع نہ ہونے پر بہت دکھ ہوا۔ ابھی وقت باقی ہے اس شمارے کا بہترین ناول تھا۔ زری نے نہ صرف اپنی زندگی خراب کی بلکہ اپنے بچوں کو بھی ماں اور باپ کی شفقت سے محروم رکھا۔ "مقدمہ دل" اسنیٰ عزت کا ناول تھا کہ بے ساختگی میں دوبارہ پڑھا۔ "بارش کے ہاتھوں میں پھول" میں امائم کا کردار بہت بہت اچھا تھا۔ "تحمل" کی دوسری قسط "فریب کار" پہلی قسط "تمارا سعدی" سے بھی زیادہ اچھی تھی۔ عہد الست کے تو کیا ہی کہنے۔ ہر ماہ اس ناول سے محبت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ وہ چہرہ کیسے ہی نور محمد لیکن وہ برطانیہ کیسے پہنچ گیا۔ تجسس ابھی باقی ہے تیزی کی! "کوہ گراں" کی آخری قسط کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔ افسانے میں "میکے اور سسرال کی عید" اور "ہم انگریز نہیں" دل کو چھو گئے۔ بلال قریشی کا انٹرویو پڑھ کر مزہ آیا۔ "کرن کرن روشنی" پڑھ کر ہم بہت سے برے اور غلط کاموں سے رک جاتے ہیں۔

ج: پیاری کنول! ہمیں آپ کے دکھ کا احساس ہے۔ لیکن یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ حوصلہ مند ہیں' مایوس نہیں ہوتیں۔ زندگی میں وہی لوگ کامیاب رہتے ہیں جو ہمت نہیں ہارتے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے

ہیں۔

مسرت اللہ شمس احمد ۔۔۔ کراچی

اس بار رمضان المبارک کا مہینہ ہمارے لیے بہت ہی منفرد تھا۔ اللہ نے ہمیں ایک انوکھی خوشی سے ہمکنار کیا میری چھوٹی بہن ندا الطاف کا رشتہ طے ہو گیا ہمارے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اللہ ہمیں اتنی بڑی خوشی سے نوازے گا۔ آپ سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے تو اسی لیے سوچا آپ سے شیئر کروں۔ اور ہاں 14 اگست کے حوالے سے یہ کہنا بھول ہی گئی۔ آپا ہم ہر سال 14 اگست کو اپنے گھر میں چھوٹا سا فنکشن ضرور ارینج کرتے ہیں سب کزنز کو انوائٹ کرتے ہیں۔ گھر کو خوب دل لگا کر سجاتے ہیں۔ کیمرے وغیرہ کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ سب کزنز مل کر پیارا سا ملی نغمہ گاتے ہیں۔ خوب موج مستی اور ہلا گلا کرتے ہیں۔ یہ

دن ہمارے لیے بہت ہی یادگار ہوتا ہے۔

ج: تبصرہ کرتے ہوئے بہت افسوس ہوتا ہے ہم خود کو پاکستانی کہتے ضرور ہیں لیکن ہم نے پاکستان کا کوئی حق ادا نہیں کیا۔ سال بھر تک کہ 14 اگست کو اتنا سا سلیبریٹ نہیں کیا جاتا جتنا کرسمس اور ویلنٹائن ڈے والے دن جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ جب کہ پاکستان نے ہمیں پہچان دی۔ ہمیں تحفظ دیا۔ ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔

فہرست پر نظر پڑی تو نایاب جیلانی کا نام دیکھ کر خوشی سے چیخ نکل گئی۔ "من مانی دنیا" یہ قسط بہت ہی شاندار تھی اگر کہا جائے عون اور ثانیہ کی تکرار اور ان کی نوک جھونک ہی اس ناول کی جان ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ورنہ ایسا کیا ہے کہ معیز کی غیر متعلقی اور رباب کی چالاک فطرت پڑھ کر وہ الجھن محسوس نہیں ہوتی۔ "تحمل" مائی فیورٹ۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی نمرہ احمد نے کمال کی ڈرافٹ اور منفرد اسٹوری کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اتنا شاندار اور سحر انگیز ناول پڑھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ مجھے سب سے زیادہ سعدی کا کردار پسند آیا۔ "بارش کے ہاتھ میں پھول" بہت ہی سبق آموز ناول تھا۔ "عہد الست" بہت ہی انٹرسٹنگ اسٹوری ہے۔ زار اور شہوز میرے فیورٹ کردار ہیں۔ یہ جان کر کہ وہ بچہ نور محمد ہے میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ ٹی کا کردار تجسس سے بھرپور ہے۔ "مقدمہ دل" بہت ہی فنٹاسٹک اور سپرہٹ ناول تھا۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ نایاب

ہم آپ کو ایسے ہی نہیں پسند کرتے۔ "ابھی وقت باقی ہے" صحیحہ صدف نے بہت ہی اہم ٹاپک پر قلم اٹھایا۔ موضوع بہت ہی جاندار تھا۔ ثنا کی تربیت ایک ماں سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔

ناول حقیقت کے بہت ہی قریب تر محسوس ہوا۔

"مائیں بیٹیوں کی راہوں میں پھول بچھاتے بچھاتے انہیں کانٹے چننے کا ہنر نہیں سکھاتیں پھر ایسی بے ہنر ناتجربہ کار بیٹیاں سسرال کی راہوں میں بچھے کانٹے چننے کی کوشش میں اپنی انگلیوں کی پوریں چھلنی کر بیٹھتی ہیں" مائیں کس قدر خوش فہم ہوتی ہیں کہ جیسے ان کی یہ خوشحالی ہمیشہ قائم رہے گی۔ "ویل ڈن افسانوں میں "میکے اور سسرال کی عید" نے بہت زیادہ انسپائر کیا بہت ہی متاثر کن تحریر تھی حقیقت کے بہت ہی قریب تر محسوس ہوئی۔ "دوسرا عشق" بہت ہی تکلیف دہ تحریر تھی۔

ج : پیاری مسرت! آپ ہر ماہ خواتین کی محفل میں شرکت کرتی ہیں تو آپ سے قربت اور اپنائیت کا احساس ہمارے دل میں بھی ہے۔ بہن کا رشتہ پکا ہونے کی خبر سن کر دلی مسرت ہوئی ہے۔ آپ سب کو مبارک باد اور ندا کے لیے دعائیں بھیج۔ ستمبر کے یادگار دن آپ کے بھانجے راحیل صاحب دنیا میں تشریف لائے۔ 14 اگست کو واقعی شان و شوکت سے منانا چاہیے ہمارا قومی تہوار ہے کم از کم اس دن سب کو متحد نظر آنا چاہیے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مسز ربیعہ ضیاء۔۔۔ اسلام آباد

میں تقریباً" 25 سال سے خواتین اور شعاع کی خاموش قاریہ ہوں۔ شادی ہو گئی 'بچے بھی ہو گئے ان حالات میں کئی دفعہ ساتھ چھوٹا کئی دفعہ جوڑا۔ شادی کے بعد کی زندگی بھی تقریباً" تمام خواتین کی طرح سسرال اور شوہر کے جھمیلوں سے گزری۔ لیکن شعاع اور خواتین کی وجہ سے کئی معاملات سلجھا لیے گئے۔ میں ہمیشہ اس بات کا اعتراف کرتی رہوں گی کہ ادارہ خواتین نے ہمیشہ مثبت سوچ کو فروغ دیا۔ ادارہ خواتین نے ہمیشہ قلم کا حق ادا کیا ہے۔ پاکستانی میڈیا ہمیشہ یہودیوں کے زیر اثر رہا ہے۔ ملائشیا کے سابق صدر مہاتیر محمد نے کہا تھا کہ "مٹھی بھر یہودیوں نے پوری دنیا کو یرغمال بنایا ہوا ہے" اور پاکستانی میڈیا پر تو اس کی خاص نظر ہے۔ مجھے ہمیشہ ہی "پہلی شعاع"

"اور "کچی مٹی" نے بہت بہت متاثر کیا ہے کہ کوئی تو ہے جو حق بات کہتا ہے (اللہ پاک اس میں مزید برکت دے آمین)

آج میں نے اتنے سالوں کے بعد قلم کیوں اٹھایا اس کی وجہ صرف نمرہ احمد کا ناول "نمل" ہے۔ لفظ قرآن پاک میں ن پر زبر ہے لیکن نمل جس کا مطلب چیونٹی ہے۔ نمرہ احمد جب بھی لکھتی ہیں کمال کا لکھتی ہیں۔ سائرہ رضا گویا سورج کو چراغ دکھانا۔ ہر دفعہ ایک چونکا دینے والا موضوع۔

ج : ربیعہ! آپ 25 سال سے خواتین اور شعاع کی قاری ہیں لیکن ایک بار بھی نہیں خط نہیں لکھا جبکہ آپ بہت اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔ آپ کا پورا تبصرہ شائع نہ کر سکے۔ صفحات کی مجبوری ہے آپ اپنی امی کو کہانیاں پڑھ کر سناتی ہیں اور آپ نے بچے بھی ہمارے پرچے پڑھتے

ہیں۔ یعنی شعاع اور خواتین ایک وقت تین نسلوں کا پسندیدہ پرچا ہے۔ یہ بلاشبہ بہت بڑی بات ہے۔

مدثرہ فردوس۔۔۔ وینہ ضلع جہلم

اب کے خواتین نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس شمارے میں ثمینہ عظمت صاحبہ کا افسانہ سب سے زیادہ داد کا مستحق ہے۔ ام مریم عبد الست بھی بہترین انداز میں آگے بڑھ رہا ہے اور نمرہ احمد صاحبہ کے تو کیا کہنے ہیں۔ بہترین اسلوب تحریر' تجسس اور موضوع کی انفرادیت یہ سب چیزیں ان کی تحریر کا خاصہ ہیں۔

ج : مدثرہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ثمینہ عظمت اور دیگر مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں۔

نوشین فیاض۔۔۔ لاہور

سات سال پہلے میں نے اس ہستی کو کھویا تھا جس کے ہونے سے میرے ہونے کا ثبات تھا۔ میرے ابو۔۔۔ پھر دو ہی سالوں بعد ماں جیسی شفیق ہستی زندہ ہوتے ہوئے بھی دوسری شادی کر کے ہمیں رونا بلکتا چھوڑ کر نئی زندگی میں مصروف ہو گئی تو بغیر جرم کے بھی دنیا والوں کی نظر میں ہم مجرم ٹھہرے۔

کوقلیم سے شادی بچانیوں کی ایسی بے اعتباری کہ جائے کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے۔ عزیز' قرابت دار' تسلی تشفی اور مددگار رہنے کے بجائے ذات کے بخیے ادھیڑتے کہ خدا کی پناہ۔

یوں لگتا تھا درد کی رات کبھی ختم نہیں ہو گی۔ زندگی میں پھول' تتلیاں پکڑنے' چمکتے جگنو قید کرنے اور ٹھنڈی میٹھی راتوں میں امراز ستاروں سے باتیں کرنے کے موسم آئے ہی نہیں۔ گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگی تو پڑھائی از خود چھوٹ گئی لیکن دل سے پڑھنے کا شوق نہیں نکل سکا۔ اسی شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر خدا جانے کس کس سے کتابیں مانگ کر پڑھیں کس کس طرح راتے کے پیچ و خم کیے اور مضبوط قدموں سے آگہی کی منزلیں چڑھتی گئی۔ فرسٹ ایئر سے شروع ہونے والا سفر ایم اے کرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوا۔ یہ اللہ عزوجل کی خاص نظر کرم ہے کہ بغیر استاد بغیر کسی ادارے کے یہاں

تک آ پہنچی ہوں۔ آٹھ سال اکتوبر میں اللہ نے ایک اور کرم عنایت کیا کہ میں اپنی تمام تکلیفیں بھول گئی ہوں۔ ابھی اسی احسان کا شکر ادا کر ہی نہیں سکی تھی کہ حدید احمد میرے بیٹے کی صورت سجدہ ریز ہونے کی اک اور وجہ فراہم کر دی۔

خواتین اور شعاع کی بہت پرانی قاری ہوں۔ (سات آٹھ سال کی عمر میں جب سب بچے بمشکل نصاب کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ آپ سب سے میں نے صبر کرنا سیکھا ہے، پُر امید رہنا سیکھا ہے، اندھیروں سے روشنی کشید کرنا سیکھا ہے، کمپرومائز کرنا سیکھا ہے..... زندگی جینا سیکھا ہے۔

ہر ماہ کوئی نہ کوئی تحریر ایسی ہوتی جو ہمت دیتی اور کہتی "کہانیاں زندگی سے ہی لی جاتی ہیں" آج مجھے زندگی میں اتنا کامیاب بنا کر خواتین اور شعاع نے اتنے سالوں کے تعلق کا حق ادا کر دیا ہے۔ تہہ دل سے آپ سب کی شکر گزار ہوں۔

ج : پیاری نوشین! آپ کا خط پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ نے ہمت نہیں ہاری کوشش کی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوشیاں عطا کیں۔ بلاشبہ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔ اللہ آپ کو آئندہ زندگی میں ہر آزمائش سے محفوظ رکھے۔ آمین خواتین اور شعاع نے آپ کو حوصلہ اور ہمت عطا کی آپ کا یہ اعتراف ہمارے لیے بے حد قیمتی ہے۔ اس لیے کہ ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ مایوسی کے اندھیروں میں امیدوں کے جگنو روشن کر سکیں۔

پاکیزہ ہاشمی ..... بھاول پور

اس بار لکھنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا وجہ تین ماہ سے لکھ رہی ہوں مگر شاید آپ کو میرا لکھنا پسند نہیں آیا۔ ایک گزارش ہے نمرہ احمد سے کہ پلیز پلیز آپ سعدی یوسف کو مار مت دیں کہانی کی جان ہے۔

ج : پیاری پاکیزہ! خط شائع نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں آپ کا لکھنا پسند نہیں ہے وجہ صرف صفحات کی مجبوری ہوتی ہے آپ کا پیغام نمرہ احمد تک پہنچا رہے ہیں۔ لیکن آپ نے یہ کیسے سوچا کہ نمرہ سعدی یوسف کو مار سکتی ہیں خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نوشابہ منظور ..... بھاول پور

سب سے پہلے تو "گوہر اس" پڑھا آخر آپا رابعہ "نگرا" سمور سواری سراج اور بلال سلطان کھنے سامنے آہی گئے۔ باذوق کو سعد کا سراغ مل گیا۔

اب بات ہو جائے رسالے کی جان (میری نظر میں) نمل زبردست۔ میرا ایک اندازہ تو صحیح نکلا کہ زمر اور فارس کی جوڑی بنے گی۔ ہائے سعدی اتنا اچھا ہے اسے کچھ نہ ہو جائے، ہاشم اور حنین۔ ہاشم تو اسے بیٹا کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور وہ.....؟

"عہد الست" میں وہ بچہ نور محمد بے جان کے حیرت ہوئی تو بہ کوئی باپ اس طرح بھی کر سکتا ہے۔

افسانوں میں میکے اور سسرال کی مہرو اچھا لگا۔ باقی سلسلے بھی زبردست تھے۔

ج : پیاری نوشابہ! دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے، ہر انسان اپنی علیحدہ فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ نور محمد کے باپ کی فطرت میں سختی تھی، وہ اپنی فطرت سے مجبور تھے ان کا نظریہ تھا کہ بچوں پر سختی نہ کی جائے تو وہ بگڑ جاتے ہیں اسی لیے انہوں نے نور محمد کے ساتھ یہ رویہ رکھا۔

نمرہ کشور کوثر پروین ..... میلسی

یہ "نمل" کیا لفظ ہے؟ اس کے معنی بتا دیں۔ آپ کا موجودہ ناول نہیں بہت پسند آیا ہے۔ حنین کا کردار دلچسپی کا حامل ہے کہ "ہیں کو ایک کچھ نظر آتے ہیں جو" دوسرا عشق "بھی اچھی تحریر تھی۔ فرحین عظمت علی شکریہ دعائیں قبول ہو گئیں آپ تشریف لے آئیں "ہم کوئی انگریز ہیں" بہت اچھی تحریر تھی۔ آخری لائنوں نے آنکھیں نم کر دیں۔ شاہ جہاں کل اتنا مزہ آیا آپ کا پہلا افسانہ پڑھتے ہوئے "سفر کہانی کے" میں ہماری پیاری رائٹر کی نصیحت کو گرہ سے باندھ لیا۔ انیسہ سلیم کو پیغام پہنچا دیں۔ اب تو نظر کرم کر دیں۔ "کوئی منتی" پڑھا۔ فلسطین و کشمیر کے حالات ترلا گئے آخر کیا حد ہے اس ظلم اور درندگی کی؟ ان حالات میں تنزیلہ ریاض کا افسانہ "قلب عباس" شدت سے یاد آیا۔ یا اللہ مسلمانوں کے حال پر رحم فرما!

ج : نمرہ! نمل کے معنی چیونٹی کے ہیں۔ چیونٹی بہت چھوٹی، کمزور اور حقیر مخلوق ہوتی ہے لیکن یہ ہاتھی جیسے طاقت ور کی سونڈ میں گھس جائے تو اسے بے بس کر دیتی ہے۔ اسی طرح بظاہر چھوٹے، معمولی اور کمزور لوگ بھی کبھی بہت طاقت ور لوگوں کو بے بس کر دیتے ہیں۔ ان کا

یہاں تو پانی کا رنگ ... آئیں اور پی کر جائیں۔ آزمائش شرط ہے!

ج : پیاری شاہ! پاکستان کو قدرت نے بے بہا نعمتوں سے نوازا ہے آپ کا خط پڑھ کر یہ یقین اور پختہ ہوا۔ صرف چند لوگ ہیں 'سازشی' فسادی۔ انہوں نے ہماری ترقی' خوشحالی کا راستہ روکا ہوا ہے۔

یاسمین حنفی ..... کراچی

اس بار سرورق قدرے ٹھیک تھا "کوہ گراں تھے ہم" کا مزہ آیا پڑھ کر۔ "بن مانگی دعا" اس بار کچھ خاص متاثر نہ کرسکا۔ "عہد الست" نے آخر اس بچے کا راز کھول ہی دیا لیکن..... ویسے مجھے لگتا ہے "علی" "احمد" ہی "معروف" ہوگا...... "مکمل" بھی اچھا تھا۔ کہانی اشارت میں نمرہ احمد کے معیار کی نہیں لگ رہی۔ ناول دونوں اچھے تھے' نایاب جیلانی کہانی کو خواہ مخواہ طول دیتی ہیں۔ جیسے دل اور جزا... اور اب یہ..... "ابھی وقت باقی ہے" زری کے جو حالات بیان کیے گئے۔ وہ ہر کہانی میں ایسے ہی دکھایا جاتا ہے کہ لڑکی کا شادی کے بعد گھر پر کوئی اختیار نہیں رہتا... ایسا نہیں ہوتا ہے ہر جگہ بعض والدین اور بھائی شادی کے بعد بھی بہنوں کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھتے ہیں۔ شادی ناکام ہو جاتی ہے..... تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں لڑکی کا قصور ہو اس لیے صرف لڑکی کو قصوروار قرار دینا یا اس کا ہی پچھتاوا دکھانا غلط ہے۔ افسانے بھی اچھے تھے... بلال قریشی سے ملاقات اچھی رہی۔ "سفر کمال کے" سائرہ رضا ہماری بہت فیورٹ رائٹر ہیں... لاہور کی تعریف میں شاید کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئیں..... انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ۔

"اگر ایک لفظ کہوں تو سبزہ' خوشبو' ہریالی کی باس جو کراچی کے کسی گملے سے بھی نہیں پھوٹتی۔" اسی طرح

کراچی جیسا بھی ہے ہمارے حساب سے تو وہ زمین پر جنت ہے۔ آپ کو اس طرح ہمارے جذبات کو روندنے کا حق نہیں پہنچتا۔

ج : پیاری یاسمین! ہر ملک' ہر شہر' ہر گاؤں کی کوئی انفرادیت' کوئی خوبی ہوتی ہے۔ لاہور میں سبزہ اور ہریالی ہے تو کراچی میں سمندر ہے جو پورے ملک میں کہیں نہیں ہے۔ افسوس کہ آپ سائرہ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکیں اور بلاوجہ جذباتی ہو گئیں۔ طلاق کے بعد لڑکی کے لیے میکے

... بہن بھائی ایک بھائی ہوتے ہیں جو طلاق یافتہ بہنوں کو رکھتے ہیں! عزت' محبت تو دور کی بات ہے۔ "مکمل" ہمارے حساب سے تو بہت دلچسپ ہے' ابھی آغاز ہے شاید اس لیے آپ کو ایسا لگا۔

حبیبہ رضوان ..... چکوال

فروری 2012ء خواتین ڈائجسٹ میں صوفیہ بشیر کا مکمل ناول "توبہ" شائع ہوا تھا۔ جس میں ڈاکٹر لیلیٰ بای ایرانی عورت کی کتاب "اسلام میں عورت کا درجہ" کے متعلق لکھا گیا تھا کیا یہ واقعہ سچ ہے یا مصنفہ کے اپنے قلم کی تخلیق ہے؟

ج : یہ کہانی مصنفہ کے ذہن کی تخلیق تھی۔

فائزہ مریم ..... جہلم

خواتین ڈائجسٹ اپنی اشاعت' طباعت اور تحریروں میں بے مثال ہے۔ میں بھی تخلیقی ہنر کو آزمانا چاہتی ہوں' کیا افسانہ اور مکمل ناول لکھ سکتی ہوں۔ نثر میں شاعری بھی کرتی ہوں۔

ج : پیاری فائزہ! آپ ضرور لکھیں۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

حوریہ خان' ماریہ خان ..... کراچی

انٹرویو میں بلال قریشی کو پڑھ کر اچھا لگا۔ ناولز میں نمرہ احمد کا ناول بہت ہی اچھا جا رہا ہے۔ سعدی بھی لگتا ہے "جہان" اور "افق" کی طرح لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن بننے والا ہے۔ "کوہ گراں" اور "بن مانگی دعا" بھی اچھے جا رہے ہیں۔ بن مانگی دعا میں معیز پر بہت غصہ آیا۔ اس کو اپنی ماں کا تھوڑا خیال رکھنا چاہیے۔ ایک خط میں کسی نے صحیح کہا تھا۔ نون اور نانیہ کی اور شفا کی جوڑی اچھی ہے۔

ناولٹ میں نایاب جیلانی اور نازیہ جمال کی ہم بہت بڑی فین ہوں۔ دونوں ہی بہت اچھا اور الگ لکھتی ہیں۔ افسانوں میں "میکے اور سسرال کی منو" بہت پسند آیا۔

ایف ایم 105 کے ریڈیو نیوز میں کراچی سے۔ آصف ملک رہائی اگر ہو سکے تو ان کا انٹرویو کریں۔

ج : پیاری حوریہ اور ماریہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ نے خط لکھا' بہت اچھا لگا۔ متعلقہ مصنفین

تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

اقراء ساجی ۔۔۔ طور، جہلم

جب سے ہوش سنبھالا ہے میں نے ان رسالوں کو اپنے اردگرد پایا۔ پہلے جب چھوٹے تھے تو خالائیں پڑھتی تھیں۔ مجھے شروع سے ہی قسط وار کہانیاں پڑھنے سے کوفت ہوتی تھی کیونکہ آئندہ ماہ تک انتظار نہیں ہوتا تھا۔ جب اپنی ماما کو "بن مانگی دعا" پڑھتے دیکھا تو پہلے غصہ آیا تھا کہ آپ کیا قسط وار کہانی پڑھتی ہیں۔ لیکن پانچویں قسط سے میں نے پڑھا تو اب ماما سے زیادہ مجھے اس کا انتظار رہتا ہے۔ خواتین تمام رسالوں سے اچھا ہے۔ تمام سلسلے بہترین ہیں۔ "عہد الست" بہت اچھا ہے۔ لیکن فی الحال کہانی تھوڑی پیچیدہ ہے۔ افسانوں میں "ہم انگریز نہیں" سب سے اچھا لگا۔ باقی تمام سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح سپرہٹ تھے۔

ج : پیاری اقراء! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ قسط وار کہانیاں نہیں پڑھتیں پھر بھی "بن مانگی دعا" اور "عہد الست" نے آپ کو باندھ لیا ہے۔ "عہد الست" اپنے انداز کی ایک مختلف کہانی ہے۔ شروع میں کردار واضح نہیں تھے اب سارے کردار اور ان کے درمیان تعلق واضح ہو گیا ہے۔ یقیناً اب آپ کو کہانی پڑھنے میں زیادہ لطف آئے گا۔

مسرت شاہین ۔۔۔ لاہور

"جو رکے تو کوہ گراں" کے بارے میں پڑھا کہ آئندہ ماہ آخری قسط ہو گی۔ پہلے تو دل دکھا، پھر اچھا لگا کہ اب ویسے بھی تقریباً سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔

نمرہ احمد اپنے نام کے حوالے سے اتنی پہچان بنا چکی ہیں کہ بس نام ہی کافی ہے۔ تحریر کے پڑھنے سے قبل ہی ایک سسپنس، سنسنی خیزی اور پراسراریت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مکمل بہت خوب صورت اور پیارا ناول ہے۔

ج : پیاری مسرت! آپ کو انعام بھجوایا جا رہا ہے۔ عنیزہ سید کا ناول ختم ہونے پر آپ کا دل دکھا، اس لیے انہوں نے اس کی ایک قسط بڑھا دی ہے۔

نمرہ احمد کا ناول آگے چل کر مزید دلچسپی اختیار کرے گا۔ فی الحال کردار واضح ہو رہے ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

قارئین متوجہ ہوں!

1 خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جا سکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہو گی۔

6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7 خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ادارہ خواتین۔ 37 اردو بازار کراچی۔

خبریں و دیگر

واصف سہیل

ارادہ

گلوکار فاخر کا کہنا ہے کہ میوزک میں مصروفیت اس قدر بڑھ رہی ہے کہ کوئی اور کام کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ (بھلا آپ کا آخری البم کب آیا تھا جناب!) اداکاری کی آفرز کا سلسلہ گزشتہ پندرہ سالوں سے جاری ہے لیکن مجھے کبھی بھی ایکٹنگ کا شوق نہیں رہا (ہاں جب ہی اپنے گانوں پہ خود ہی پرفارم کرتے ہیں اپنے ویڈیوز میں۔) اور نہ میں مستقبل میں ایسا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ (چلو جی اب ٹی وی ڈراموں میں ایک اور اداکار کا اضافہ۔!) میں ملک اور بیرون ملک ہونے والے اپنے کنسرٹ کے ساتھ ساتھ اپنے گیت بھی تیار کرتا رہتا ہوں اور اپنے اسٹوڈیوز میں موسیقی کے نت نئے تجربات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ذمہ داری

اداکارہ ناہید شبیر کا کہنا ہے کہ "بچے آنے والے وقت کے معمار ہیں ان کی تربیت میں ہم سب کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ماں باپ کا کردار تو ہوتا ہی ہے (ہائیں! آپ اپنے آپ کو بچہ۔؟) مگر اس سے زیادہ اسکول کے اساتذہ پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو ان کی شخصیت میں تبدیلی لانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اس لیے ٹیچرز کو چاہیے کہ وہ اسکول کالج کے طلبا و طالبات سے اس طرح کا رویہ اختیار کریں کہ جب وہ مستقبل میں کسی مقام پر پہنچ جائیں تو اپنے اساتذہ کا سر فخر سے بلند کر سکیں۔" (ناہید! کہیں ڈراموں میں کردار نہ ملنے کے باعث آپ کسی اسکول میں ٹیچر تو نہیں لگ گئیں؟!)

اعزاز

عالمی ادارہ صحت کے ڈائریکٹر جنرل مارگریٹ چان نے پاکستانی ڈاکٹر ذوالفقار بھٹہ کو ورلڈ ہیلتھ اسمبلی کی جانب سے بچوں کی صحت اور نومولود بچوں کی زندگی کو بچانے کے حوالے سے جنیوا میں "احسان ذوگراماسی

... فاؤنڈیشن ... ایوارڈ دیا۔ ڈاکٹر ... بھٹہ نے ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد بتایا کہ "مجھے بہت خوشی ہے کہ عالمی سطح پر بطور پاکستانی ڈاکٹر میری کاوشوں کو سراہا گیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ عالمی فورم پر ایک پاکستانی ڈاکٹر کو ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔" لیکن ڈاکٹر بھٹہ نے مزید کہا کہ "مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ اس تقریب میں حکومت کا کوئی نمائندہ موجود نہیں تھا۔" (ڈاکٹر صاحب! ہمارے سفارتی نمائندے بیرون ملک صرف شوبز کی تقریبات میں ہی شریک ہوتے ہیں۔)

آئینہ

اداکارہ میرا نے ایک بار پھر اعلان کیا ہے کہ وہ ایک فلم بنا رہی ہیں، جس کی ڈائریکشن بھی وہ خود ہی دیں گی (اچھا؟ بھئی ٹھیک ہے جب کوئی میرا کو اپنی فلم میں نہیں لے گا تو پھر اسے خود ہی فلم بنانی پڑے گی نا۔) فلمی حلقوں نے اس خبر پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرا نے اسی فلم انڈسٹری سے شہرت پائی ہے تو اب اگر وہ فلم انڈسٹری کو سہارا دینے کے لیے اپنی ذاتی فلم بنا رہی ہیں تو اچھا ہے نا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میرا کو ہیرو نہیں مل رہا ہے تو کوئی ہیرو مل گیا میرا یہ فلم ضرور بنائیں گی۔

صلاحیت

سعد ہارون کو بطور کامیڈین پاکستان میں کوئی پذیرائی نہ مل سکی لیکن امریکا کے سب سے بڑے کامیڈی کلب "دی لاف فیکٹری" نے انہیں دنیا کے سب سے بڑے مزاحیہ انسان کے مقابلے کے لیے نامزد کر دیا ہے۔ (واہ بھئی۔) مزے کی بات یہ ہے کہ اس مقابلے کے لیے دنیا بھر سے کامیڈینز کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ ان سب نے دی لاف فیکٹری کی ویب سائٹ پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اگلے مرحلے میں ٹاپ تین کامیڈینز منتخب ہوں گے جو ہالی ووڈ جائیں گے۔ اگر سعد ہارون اس مرحلے تک پہنچ گئے تو وہ دنیا کے بڑے بڑے کامیڈینز کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہوں گے۔ سعد ہارون اس مقابلے میں شرکت کرنے کے خیال سے ہی بہت خوش ہیں اور اگر ہالی ووڈ پہنچ گئے تو پھر تو گئے ہی کیا۔

ہوا خوری کرنا

صبح کی سیر اور ورزش کے لیے وقت نکالنا خاصا مشکل ہوتا جارہا ہے' لیکن ایک نئی تحقیق کے مطابق گھر سے باہر نکل کر ہوا خوری کے فوائد حیرت انگیز ہیں۔ تحقیق کے مطابق ہوا خوری سے ہمارے پھیپھڑے صحت مند ہوجاتے ہیں اور سانس کے امراض میں مبتلا افراد کو انتہائی فائدہ ہوتا ہے۔ چہل قدمی سے جسم کے اندر مضر صحت خلیات کو ختم کرنے والے سیلز کی تعداد بڑھتی ہے' جو ہمیں مختلف بیماریوں سے بچاتے ہیں۔ گھاس پر چہل قدمی سے مزاج پر خوش گوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہوا خوری سے جسم میں توانائی کا لیول بھی بڑھ جاتا ہے' جس سے انسان خود کو صحت مند محسوس کرتا ہے۔

ادھر ادھر سے

سلیم احمد اور قمر جمیل ایک دوسرے کے دوست بھی تھے اور حریف بھی۔ دوست کم اور حریف زیادہ۔ دونوں مجلس آرائی کے شیدا تھے۔ دونوں جہاں جمع ہوجاتے مجلس برپا ہوجاتی۔ ایک دن دونوں شام کے وقت ایک چائے خانے میں داخل ہوئے اور صبح تک [illegible] وہاں اٹھ کر جانے لگے تو بیرے نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے کہا۔ "دو گل آئے تھے' آج چار سے بیس ایک روپیہ بارہ آنے۔"

(شاہنواز فاروقی۔ روبرو)

پاکستانی ذرائع ابلاغ اپنے معاشرے کی قطعی طور پر ترجمانی نہیں کرتے' ان کے تو مقاصد ہی اور ہیں۔ انہیں معاشرے کے مسائل کا پتا نہیں ہے۔ لوگ ان سے بیزار ہیں اور اس میڈیا سے بیزار ہورہے ہیں۔

(پروفیسر طاہر مسعود)

اگر ہم نے پاکستانی ثقافت کا تعین کرنا ہے تو وہ یا تو وادی سوات کی قدیم ہنرمندی ہے یا پھر وادی سندھ کی صوفی روایت' سندھ کے لوک گیت' کڑھائی اور زندگی بسر کرنے کے آداب ہیں۔ وہاں کچھ دھیما پن اور سرگوشی کی اطاعت ہے۔

(مستنصر حسین تارڑ۔ کاروان سرائے)

پٹھان اپنے اندر ایک لطیف حسن جمال رکھتے ہیں۔ پھولوں سے اتنی محبت رکھتے ہیں کہ ان کے آدھے نام پھولوں کے ہوتے ہیں' گل خان' گلاب خان' گلستان خان یا گل مکی وغیرہ۔ ان کے دیگر ناموں میں بھی اپنے ماحول اور قدرت کے مظاہر کی ترجمانی ہوتی ہے۔ دریا خان' سمندر خان' زبردست خان' شمشیر خان' آوارہ خان وغیرہ۔

(کاروان سرائے۔ مستنصر حسین تارڑ)

آپ کا باورچی خانہ

شازیہ جبیں

(1) میرے گھر میں سب سے پہلے پسند و ناپسند کا خیال رکھا جاتا ہے اور یہ سب سے ضروری ہے کیونکہ خاتون خانہ کا سب سے اہم کام خاندان کو کھانا پکانا ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی کھانا دیکھ کر یا کھا کر خوش نہ ہو تو پھر بے چاری کی محنت تو گئی نا۔ میں کیونکہ الحمد للہ ماجدہ ہوں تین عدد بچوں کی، مجھے اپنے بچوں کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کہ میری بیٹی جو پہلے ہی خوب موٹی ہے اوپر سے وہ چیزیں پسند کرتی ہے جن سے وہ مزید موٹی ہو۔ (اور مانتی نہیں کہ وہ موٹی ہے) مثلاً "پلاؤ" فرنچ فرائز اور کیک وغیرہ دوسرے نمبر پر نعیم وہ بالکل نخرے نہیں کیا کرتا ہے اور کھانے کا اسے بے شک دو دن پوچھو ہی نہ وہ کھانے کا ہی نہیں اور کھانے وقت اگر نمکین کہے کہ مرچ لگ رہی ہے تو وہ بھی یہی کہہ کر چاہے گا کہ کھانا نہ کھانا پڑے۔ روٹی ادھر ادھر چھپا دیتا ہے جو بعد میں ملتی ہے۔ سب سے چھوٹا زین وہ بھی یہ دیکھتا ہے کہ اگر بہن بھائی کھا رہے ہیں تو وہ کھائے گا۔ وہ کہتا ہے کھانا خود کھاؤں گا۔ اس میں خودی بہت ہے دو سال کا ہے اور خود ہی کھانا کھاتا ہے۔

(2) ہمارے گھر میں گرمیوں کا موسم مہمانوں کا موسم ہوتا ہے۔ لیکن اچانک چھاپہ کم ہی کبھی پڑا ہے۔ کیونکہ ہمارا سب رشتہ داروں سے ہاٹ لائن پر رابطہ رہتا ہے۔ اگر اچانک مہمان آجائیں تو نو پرابلم۔ پہلے ان کو مشروب کے ساتھ نمکو کیک وغیرہ پیش کروں گی تاکہ تسلی سے بیٹھیں اور سب سے جلدی تیار ہونے والی ڈش چکن کڑاہی ہے اور چکن میرے فریزر میں ہر وقت موجود ہوتی ہے۔

چکن کڑاہی

ترکیب :

سب سے پہلے چکن کا پیکٹ فریزر میں سے نکال کر پانی میں رکھیں پیاز کاٹ کر لہسن چھیل کر کوٹ لیں۔ کڑاہی میں گھی ڈالیں اور پیاز ڈال دیں پیاز ہلکی گلابی ہو جائے تو لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال دیں۔ تھوڑا سا پکائیں پھر ٹماٹر کاٹ کر ڈال دیں۔ اگر پیاز اور ٹماٹر زیادہ

ڈالیں کے تو زیادہ

مرچ ہلدی، کالی مرچ اور سوکھا دھنیا پسا ہوا حسب ذائقہ ڈال دیں اور پانی کا چھینٹا لگائیں۔ پھر چکن ڈالیں اور بھونیں یہاں تک کہ چکن گل جائے اور رنگ بھی براؤن نہیں ہونا چاہیے۔ آخر میں سبز دھنیا اور ہری مرچ ضرور ڈالیں اور اتار لیں۔ اس کے ساتھ دہی اور سلاد ضرور پیش کریں۔ روٹی بنائیں یا نان باہر سے منگوائیں۔ میں نو نان ہی منگوالوں گی کیونکہ گرمی میں روٹی پکانی مشکل ہے۔ ایسا لگتا ہے روٹی کے ساتھ میں بھی پک رہی ہوں۔

(3) خاندان کی صحت کے لیے کچن کا صاف ہونا ضروری ہے میرے کچن کی ہفتہ وار اور روزانہ کی صفائی دونوں ہی ہوتی ہیں۔ کچن کی صفائی ہر وقت ہی ہوتی رہتی ہے۔ صبح کے وقت کچن میں چیزوں اور برتنوں کا زیادہ رش ہوتا ہے۔ کچن میں جس چیز کا میں زیادہ خیال رکھتی ہوں وہ ہیں گلاس۔ گلاس برتنوں میں سب سے پہلے دھلتے ہیں اور بار بار دھلتے ہیں اور کچن کی کچرے کی ٹوکری صاف رکھتی ہوں اور کچن میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ہاتھ ضرور دھوتی ہوں۔

(4) ناشتہ ایک ضروری اور اہم چیز ہے اور جب تک ناشتہ نہ کریں لگتا ہے دن شروع ہی نہیں ہوا۔ ناشتے میں چائے سب گھروں میں بنتی ہے۔ چائے کے بغیر ناشتہ ناشتہ ہی نہیں لگتا۔ مجھے پراٹھا شوق سے کھاتی ہے اور جتنا بھی بڑا بنادو وہ چھوٹا ہی کہتی ہے۔ زعیم دہی کے ساتھ بن پسند کرتا ہے دہی میں خوبانی ڈال۔ ذین ایک فیڈر دودھ لیتا ہے۔ میرے میاں جان کا جواب ایک ہی ہوتا ہے کچھ بھی دے دو۔ پھر کہیں کے چائے کے ساتھ دو سلائس براؤن کیے ہوئے۔ (ویسے انہوں نے ناشتہ سب کا ضرور چیک کرنا ہوتا ہے) کیونکہ وہ وزن کم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ناشتہ روزانہ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی آملیٹ، کبھی فرائیڈ ایگ، پراٹھے، فرنچ ٹوسٹ، رس، سینڈوچ اور ویک اینڈ پر پراٹھے چلتے ہیں۔ میں کلب سینڈوچ اچھا بناتی ہوں۔ ترکیب ہے۔

ترکیب :

سب سے پہلے ایک انڈا ابالا یا پھر فل فرائی کیا۔ برٹ بریڈ کے دو سلائس لیے کنارے چھری سے اتارے۔ ان پر چکن سپریڈ اچھی طرح لگائی اور انڈا رکھا۔ انڈے کے اوپر ٹماٹر رکھیے اور بند گوبھی باریک کاٹ کر رکھیں اوپر کالی مرچ چھڑک کر دوسرا سلائس رکھ دیں۔ مزے دار سینڈوچ تیار ہے جو توانائی سے بھرپور ہے۔

(5) مہینے میں ایک دو بار باہر ضرور کھانا کھانے جاتے ہیں اس سے بچے خوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس دن میری ساس موجود ہوں یہ ممکن نہیں ہوتا کیونکہ وہ باہر کے کھانوں کو بہت ناپسند کرتی ہیں۔ بچوں کے پاپا باہر کھانے سے منع نہیں کرتے۔ جو نہی وہ ذرا سی ڈھیل دکھائیں ہم فوراً باہر جانے اور کھانے کے لیے تیار۔

(6) موسم کا خیال میں ضرور رکھتی ہوں۔ گرمیوں میں کوشش کرتی ہوں کم سے کم پکاؤں کیونکہ گرمی میں پیاس زیادہ لگتی ہے۔ فرائیڈ چیزیں گرمیوں میں کم بناتی ہوں سردیوں میں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ فرائیڈ چیزیں کھا کر بچے پانی زیادہ پیتے ہیں۔

(7) اچھا کھانا پکانے کے لیے محنت اور دل لگانا دونوں ضروری ہیں۔ موڈ اچھا نہ ہو یا دل نہ چاہ رہا ہو تو کھانا کبھی بھی اچھا نہیں بنے گا۔ کھانا پکانا تو ہے ہی ایک محنت طلب کام جس کو صرف خواتین ہی سمجھ سکتی ہیں۔ حضرات تو سمجھتے ہیں یہ کوئی کام ہی نہیں ہے۔

(8) ٹپ اگر فرائی چیزوں کے لیے گھی گرم ہو اور اس میں کچھ ڈال دیں کوئی چیز تلنے کے لیے گھی جھاگ کرتا ہے یا اچھلتا ہے۔ اگر اس اچھلتے گھی میں چٹکی بھر آٹا چھڑک دیا جائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔

آلو کے پکوان

صبا حجر

آلو کے کباب

ضروری اجزا:

آلو	ایک کلو
انڈے	تین عدد
پیاز	ایک عدد
ڈبل روٹی کا چورا	حسب ضرورت
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:

آلو ابال کر چھیل لیں اور میش کر لیں۔ دو انڈے ابال کر انھیں بھی میش کر کے بھرتے میں ملا دیں۔ پھر نمک، سرخ مرچ، کٹا ہوا دھنیا، پیاز، ہرا دھنیا اور ہری مرچ کتر کر آلو اور انڈے میں اچھی طرح مکس کریں اور تھوڑی دیر کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ پھر بھرتے کو ذرا سا گیلا کر کے کباب بنا لیں۔ (درمیان میں قیمہ بھر کر آپ کٹلٹس بھی بنا سکتی ہیں)۔ کبابوں کو پھینٹا ہوا انڈا میں اور ڈبل روٹی کے چورے میں لپیٹ کر ہلکی آنچ پر گہرے تیل میں تل لیں۔ آلو کے مزے دار کباب تیار ہیں۔ کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

آلو کے پراٹھے

ضروری اجزا:

آٹا	آدھا کلو
آلو	ایک پاؤ
پیاز	ایک عدد
اجوائن	ایک چٹکی
کلونجی	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب:

آٹے میں نمک اور میٹھا سوڈا ملا کر گوندھ لیں۔ فرائنگ پان میں ذرا سا تیل گرم کر کے اس میں زیرہ، کلونجی، سرخ مرچ اور اجوائن ڈال کر ایک منٹ تک فرائی کریں۔ پھر ابلے ہوئے آلو اچھی طرح مسل کر شامل کریں اور فرائی کر کے اتار لیں۔ آٹے کے پیڑے بنا کر چھوٹی سی روٹی بیلیں اور

اس پر آلو کا بھرتہ رکھ کر چاروں اطراف کو بند کریں پھر خشکی لگا کر ہلکے ہاتھ سے پراٹھا بیل کر توے پر ڈال دیں۔ سنہرا ہونے پر اتار لیں۔ دہی کی چٹنی یا لہسن کی چٹنی کے ساتھ نوش کریں۔

آلو کی کڑاہی

ضروری اجزا :

آلو	چار عدد
ٹماٹر	چار عدد
ادرک لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
سرخ مرچ، ہلدی	آدھا آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

آلوؤں کو چھیل کر کے بڑی بڑی شکل میں کاٹ لیں۔ پتیلی میں تیل گرم کرکے اس میں لہسن ادرک پیسٹ اور ہلدی ڈال کر اچھی طرح بھون لیں پھر آلو اور ٹماٹر ڈال دیں۔ ساتھ ہی لال مرچ کٹا ہوا، ثابت دھنیا، زیرہ اور نمک ڈال کر اچھی طرح بھونیں پھر ذرا سا پانی ڈال کر کے آنچ ہلکی کردیں۔ آلو گل جائیں تو گرم مسالا ڈال دیں۔ آخر میں چار ہری مرچیں درمیان سے کٹ لگا کر اور باریک کترا ہوا ادرک ڈال کر پانچ منٹ تک دم پر رکھنے کے بعد چولہا بند کردیں۔ دھنیے اور گرم چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

اچاری آلو

ضروری اجزا :

آلو	ایک کلو
پیاز	پانچ عدد
ادرک لہسن پیسٹ	چار چائے کے چمچے
چٹنی/ کٹی لال مرچ	دو، دو چائے کے چمچے
رائی، ہلدی	آدھا آدھا چائے کا چمچہ
سرکہ	ایک تہائی کپ
زیرہ، کلونجی	ایک ایک چائے کا چمچہ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

آلو ابال کر چھیل لیں اور ایک ایک انچ کے ٹکڑوں میں کاٹ کر ہلکے سے تیل میں فرائی کریں اور الگ نکال لیں۔ اسی فرائنگ پان میں آدھا کپ تیل گرم کرکے پیاز سنہری کریں۔ پھر لہسن ادرک پیسٹ، نمک، سرخ مرچ اور ہلدی ڈال کر تھوڑی دیر آدھا کپ پانی ڈال کر گریوی گاڑھی ہونے تک پکائیں۔ سرکے میں چینی گھول کر شامل کریں۔ تلے ہوئے آلو شامل کرکے ایک دو منٹ بھونیں پھر ڈش میں نکال لیں۔ الگ فرائنگ پان میں ذرا سا تیل گرم کرکے رائی، کلونجی، زیرہ اور تقریباً چھ ثابت مرچ کڑکڑا کر آلو کے سالن پر بگھار لگادیں۔ روٹی، چاول یا پراٹھے کے ساتھ پیش کریں۔

کھٹے آلو

ضروری اجزا :

آلو	آدھا کلو
املی کا رس	آدھی پیالی
دھنیا، پودینہ	آدھی پیالی
سرخ، سیاہ مرچ	آدھا آدھا چائے کا چمچہ
چینی	دو چائے کے چمچے
نمک، تیل	حسب ذائقہ

ترکیب :

آلو اچھی طرح دھو کر کھلے پانی میں ایک ابال دے کر چھلکا اتار لیں اور چوکور کاٹ لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور گولڈن براؤن آلو تل لیں۔ جب سارے آلو تل لیں تو اضافی تیل نکال لیں (دو تین چمچے تیل رہنے دیں) کڑاہی میں سارے مسالے ڈال کر ہلکا سا بھون کر دس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ گرم گرم پوری کے ساتھ پیش کریں۔

ن۔ ص۔ کراچی

میں اس وقت جس کشمکش و کرب میں ہوں اس کو لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ میرا بیٹا جس کو میری ساس نے چھین لیا جس کی عمر نو ماہ کی تھی وہ میرا دودھ پیتا بچہ تھا جس نے ابھی مجھے ماں بھی نہیں کہا تھا۔ میرے پانچ بھائی ہیں۔ بھائیوں کے اصرار پر ابو کو گھر بیچنا پڑا۔ میری امی عرصہ دس سال قبل اس دنیا سے چل بسی تھیں۔ آخر کار گھر بکا۔ اونے پونے داموں۔ تین ہم بہنوں کی شادی کی رقم نکال کر باقی تمام پیسے بھائیوں کو دیے۔ ہم دو بہنوں کے رشتے ہماری سب سے بڑی بھابھی نے کرائے۔ میرے لیے جو رشتہ بتایا وہ ان کی کسی ملنے والی کے بیٹے کا تھا جس کی پہلے ہی دو شادیاں ہو چکی تھیں اور دونوں کو طلاق ہو چکی تھی۔ بھابھی نے لڑکے کی بہت تعریفیں کی تھیں بعد میں پتا چلا لڑکا چرس، شراب پیتا ہے۔ ماں بہنوں نے شادی کے ایک ہفتے بعد ہی رنگ دکھانے شروع کر دیے انہوں نے جو جو مجھ پر ظلم کیے اگر لکھنے بیٹھوں تو کئی صفحے درکار ہوں۔ پھر ایک دن میری ساس مجھے بھائی کے گھر چھوڑ گئی اور پورے چار ماہ تک پلٹ کر خبر نہ لی۔ جب وہ مجھے چھوڑ گئی تھی تو میرا پانچواں مہینہ تھا۔ میرے بھائی سسرال گئے بات کرنے تو وہاں جا کر پتا لگا میرا شوہر پاگل ہو گیا ہے۔ میری ساس نے الزام لگا دیا کہ میں چلے کاٹتی ہوں۔ اسی وجہ سے اس کا بیٹا پاگل ہو گیا۔ بھابھی مجھے رکھنے پر تیار نہ تھی۔ میں نے بھائی کے آگے ہاتھ جوڑے کہ مجھے چھت کا سہارا دے دو۔ میں تمہارے گھر کا کچھ نہیں کھاؤں گی۔ بھابھی نے میرا ناشتا اور دونوں وقت کا کھانا بند کر دیا۔ میں کبھی دوسری بھابھی کے گھر چلی جاتی وہ کھانا دے دیتیں۔ رات کا کھانا میری بڑی بہن کے گھر سے آجاتا۔ پھر ایک رات میرا شوہر رات دو بجے آیا۔ میرے بھائی نے دروازہ کھولا تو وہ کہنے لگا کہ میں تمہاری بہن کو طلاق دینے آیا ہوں۔ یہ میرے چار دوست گواہ ہیں۔ کل آ کر اپنا سامان (میرا جہیز وغیرہ) لے جانا۔ صبح ہوتے ہی اپنی بڑی بھابھی کے گھر گئی جس نے میرا رشتہ کرایا تھا۔ دن گزرنے لگے۔ پھر ایک دن میں اپنی بہن کے گھر گئی۔ تو بھابھی نے بھائی سے کہا۔ اب اس کو گھر میں نہ آنے دینا اس گھر میں وہ رہے گی یا میں اور پھر جب میں واپس آئی تو بھائی نے کوئی گھنٹہ بھر گیٹ نہ کھولا تھا۔ وہ گیٹ کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ وہ منظر اف ساری گلی والے مجھے کیسے دیکھ رہے تھے۔ پھر میں اپنے چوتھے نمبر والے بھائی کے گھر آ گئی۔ مجھے نواں مہینہ لگ گیا تھا۔ میں نے ان کو یہ نہیں بتایا کہ مجھے بھائی نے گھر سے نکال دیا ہے۔ میری بھابھی مجھے اسپتال لے گئی۔ الٹرا ساؤنڈ ہوا تو لڑکا بتایا۔ میری بھابھی نے پورے محلے میں شور کر دیا کہ ہم تو طلاق لیں گے۔ الٹرا ساؤنڈ میں لڑکا بتایا ہے اور اگر اب بھی اس کی ساس نہ لے گئی تو ہم انہیں لڑکا نہیں دیں گے۔ میری ساس کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ مجھے آ کر لے گئی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میرے سسرال پہنچتے ہی دوسرے دن میرا بیٹا پیدا ہو گیا۔ میرے شوہر کا اب بھی وہی رویہ تھا۔ وہی سرد مہری، بے رخی والا انداز۔ وہ میرے کمرے میں بھی نہیں آیا نہ بچے کے متعلق کوئی بات کی۔ میری نند جو کہ چار سال سے اپنے میکے رکی بیٹھی تھی۔ اس کا ایک لڑکا تھا تین سال کا۔ اس نے اپنے شوہر کو کورٹ کے ذریعے خلع کا نوٹس بھجوایا تو میرا شوہر اپنی بہن پر بلبلاتا ہوا آیا اور غصے میں کہا کہ جب یہ اپنا فیصلہ کر سکتی ہے تو پھر میں کیوں نہیں۔ اس نے اپنی ماں سے کہا کہ مجھے یہ شام کو نظر نہ آئے دو دن تک اس نے گھر میں جھگڑا کیا۔ کمرے میں بھی نہ آیا۔ پھر میری ساس مجھے دھوکے سے بھابھی کے گھر لے گئی اور کہا "کہ اب ہماری طرف سے یہ آزاد ہے۔ ہم نے اپنا بچہ رکھ لیا۔ اس کی مرضی یہ جہاں جائے جس کے گھر جائے میرا بچہ جو ابھی نو ماہ کا تھا اسے رکھ لیا۔ وہ رات میں نے تڑپتے ہوئے گزاری۔ صبح میں پھر اپنے بچے کو لینے سسرال گئی تو میری ساس نے مجھے مارا اور دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ بچہ بھی نہ دیا۔ بھابھی نے بھی کہا ساری غلطی تمہاری ہے۔ تمہیں سسرال میں رہنا نہیں آیا تم جس بھائی کے پاس جاؤ مگر میرے گھر نہ آنا ایک بھائی بھابھی نے مجھ پر گیٹ بند کر لیا تھا تو دوسری نے تعلق توڑ لیا۔ میرا باپ خود بیٹے بہو کا محتاج تھا۔ میں کس کے در پہ جاتی۔ پھر ایک بھائی جس نے ابو سے تعلق توڑ لیا تھا حصہ نہ ملنے پر اس کی بیوی مجھے لے آئی۔ میں نے اس کے گھر

عدت کی دوران عدت ... ہی ایک ہفتے بعد میرا نکاح تھا۔ ابھی پندرہ دن باقی تھے۔ میرے بھائی کو خبر ملی کہ وہ لڑکا بھی نشہ کرتا ہے اور ابھی بیوی کو طلاق بھی ایک دی ہے۔ میرے بھائی نے وہ رشتہ ختم کر دیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ تب تک تو میری بھابھی اور اس کے بچوں کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک رہا کہ چلو عدت ختم ہوتے ہی چلی جائے گی۔ (میں) مگر رشتہ ختم ہوتے ہی ان سب کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ مجھے یاد آتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ پھر سے شوہر سے رجوع کرلوں' حلالہ کرلوں۔

ج: جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا' اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ لیکن اگر آپ نے حلالہ کا سوچا اور لوٹ کر اپنے شوہر کے پاس گئیں تو دوسری بڑی غلطی ہوگی۔ پہلی غلطی ایک نشئی اور بے کار آدمی سے شادی تھی۔ وہ شخص کسی رشتہ کو نبھانے کے قابل ہی نہیں تھا۔ دوسرا رشتہ جس سے ہونے جارہا تھا۔ وہ بھی نشہ کرتا ہے پھر یہ بھی سوچیں اگر چار بچوں کی ماں شوہر کو چھوڑ رہی ہے تو یقیناً" اس شخص میں کوئی خرابی ہوگی۔

آپ کراچی میں رہتی ہیں۔ یہاں کام کی کمی نہیں۔ آپ کو کوئی بھی کام مل سکتا ہے۔ اگر گھر والے باہر نکلنے کی اجازت دیں تو کوئی کام ڈھونڈ لیں۔ لیکن اگر یہ ممکن نہیں اور بھائی بھاوج کسی صورت گھر میں رکھنے کو تیار نہیں تو پھر ایدھی سینٹر یا انصار برنی ٹرسٹ میں پناہ لے سکتی ہیں۔ لیکن اپنی زندگی کو دوبارہ داؤ پر نہ لگائیں اور دیکھ بھال کر شادی کریں۔

ثالیہ.... لاہور

بہن عالیہ کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ بی اے پاس ہیں' ان کے لیے جو رشتہ آیا ہے' وہ صاحب پڑھے ہوئے نہیں۔ درمیانہ درجہ کا کاروبار ہے۔ ذاتی مکان ہے۔ ہماری یہ بہن ان سے شادی نہیں کرنا چاہ رہی ہیں کہ ایک ان پڑھ کے ساتھ گزارا کیسے ہوگا۔

اچھی بہن! اصل چیز تعلیم نہیں اصل چیز تربیت' طبیعت' مزاج' نبھاؤ کی صلاحیت ہے۔ اس کے مزاج' طبیعت کے بارے میں آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کیونکہ اس کا تعلق آپ کے خاندان سے ہے۔ اگر اچھے مزاج کا شریف لڑکا ہے تو شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شادی سمجھوتے کا نام ہے۔ ایک دوسرے کی کمی پورا کرنے کا نام ہے۔ کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا۔ اگر وہ کم تعلیم یافتہ ہے تو کوئی کمی آپ میں بھی ہوگی۔

مثال

آپ اپنے ذہن سے ہر خوف اور پریشانی کو نکال دیں اور بے خوف ہو کر شادی کریں۔ اس طرح کے خیالات آنا کوئی بیماری نہیں ہے' نہ ہی اس کے جسم یا صحت پر کوئی اثرات ہوتے ہیں۔ خیالات کو روکنے کی ضرورت نہیں' آنے دیں بس صرف ایک کام کریں کہ جب فارغ ہوں تو کوئی کتاب پڑھیں یا لاحول پڑھیں۔

س۔ علی گجر خان

اچھی بہن شک کی بات نہیں ہے۔ دراصل جب تک حالات واقعات کی پوری تفصیل سامنے نہ ہو کوئی مشورہ دینا مشکل ہوتا ہے۔ آپ عجیب و غریب حالات کا شکار ہیں۔ والد بلاوجہ نفرت کرتے ہیں۔ گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ اسکول کی شکل نہیں دکھائی آپ کو شادی کا مشورہ اس لیے دیا کیونکہ اس ماحول سے نجات کا واحد راستہ یہی ہے۔ لیکن ابھی آپ واقعی کم عمر ہیں۔ اس لیے فی الحال شادی کے بارے میں تردد نہ کریں۔ جہاں تک باہر سے رشتہ آنے کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کا جوڑ بنایا ہے جو آپ کی قسمت میں لکھا ہے' وہ کسی نہ کسی طرح آپ تک پہنچ جائے گا۔ کب؟ کیسے؟ کہاں؟ یہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ آپ اس پر کامل یقین رکھیں۔ ویسے بھی خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بہت ذہین ہیں۔ باوجود اس کے کہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ آپ نے بہت رواں انداز میں خوب صورت رائٹنگ میں خط لکھا ہے مشورہ آپ کے لیے یہی ہے کہ صبر سے اچھے وقت کا انتظار کریں۔ اپنی طرف سے سب سے اچھی طرح پیش آئیں' خواہ ان کا رویہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اور فارغ اوقات میں مطالعہ کریں۔ آپ کے اس بھائی کا دل کہتا ہے کہ آپ کے اچھے دن ضرور آئیں گے۔

ثریا خان۔۔۔ کراچی

س: میری ناک بہت موٹی ہے چہرے کی مناسبت سے مجھے قدرے بڑی بھی لگتی ہے۔ اسے خوب صورت بنانے کے لیے کیا کروں؟ میں نے سنا ہے پلاسٹک سرجری سے ناک خوب صورت ہو سکتی ہے۔ آپ بتائیں پلاسٹک سرجری کیسے ہوگی۔

ج: ثریا! میک اپ کر کے آپ ناک کی موٹائی چھپا سکتی ہیں۔ ناک پر فاؤنڈیشن کا ہلکا شیڈ لگائیں اور ناک کی سائیڈوں میں گہرا شیڈ دیں تو ناک پتلی نظر آئے گی۔

پلاسٹک سرجری سے ناک پتلی اور خوب صورت بنائی جا سکتی ہے۔ کراچی میں کئی اسپتال ہیں جہاں پلاسٹک سرجری کی جاتی ہے۔ اس سرجری کے لیے آپ کو چار سے پانچ دن تک اسپتال میں رہنا ہوگا اور دو ہفتے تک ناک پر پلاسٹر چڑھا رہے گا۔ اسے ایک طرح سے چھوٹا سا آپریشن ہی سمجھیں۔

فوزیہ شاہین۔۔۔ چارسدہ

س: میرا قد چار فٹ چار انچ ہے اور عمر اٹھارہ سال ہے۔ میرا وزن 35 کلو ہے جو قد اور عمر کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن میرا پیٹ بڑھا ہوا ہے جو بہت بدنما لگتا ہے۔ پیٹ کم کرنے کی کوئی ترکیب بتائیں۔

ج: پیٹ گھٹانے کے لیے ایک بہت ہلکی پھلکی آسان سی ورزش ہے۔

زمین پر سیدھی لیٹ جائیں۔ اپنے ہاتھ سر کی طرف پھیلا دیں پھر جسم کا اوپر کا حصہ آہستہ اٹھائیں اور ٹانگیں موڑے بغیر اپنے پاؤں چھونے کی کوشش کریں۔ پندرہ منٹ تک یہ عمل دہرائیں۔ اللہ نے چاہا تو آپ کو فائدہ ہوگا۔

زینت اکرم۔۔۔ راولپنڈی

س: میری ناک اور دونوں گالوں پر گہرے بھورے رنگ کے دانے ہیں اور گالوں پر ناخن کے نشانات سے لگے ہیں۔ ناخن کے نشان زیادہ گہرے نہیں ہیں لیکن قریب سے دیکھنے پر بہت بدنما لگتے ہیں۔ میری عمر اٹھارہ سال ہے۔

ج: آپ نے اپنی عمومی صحت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ یہ گہرے بھورے رنگ کے نشان دراصل چھائیاں ہیں جو خون اور وٹامن کی کمی سے چہرے پر نمودار ہوتی ہیں۔

خون کی کمی اور وٹامن کی کمی کی وجہ سے چہرے پر چھائیاں ہو جاتی ہیں۔ کریمیں وغیرہ لگانے سے بہت معمولی فرق پڑ سکتا ہے لیکن اس سے ان کا دور ہونا مشکل ہے۔ آپ اپنی صحت اور خوراک پر توجہ دیں۔ ہری پتوں والی سبزیاں اور پھل زیادہ کھائیں۔ آج کل سیب کا موسم ہے۔ سیب چھلکے سمیت کھائیں۔ ایک گلاس پانی میں ایک لیموں کا رس اور ایک چمچ شہد ملا کر پئیں۔ آگے گاجر کا موسم شروع ہونے والا ہے۔ گاجر کھائیں۔ آپ نے اپنی خوراک پر توجہ دی تو چند دنوں میں نمایاں فرق محسوس کریں گی۔

راحت شیخ۔۔۔ ملتان

س: میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں۔ میں پوری نیند لیتی ہوں کوئی ذہنی پریشانی بھی نہیں ہے۔ صحت بھی اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہے۔ پھر بھی چہرے پر رونق نہیں ہے۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں جس سے یہ حلقے دور ہو جائیں اور چہرے پر رونق آ جائے۔ میری جلد خشک ہے۔

ج: اگر یہ حلقے پیدائشی ہیں تو ان کا دور ہونا مشکل ہے۔ البتہ یہ ہلکے ضرور ہو سکتے ہیں۔ آلو لے کر اس کے باریک قتلے کاٹ لیں اور آنکھوں پر رکھیں۔ دس بارہ منٹ ایسا کرتی رہیں۔ آلو جلد کو سکیڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سے آپ کی آنکھوں کے حلقے دور ہو جائیں گے۔ چہرے پر رونق کے لیے آپ ایک چمچ بالائی میں ایک چمچ شہد اور ایک چمچ لیموں کا رس ملا کر اسے چہرے پر لگائیں۔ آہستہ آہستہ جذب کرنے کی کوشش کریں۔ پھر چہرہ کسی اچھے صابن سے دھو لیں۔ چہرے کی جلد صاف اور شگفتہ ہو جائے گی۔

دودھ اور پسے ہوئے بادام کا پیسٹ بنا کر ہاتھوں پر لگائیں۔ ایک گھنٹے بعد ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔ دو ہفتوں میں نمایاں فرق محسوس کریں گی۔